قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اگست 2019 قیمت ₹15

ماہنامہ

اُردو دُنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

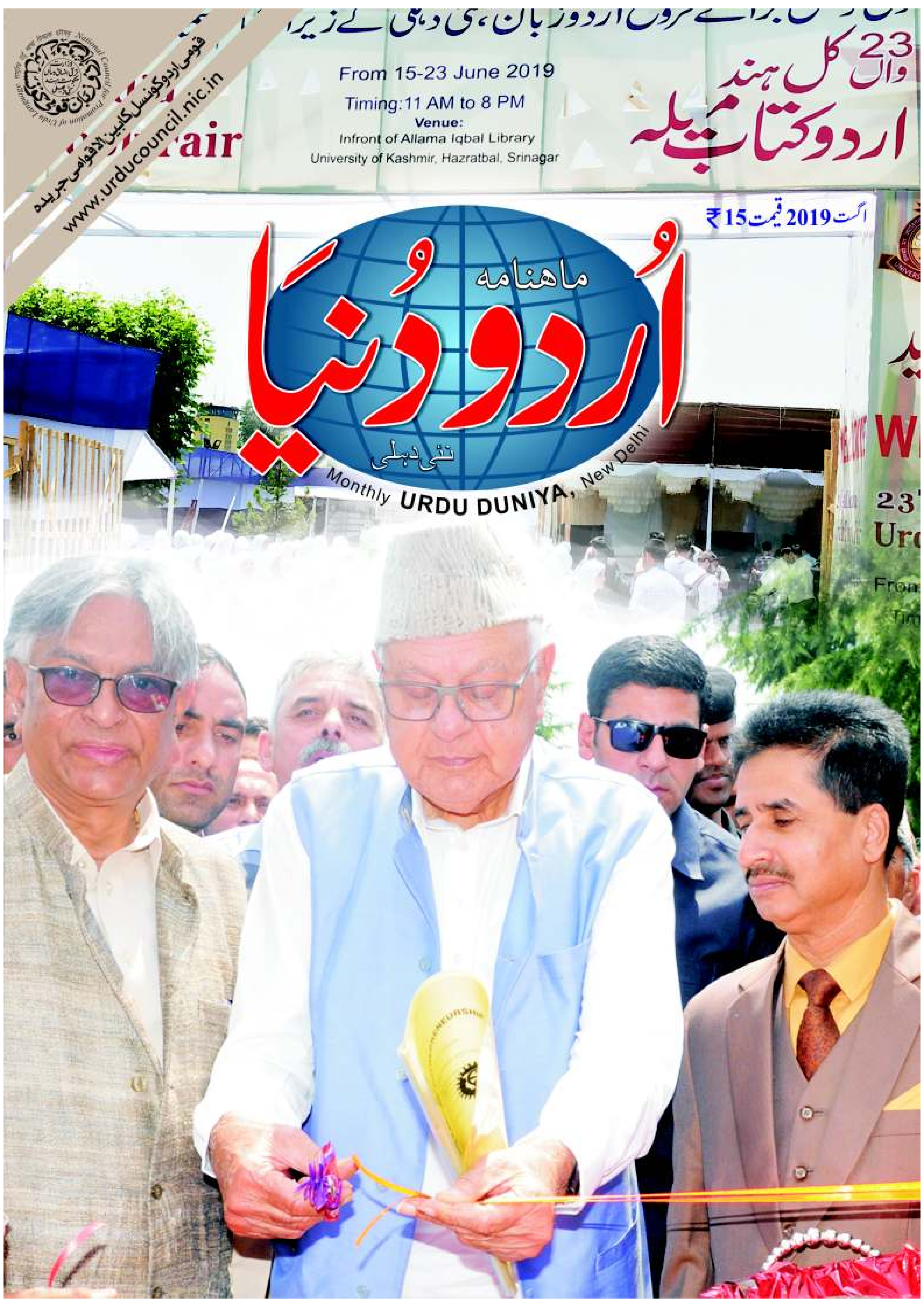

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

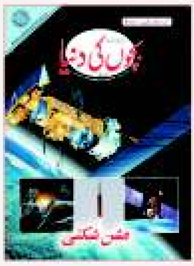
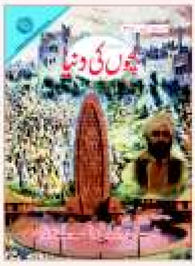

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

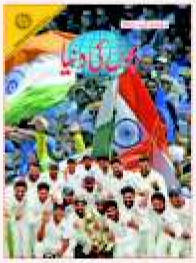

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

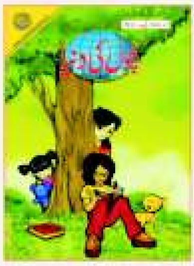

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

ہماری بات

'اردو دنیا' کے قارئین کو یوم آزادی مبارک!

تعمیر وطن اور جدو جہد آزادی میں اردو کا جو کردار رہا ہے اس سے ایک بڑا طبقہ تو واقف ہے مگر عوام کو اس سے آگہی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اتحاد اور یگانگت کی زبان اردو کے تعلق سے کچھ لوگوں کے ذہن میں اس زبان کے کردار اور تاریخ سے ناواقفیت کی وجہ سے کچھ خدشات بھی ہیں۔ جبکہ اردو ایک ایسی زبان ہے جس نے یکجہتی، ہم آہنگی، وطنیت اور قومیت کے شعور کو بیدار کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اردو کا پورا ادبی سرمایہ قومیت اور وطنیت کے تصور سے مالا مال ہے اور اس زبان کا دیش بھکتی اور سوراج سے بہت گہرا رشتہ رہا ہے۔

اردو کے بہت سے شعرا نے حب وطنی اور قومیت کے شعور کو بیدار کرنے کے لیے نظمیں بھی لکھیں اور برطانوی استعماریت کے خلاف احتجاج کی آواز بھی بلند کی۔ دیش بھکتی اور حب وطن پر لکھی ہوئی بہت ساری نظمیں ایسی تھیں جن پر برطانوی حکومت نے پابندی لگا دی تھی۔ منیر شکوہ آبادی، فضل حق خیر آبادی، حسرت موہانی اور ان کے علاوہ بہت سارے نام ایسے ہیں جنھوں نے برطانوی استعماریت کے خلاف مزاحمت کی اور اپنی شاعری کے ذریعے دیش بھکتی، ہم آہنگی اور اتحاد کا سبق دیا۔ ملک کی آزادی کے لیے جام شہادت نوش کرنے والوں اور جان نثار کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد رہی ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ اردو زبان و ادب سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کو اپنی مٹی کے ذرے ذرے سے محبت تھی۔ ان کے لیے اپنے وطن کی مٹی سے زیادہ عزیز کوئی چیز نہیں تھی۔ انگریزوں کے خلاف لڑائی میں بھی یہی حب وطنی کا جذبہ کارفرما تھا اور تقسیم ملک کے بعد بھی وطن سے الفت کا یہی جذبہ رہا۔

یہ حقیقت بھی کو پتہ ہے کہ جب ملک میں آزادی کی جنگ جاری تھی تو اس وقت اردو کے زیادہ تر شعرا برطانوی استعماریت سے نہ صرف ملک کو آزاد کرانا چاہتے تھے بلکہ ان کا ایک ایک لفظ اپنی مٹی کی محبت سے سرشار تھا۔ لال چند فلک نے کہا تھا:

دل سے نکلے گی نہ مر کر بھی وطن کی الفت — میری مٹی سے بھی خوشبوئے وفا آئے گی

اسی طرح برج نرائن چکبست نے وطن کی خاک سے اپنی محبت کا اظہار یوں کیا:

وطن کی خاک سے مر کر بھی ہم کو انس باقی ہے — مزہ دامان مادر کا ہے اس مٹی کے دامن میں

سیماب اکبرآبادی جیسے شاعر نے بھی اپنے وطن سے محبت اور شیفتگی کا ثبوت دیتے ہوئے یہ کہا تھا کہ:

وطن پیارے وطن تیری محبت جزو ایماں ہے — تو جیسا ہے، تو جو کچھ ہے سکونِ دل کا ساماں ہے
وطن میں مجھ کو جینا ہے وطن میں مجھ کو مرنا ہے — وطن پہ زندگی کو ایک دن قربان کرنا ہے
وطن کی خاک سے اٹھا ہوں رنگیں پیرہن ہو کر — وطن کی خاک میں مل جاؤں گا خاکِ وطن ہو کر

وطنیت اور قومیت کا یہی احساس اردو کے بیشتر شاعروں کے یہاں ملتا ہے۔ جدو جہد آزادی کے دوران زیادہ تر شاعروں نے اسی تصور کو عوامی ذہن میں نقش کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ احساس دلایا تھا کہ:

بنے ہیں ایک ہی مٹی سے ایک ہیں ہم سب — چمن کوئی بھی ہو گل تو ہزار ہوتے ہیں

اردو کا پورا شعری سرمایہ اسی اتحاد و یکجہتی کے تصور سے مالا مال ہے اور اس حقیقت کو اب تسلیم کر لیا جانا چاہیے کہ دیش بھکتی اور وطنیت کا بہت ہی قیمتی سرمایہ اردو زبان میں ہے۔ یہ اردو زبان ہی تھی جس نے اپنی شاعری اور صحافت کے ذریعے عوامی جذبات کو مہمیز کیا اور آزادی کی جوت جگائی۔ اتحاد، یکجہتی اور اخوت کے پیغام کو عام کیا کیونکہ یہ وہ زبان ہے جس کے خمیر میں ہی محبت، اتحاد اور اخوت ہے اور اس زبان نے نہ صرف انقلاب زندہ باد کا نعرہ بلند کیا بلکہ وطنیت، قومیت، اتحاد اور ہم آہنگی کے تصور کو عام کر کے پوری قوم اور ملک کو ایک لڑی میں پرونے کی کوشش کی۔

اردو زبان سے جڑے ہوئے شاعروں اور ادیبوں نے ملک کی آزادی کے لیے قربانیاں دی ہیں۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی ہیں اور ارض وطن کو اپنے لہو سے سینچنے میں ان کا جو کردار رہا ہے اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ آج ضرورت ہے کہ اردو میں وطنیت و قومیت کے تصور کے حوالے سے گفتگو کا آغاز ہو اور یہ بتایا جائے کہ اردو میں وطنیت اور قومیت کا تصور کتنا وسیع اور ہمہ گیر ہے!

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

ماہنامہ
اردو دنیا
نئی دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:21، شمارہ:08، اگست 2019

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی
مشیر : حقانی القاسمی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ۔ نئی دہلی-110025
فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل:sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ:22-7-110 تھرڈ فلور، سالار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

کور اسٹوری
کشمیر میں کتاب میلہ — عبدالحی 8

اردو تدریس
غیر ملکی جامعات میں اردو تدریس
صورت حال اور مستقبل کے امکانات — خواجہ محمد اکرام الدین 22

زبان و تعلیم
رائٹ ٹو ایجوکیشن ایکٹ
موجودہ صورت حال اور امکانات — محمد فیروز عالم 28

نقد و نگاہ
ظفر عدیم کی چند منظومات — منظر اعجاز 30
فضا ابن فیضی کی غزلوں میں
خود نقدیت کے عناصر — ایم نسیم اعظمی 33
مسدس حالی — حاذق فرید 37
اردو شاعری میں رام اور رام
کتھاؤں کی روایت — محمد قاسم انصاری 40
اردو کی ادبی تاریخ نگاری میں
غیر مسلم ادبا — نکولن کے وی 43
نظیر اکبرآبادی اور ہندوستانی تیوہار — اسما 45

زبان اور زمینی صورت حال
مدارس سے اردو کا مستقبل روشن ہے — محمد طیب شمس 49

نگر نگر اردو
اردو زبان کا ارتقائی مرکز برہانپور — بسم اللہ عدیم 52

خراج عقیدت
شفاعت علی صدیقی — شاہد حبیب 55

اقبال مجید کا فن — عشرت لطیف 57

سلسلۂ صحافت
اڈیشہ میں اردو صحافت — سعید رحمانی 59

تہذیب و ثقافت
مقدس گنگا — فاروق ارگلی 61

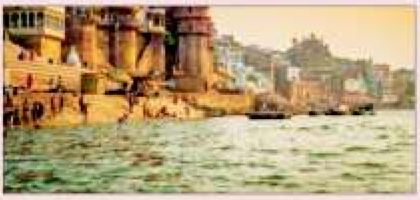

نیا آسمان نئے ستارے
مخدوم محی الدین کی غزلیہ شاعری — محمد حسنین رضا 63

ہم نے جنھیں بھلا دیا
نرالے میاں شمس — ابوزر عبدالاحد فرقانی 66

سائنس/ٹیکنالوجی
انفارمیشن ٹیکنالوجی اور اردو — عرفان رشید 69

کمپیوٹر
گرافکس 71

کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ — ادارہ 74

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 85

آپ کی بات

'اردو دنیا' جون کے اداریے 'ہماری بات' میں آپ نے اردو زبان کے فروغ اور تحفظ کے لیے طول وعرض میں منعقدہ سمینار، کانفرنس اور ادبی اجلاس وغیرہ کا محاسبہ کرتے ہوئے اردو زبان کے تحفظ کے لیے مزید سنجیدہ اقدامات کو روبہ عمل لانے کی بات کہی ہے جو برحق ہے حالانکہ موجودہ حالات اردو کے فروغ سے غیر متضاد ہیں یعنی اسکولوں سے اردو کا اخراج اور اردو کی بنیادی تعلیم غیر منظم اور اساتذہ سے خالی وغیرہ۔ ایسی سنگین صورتِ حال کے باوجود اردو کا زندہ رہنا یقیناً ایک کرشمہ ہے لیکن اردو آج تقریباً صفحۂ قرطاس سے نکل کر ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ میں داخل ہو چکی ہے، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اردو نگارشات تخلیقات اور سیکڑوں بیش بہا اردو کے دستاویزات جو کتب خانوں میں بند تھے اس کا ایک تہائی حصہ انٹرنیٹ کی مٹھی میں بند ہو چکے ہیں لیکن جو لطف کتابوں کے مطالعے سے ملتا تھا وہ بٹن دبا کر موبائل کے ذریعے حرف بہ حرف اور لفظ لفظ پڑھنے میں نہیں ملتا۔ اب ایسے میں ہمیں بھی ایسی ایجادات کو منظرِ عام پر لانے کی ضرورت ہے کہ ٹیکنالوجی اور میڈیا کے ذریعے اردو (Classes) اور دیگر ادبی معلومات کا سلسلہ شروع کریں جو ناممکن نہیں ہے جب کہ (You Tube) میں ایسی درس گاہیں ہمیں اس نہج پر انٹرنٹ دیکھنے اور پڑھنے کو ملتی ہیں۔ پھر بھی یہی سوال اٹھتا ہے کہ کتب خانے کہاں جائیں؟ جہاں تک ناچیز کا تجزیہ اور اندیشہ گردشِ دوراں کی نبض پر انگلی رکھتے ہوئے لاحق ہو رہا ہے کہ ہر نیا دور اپنے مرکز کی طرف لوٹتا ہے کتب خانے لائبریری، درس گاہیں اردو کے ادارے جوں کے توں برقرار تو رہیں گے لیکن ان میں تھوڑی بہت (Computerised) تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی رہیں گی جن کا ہمیں سامنا بھی کرنا ہے۔ ان نسلوں کو جو آج آٹھوں پہر موبائل ہاتھوں میں لیے دنیا بھر کے غیر ضروری حالات وکوائف کو دیکھنے میں ڈوبے ہوئے ہیں انھیں ترغیب دی جائے کہ وہ ان گوشوں کی طرف بھی توجہ دیں جہاں اردو زبان اپنے تئیں انھیں ٹیکنالوجیکل صورتِ حال سے اپنا نیا تعارف کروا رہی ہے۔

علیم صبا نویدی: رائس منڈی اسٹریٹ، چینئی، تمل ناڈو

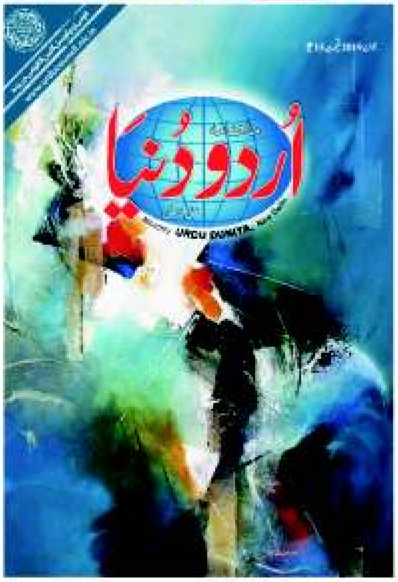

عید سعید کے موقعے پر 'اردو دنیا' جون 2019 وصول ہوا اور عید کی خوشیوں کو دوبالا کر گیا۔ اور خوشی کی بات یہ بھی تو ہے کہ ہندوستان ایک ملی جلی لسانی اور تہذیبی وراثت ہے اور اسی میں ہمارے ملک کا اتحاد اور سالمیت قائم ہے۔ حق وانصاف کی بات یہی ہے کہ ملک کی ہر زبان وثقافت کو یکساں مواقع فراہم ہوں اور یہی کچھ آزادی کے بعد ممکن ہو سکا اور اسی اصول کی بنیاد پر اردو زبان وتہذیب اپنی منزل کی جانب قومی اردو کونسل کی قیادت میں رواں دواں ہے۔ زیرِ نظر شمارے کی صنفی تقسیم و ترتیب کوئی چودہ حصص میں کی گئی ہے۔ ہر جز علم وادب اور تفنن طبع سے معمور ہے۔ چنانچہ اردو زبان کی تدریس میں انفارمیشن اور ٹکنالوجی (ص8) کے استعمال سے متعلق جس تفصیل سے بتایا گیا ہے وہ پڑھ کر طبیعت حیران ہے۔ تعجب یہ ہوتا ہے کہ انگریزی کی ہر کلاس میں لٹریری انفارمیشن کتنی آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہے اور اردو والوں کی بے حسی پر سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے کہ اگر ہمیں کسی انفارمیشن کی ضرورت ہوتی ہے تو ہم انٹرنیٹ سے انگریزی میں حاصل کر کے اسے ترجمہ کر لیتے ہیں۔ اگر اردو طلبہ فعال ہو جائیں تو یہ معلومات لمحوں میں حاصل ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالحی نے ص 14 تا ص 17 تک ابوظہبی کتاب میلہ کی دل خوش کن روداد پیش کی ہے۔ یہ خبر خوش آئند ہے کہ کونسل کی تاریخ میں کسی بیرونی ملک یعنی ابوظہبی انٹرنیشنل کتاب میلے میں اردو ادبی تقریبات کا اہتمام کیا گیا اور یہ کہ ہندوستان کو بطور گیسٹ آف آنر کے مدعو کیا گیا۔ نیز میزبان ملک کے شاہانہ و پُر شکوہ ماحول میں عمائدین واکابرین کے شانہ بشانہ ڈائرکٹر قومی اردو کونسل کی موجودگی میں شمع منور کر کے بھارت پویلین کا افتتاح کرنا عظیم تر اعزاز و باعثِ افتخار ہے۔

اردو دنیا کے ہر شمارے میں انٹرویو کے لیے 25 سوالات پر مشتمل ایک سوال نامہ (ص 18) دیا جاتا ہے جس کا مقصد اردو زبان کے بنیادی مسائل سے آگاہی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس بار صفیہ بانو نے اپنے خیالات کا اندراج کیا ہے۔ اس دروبست میں محترمہ نے تلخ حقائق کا ادبی زبان میں اظہار کیا ہے۔ یہ مواد اردو دنیا کے لیے یقیناً مفید ثابت ہوگا۔ ص 22 پر جہان شبلی کے

عنوان سے اچھا مضمون ہے۔ اگر آپ کو تصانیف کی تفاصیل، تراجم اور تلخیصات میں دلچسپی ہے تو اس مضمون کا ضرور ورد کیجیے۔ ص 25 پر اردو مرثیے کے نئے رنگ و روپ دیے گئے ہیں۔ بدلتے حالات میں نئے شعرا نے مراثی کو نئے نئے انداز سے لکھا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انشاء کی عشقیہ شاعری کے بارے میں ص 29 سے معمول کے مطابق شروعات ہوئی کہ بچپن ہی سے ان کا رجحان شاعری کی جانب تھا۔ تغزل ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا اور وہ 16 برس میں ہی صاحب دیوان بن چکے تھے۔ ص 31 پر حکیم اجمل خان کے اردو کلام پر تبصرہ درج ہے۔ تحریک اصلاح زبان کا جائزہ (ص 34) ادبیات پر بہت خوب مضمون ہے۔ اسی طرح غالب کے دوست رائے چھج مل (ص 38) اور اسی تسلسل میں کلام غالب کی تعبیر کے امکانات (ص 41) بھی ظاہر ہے کہ کلاسیکی و تحقیقی ادب سے متعلق ہیں۔ ایک پر اثر مضمون ڈاکٹر جمیل جالبی کی یادوں اور باتوں (ص 45) پر پیش نظر ہے۔ ص 48 پر وسیم احمد سعید پر بڑا لرزہ خیز مضمون تحریر ہے۔ مشہور شاعر بیکل اتساہی سے کون واقف نہیں ہے (ص 51) ان کے حالات حیات اور کلام سے لطف اٹھائیے اور سر دھنیے۔ ص 53 پر سلیم احمد کی غزل کے تعلق سے لکھا ہے کہ ان کے کلام میں تمام کلاسیکی استادان ادب نظر آتے ہیں تو پھر اسی چیز کی مزید نقالی سے کیا حاصل؟ ص 55 پر دوسری عالمی جنگ کے تناظر میں احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ص 59 پر ساغر نظامی کی نظم نگاری اور وطن پرستی پر اچھا مضمون ہے۔ اڑیسہ میں اردو کی ترقی اور مسائل کے حل (ص 61) پر مضمون لکھا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اڑیہ زبان میں اردو کے کوئی پانچ ہزار الفاظ روز مرّہ بولی میں مستعمل ہیں۔ اس سے وہاں اردو زبان کی ترویج کی امید بندھتی ہے۔ یہ مضمون 'اردو دنیا' کے مزاج و منہاج سے مطابقت رکھتا ہے اور کافی دلچسپ بھی ہے۔ ص 65 پر شاطر حکیمی کے غزلوں پر گفتگو کی گئی ہے جنھیں موضوع کے مطابق تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (1) عشق مجازی (2) خالص صوفیانہ کلام اور (3) عشق مجازی و حقیقی دونوں پر مبنی کلام۔ پھر ان کی تفصیل دی گئی ہے۔ ص 67 پر مشہور افسانہ نگار ہرچرن چاؤلہ کی افسانہ نگاری کی خصوصیت بیان کی گئی ہے کہ وہ رنگ و نسل میں امتیاز کے سخت خلاف تھے اور ان کے اکثر افسانے اس موضوع کے گرد گھومتے ہیں۔ ص 69 پر کمپیوٹر لسانیات پر بڑا تکنیکی اور اہم مضمون درج ہے۔ ص 71 پر خلا میں در آئے بین النجوم سیارہ، جسے اُموا اُموا (Oumuamua) نام دیا گیا ہے، کی حرکات و سکنات اور دمدار ستاروں اور دیگر اجرام فلکی کی گردش کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ فلکیات اور طبعیات کے طلبہ اس سے بہت کچھ معلومات اکٹھا کر سکتے ہیں۔ ص 74 پر کمپیوٹر کورس سے متعلق فہرستیں اور جدول اور ان کی عملی تکنیک سے متعلق قابل قدر معلوم دی گئی ہیں جن سے کمپیوٹر سیکھنے والے طلبہ کو خاطر خواہ فائدہ ہوسکتا ہے۔ تبصرہ و تعارف کے ذیل میں کوئی سات کتابوں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ص 84 پر قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں اور خبرنامہ دیا گیا ہے۔ پہلی خبر بڑی دل خوش کن ہے کہ ایک اردو میڈیم لڑکی نے دہلی میں اوّل مقام حاصل کر کے CBSE ٹاپرس میں تیسرا مقام حاصل کیا۔ قومی اردو کونسل میں اس کا استقبال کر کے ہمت افزائی کی گئی۔

❖ **مصطفیٰ ندیم خاں غوری**: روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

ماہنامہ 'اردو دنیا' جون 2019 دستیاب ہوا۔ بے حد ممنون ہوں۔ 'ہماری بات' کے الفاظ ایسے ہیں جیسے مقرر خوش بیان کے منہ سے نکلے ہوئے لفظوں کے موتیوں کی لڑیاں۔ میری نظروں میں اس باب کے چند جملے 'اقوال زریں' کی حیثیت رکھتے ہیں مثلاً:

(1) کثرت میں وحدت ہندوستان کا حسن ہے۔
(2) لسانی اور تہذیبی سطح پر تنوع اس ملک کا تشخص ہے۔
(3) اس کے علاوہ اردو ہندی میں بہت سے محاورے اور ضرب الامثال ہیں، جو مشترکہ ہیں۔
(4) امیر خسرو، ملک محمد جائسی، سنت کبیر داس، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، عبدالرحیم خانخاناں، افضل جھنجھانوی اور پریم چند وغیرہ بہت اہم ہیں، جو اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ایک مشترکہ ورثے کی حیثیت رکھتے ہیں۔
(5) مراٹھی میں جہاں بہت سے اردو فارسی کے الفاظ کا استعمال ہے وہیں، پنجابی تیلگو، تمل اور ملیالم وغیرہ میں بھی اس طرح کے الفاظ مل جاتے ہیں، جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ الفاظ اور ثقافت کی سطح پر لین دین کا سلسلہ جاری ہے۔

'اردو زبان میں آئی سی ٹی کا استعمال' محترم جرار احمد نے بہت سارے ایسے نکات ظاہر کیے ہیں، جو قابل عمل ہیں۔ ابوظہبی کتاب میلہ میں، تصویریں، کتابیں خوبصورت اور خوشنما ہیں۔ ایسے مقالات پڑھ کر یہ تخمینہ لگایا جاسکتا ہے کہ اردو صرف علمی ہی نہیں عملی طور پر بھی بین الاقوامی زبان ہے۔

ارشاد نیازی کا مقالہ 'اردو مرثیہ کے نئے رنگ و روپ' پڑھ کر سخنورانِ مرثیہ سے متعلق میرے علم میں اضافہ ہوا۔ مطلب یہ کہ مجھے معلوم ہوا، مرزا اوج شاد عظیم آبادی، جمیل مظہری، عادی انجم آفندی، آغا سکندری مہدی، ڈاکٹر صفدر حسین، مہدی نظمی، ناشر نقوی، ندیم امروہوی، متذکرہ شعرا حضرات نے بھی صنف مرثیہ پر طبع آزمائی کی ہے۔ میر ببر علی انیس اور مرزا سلامت علی دبیر کے بعد اس مقالے میں ڈاکٹر وحید اختر سے پہلے، مرثیہ نگاری میں ایک خاص نام کی کمی محسوس ہوئی، وہ ہے شبیر حسن خان جوش ملیح آبادی۔

عبدالناصر فاروقی کا مقالہ 'حکیم اجمل خاں شیدا اور ان کا کلام' کے تحت نمونۂ کلام کے لیے پیش کردہ اشعار استادانہ مہارت لیے ہوئے ہے۔ مثال کے طور پر ایک مطلع ہے۔

وفا اُس پر جفا مجھ پر، ستم یوں بھی ہے اور یوں بھی
عدو پر میرے دلبر کا، کرم یوں بھی ہے اور یوں بھی

ان لفظوں پر سلسلۂ کلام عارضی طور پر روک دیتا ہوں کہ

یہ قصۂ لطیف ابھی ناتمام ہے
جو کچھ بیاں ہوا ہے وہ آغازِ باب تھا

❖ **اشفاق کارنجوی**: جی این آزاد اردو ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج، باڑے گاؤں، مہاراشٹر

ماہنامہ 'اردو دنیا' جون ماہ کا شمارہ حسب سابق دیدہ زیب و جاذب نظر سرورق اور معیاری مشمولات سے مزین ظہور پذیر ہوا ہے۔ اس بار کے اداریے میں مدیر صاحب نے قومی یک جہتی کے استحکام کے لیے واجب اقدام کی بخوبی خط کشی کی ہے۔

ڈاکٹر عبدالحی نے ابوظہبی کتاب میلے کی ہمہ گیر رپورتاژ پیش کی ہے۔ حیات افتخار صاحب نے بیکل اُتساہی جیسے اردو ہندی کے شہرۂ آفاق شاعر کو ایک مناسب خراج عقیدت پیش کیا ہے اور ان کے گیتوں سے انتخاب پیش کیا ہے۔ جناب مناظر عاشق ہرگانوی نے مشہور و معروف ادیب جمیل جالبی کی ادبی خدمات کو نشان زد کرنے میں کاملاً کامرانی حاصل کی ہے۔ ارشاد نیازی کا مضمون 'اردو مرثیے کے نئے رنگ و روپ' حد درجہ عرق ریزی کا مظہر ہے۔ لیکن ایک بھی ہندو شاعر کا نام نہ لینا ضرور کھٹکتا ہے، کیونکہ متعدد ہندو شعرا نے بھی حضرت حسین اور کربلا کے واقعات پر معیاری اور بلند پایہ مراثی کی تخلیق کیے ہیں، جن سے چشم پوشی یا پہلو تہی ہرگز نہیں

کرنی چاہیے تھی۔ چند نام یہ ہیں مثلاً جناب جوش ملسیانی، عرش ملسیانی، منور لکھنوی، نانک لکھنوی، گوپی ناتھ امن، گورسرن ادیب، راجیندر ناتھ شیدا، ضیا فتح آبادی، پریم چند پریم، چندر بہاری لال ماتھر، جگدیش چندر روشن، امر چند قیس، بلونت کمار ساگر، رام پرتاپ اکمل، رام لال ورما، قمر جلال آبادی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، کرشن گوپال مغموم، رام پرکاش ساغر، طالب دہلوی، طالب پانی پتی، رگھبیر پرساد گوہر، آفتاب پانی پتی، رام نرائن جگر، گیان چند منصور وغیرہ۔ یہ تمام نام ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنے تحقیقی مقالے 'اردو شاعری میں ہندوستانی عناصر' میں درج کیے ہیں۔

گزشتہ صدی میں جناب شیش چند طالب نے ایک مکمل کتاب بھی 'ہمارے حسین' نام سے شائع کی تھی۔ حضرت امام حسین کی شہادت کے علاوہ متعدد ہندو شعرا نے ممتاز مسلم شخصیتوں کی وفات پر بھی پُر درد مرثیے اور نوحے لکھے ہیں۔

ڈاکٹر کرشن بھاوک : کوٹھی نمبر A-201، گورونانک، پٹیالہ

اردو دنیا جون 2019 کا شمارہ بروقت ہدست ہوا۔ ہماری بات میں مدیر نے اردو زبان و ادب اور قومی یک جہتی کا کردار مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کی۔ وہ کہتے ہیں شاعری اور فکشن کا ایک بڑا ذخیرہ اس کا ثبوت ہے اور ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ ایک زمانے میں ہندی کے مسلمان مصنفین اپنی کتابوں کی ابتدا شری گنیش اور سرسوتی کی مدح سے کرتے تھے اور اردو کے ہندو شعرا، ادبا بسم اللہ الرحمٰن سے۔ ماضی میں یہ عمل تھا حال میں مفقود ہو گیا ہے۔ اس شمارے کے مشملات معلوماتی اور مختلف نوعیت کے ہیں اور ان میں جدید اور عصری انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

ناظم علی : سابق پرنسپل، یاقوت پورہ، حیدرآباد، تلنگانہ

اردو دنیا 'اردو دنیا' بابت مئی 2019 اس وقت پیش نظر ہے۔ اس کے صوری حسن اور معنوی جمال کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ 'ہماری بات' کے تحت اردو کے فروغ کے تعلق سے آپ کے عزائم لائق تحسین ہیں۔ خصوصاً آپ نے کچھ ایسے علاقوں کی بات کی ہے جہاں اردو کے لیے زمین تو زرخیز ہے مگر اس کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں ہیں۔ یہ صورتِ حال اڈیشہ کے بعض شہروں خاص کر کٹک، بھدرک اور بالیسر میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہاں کے مدارس میں تو اردو تعلیم کا نظم ہے مگر اسکولوں اور

کالجوں سے اردو آہستہ آہستہ ختم ہوتی جا رہی ہے جو ہمارے لیے تشویش کی بات ہے۔ اگر آپ کا ادارہ اس کے تدارک کے لیے مؤثر اقدامات کرے تو بہتری کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔

آپ اردو کو ہر گھر کے دروازے تک پہنچانے کا عزم بھی رکھتے ہیں، یہ بڑی اچھی بات ہے۔ اللہ آپ کے نیک ارادوں کو استحکام بخشے۔ دیگر مشمولات میں 'ٹکنولوجی میں اردو کا کامیاب مستقبل' تضمین نگاری، بدایوں کا غزل گو شاعر اور تمل ناڈو کا انمول رتن' مفید اور معلوماتی مضامین ہیں جس کے لیے سہیل ارشد، شمیم احمد صدیقی، علیم صبا نویدی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کمپیوٹر کے تعلق سے سلسلہ وار مضامین افادیت کے حامل ہیں۔ یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رکھیں۔ 'خبرنامہ' کا کالم کافی اہمیت رکھتا ہے جس کے ذریعے پوری اردو دنیا کی تازہ ترین خبریں مل جاتی ہیں۔ مجموعی طور پر کہا جائے تو 'اردو دنیا' کا ہر شمارہ دستاویزی نوعیت کا حامل ہوتا ہے۔

سعید رحمانی: مدیر اعلیٰ 'ادبی محاذ' دیوان بازار، کٹک، اڈیشہ

'اردو دنیا' مارچ 2019 اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ علمی، ادبی، تحقیقی و تنقیدی مضامین لیے ہوئے ہے۔ روزنامہ منصف کی ادبی خدمات پر شیخ عمران کا مضمون اچھی کوشش ہے مگر موصوف نے سرسری جائزہ لیا، اس کا حق ادا نہیں کیا۔ اس میں شک نہیں کہ اخبار کی زندگی ایک دن کی ہوتی ہے مگر اس کے باوجود اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت شہر حیدرآباد سے سات اخبارات، روزنامہ سیاست، روزنامہ رہنمائے دکن، روزنامہ منصف، روزنامہ اعتماد، روزنامہ صحافی دکن، روزنامہ راشٹریا سہارا اور روزنامہ صدائے حسینی شائع ہوتے ہیں۔ رہنمائے دکن کی اشاعت کا سال 1921 ہے جبکہ روزنامہ سیاست کا 1947 ہے۔

روزنامہ منصف 3 مارچ 1977 کو محمد انصاری نے جاری کیا جبکہ مضمون نگار نے 1979 بتایا ہے۔ ابتدا میں یہ اخبار علی کا نیچ معظم جاہی مارکٹ سے شائع ہوا اور تقریباً دس سال بعد اپنی ذاتی عمارت گل منڈی میں منتقل ہوا۔ محمود انصاری کے انتقال کے بعد ان کے بھائی مسعود انصاری نے کوشش کی اس وقت منصف کے چرچے تھے۔ معیاری خبروں کے ساتھ خصوصاً جرائم اور فسادات کی خبریں دیدہ دلیری کے ساتھ شائع کی جاتی اور مارکٹ سے اخبار منٹوں میں فروخت ہو جاتا۔ اس کی اس دیدہ دلیری، حق گوئی و بے باکی کی وجہ سے کئی ماہ تک اس کی اشاعت کو مسدود کر دیا گیا۔ اس میں پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کا کالم میرا مطالعہ، ڈاکٹر بیگ احساس کا کالم آنکھ نے دیکھا (ٹی وی سیریل پر) وتار خلیل، رحمٰن جامی، غنی نعیم، احمد جلیس (من موجی) احسن علی مرزا (ہرفن مولا) حیدرآباد کی ادبی شخصیتوں پر ادبی البم، بشیر جنیدی (قلمی صفحہ) شاہ علی مقصود فوٹو گرافر کی تصویریں منہ بولتی تھیں۔

اس دور میں ایک اور روزنامہ نوید دکن دیون دیوڑھی سے شائع ہوتا تھا۔ جس میں راقم طب و صحت کا کالم لکھتا تھا مگر یہ اخبار بھی زیادہ دن نہ چل سکا۔ اس طرح سنہ 1997 میں حیدرآباد کی ایک معزز شخصیت، بزنس مین خان لطیف محمد خان نے اسے حاصل کیا اور 25 دسمبر سے 31 دسمبر تک مفت ملٹی کلر اخبار عوام میں بانٹتے رہے اور یکم جنوری 1998 سے خان لطیف محمد خان کی زیر ادارت اخبار شائع ہونے لگا۔ اس اخبار کی اشاعت پر حیدرآباد میں ایک انقلاب آیا۔ اچھے صحافیوں کو رکھا گیا اور اس طرح پہلا ملٹی کلر اخبار چار صفحات کے ضمیمہ کے ساتھ شائع ہونے لگا۔ گلدستہ (بچوں کا صفحہ) پیر، گھر آنگن (خواتین کے لیے منگل) (سائنس اور ٹکنالوجی) چہارشنبہ، (آئینہ شہر اور آئینہ ادب) جمعرات، مینار نور (مذہبی ایڈیشن)، نئے قدم نئی منزلیں (نوجوانوں کے لیے)، نقوق (سنڈے ایڈیشن) شائع ہوتا ہے۔ اس اخبار کے بعد روزنامہ اعتماد نے بھی اپنے ایڈیشن شائع کیے۔ سیاست کا ایک الگ معیار تھا۔ اس کا ادب اعلیٰ اور معیاری تھا۔ آج کل صرف دو اخبار صحافی دکن اور منصف چار صفحات رنگین ضمیمہ شائع کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر م ق سلیم: صدر شعبۂ اردو، شاداں کالج حیدرآباد، تلنگانہ

کشمیر میں کتاب میلہ

عبدالحی

کشمیر میں کتاب میلہ!

کشمیر کا تصور آتے ہی ذہن میں اس جنت ارضی کی ساری رعنائیاں سمٹ آتی ہیں جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ۔

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است ہمیں است ہمیں است

یہ وہی کشمیر ہے جو صدیوں سے اپنی خوبصورتی اور دلکش قدرتی نظاروں کے لیے معروف رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کشمیر میں ہزاروں سال پہلے ایک جھیل ستی سرتھی جس پر ایک راکشش جل ادبھو کا قبضہ تھا۔ کشیپ رشی نے اس علاقے اور جھیل کو اس دیو سے آزاد کرانے کے لیے تپیا کی۔ کشیپ رشی کی ریاضت سے خوش ہو کر وشنو، برھما اور شیو نے مدد کرنے کا بھروسہ دلایا۔ وشنو نے جنگلی سور (ورہہ) کے روپ میں آ کر اپنی دُم کو جھٹکا جس سے پہاڑ سے پانی کے نکلنے کا راستہ بن گیا۔ جس جگہ یہ پہاڑ کٹا تھا اسے ورہ مُل (بارہمولہ) کہا جاتا ہے۔ جب ستی سر کا سارا پانی بہہ گیا تو ایک خوبصورت زمین نظر آئی جسے کشیپ کے نام سے جوڑ کر کشیپ میر یا کشمیر کا نام دے دیا گیا۔ سری نگر آج جہاں آباد ہے کہتے ہیں کہ وہاں کسی مقام پر جل ادبھو کو مارا گیا تھا اور پھر دھیرے دھیرے وہاں بستیاں آباد ہوتی چلی گئیں۔ تاریخ کی ان باتوں سے ہم اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن اس بات سے شاید ہی کوئی انکار کرے گا کہ کشمیر پر قدرت کا، دیوتاؤں کا خاص ہاتھ رہا ہے اور کشمیر جو بھی جاتا ہے وہ وہاں کی دلفریب فضاؤں اور آب و ہوا کا اسیر ہو جاتا ہے اور وہاں دوبارہ جانے کی چاہت لے کر لوٹتا ہے۔ کشمیر کے آبشار، یہاں کی جھیلیں، چنار کے اونچے اونچے درخت، میووں کے باغات، برف سے ڈھکے پہاڑ، اور فضا میں گھلی زعفران کی خوشبو ہر آنے جانے والے کے کانوں میں سرگوشیاں کرتی ہے کہ آؤ اور مجھے دیکھو، میں کشمیر ہوں۔ علامہ اقبال نے کہا تھا۔

کشمیر کا چمن جو مجھے دلپذیر ہے
اس باغ جانفزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثے میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائیداد
جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

کشمیر نہ صرف اپنے خوبصورت باغات اور پہاڑوں کے لیے جانا جاتا ہے بلکہ کشمیریوں کی مہمان نوازی بھی مشہور ہے اور یہاں آنے والے سیاح ہمیشہ یہاں کے لوگوں کی تعریف کرتے رہتے ہیں۔ برج نارائن چکبست نے کہا تھا

ذرہ ذرہ ہے میرے کشمیر کا مہمان نواز
راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے

کہا جاتا ہے کہ کشمیر دنیا کی قدیم تہذیب و ثقافت میں سے ایک ہے جو طوفان نوح کے بعد ہی وجود میں آگئی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے حضرت سلیمانؑ نے بھی اس سرزمین پر قدم رکھا تھا اور ان کی یادگار کے طور پر سری نگر میں موجود شنکرآچاریہ مندر کو تخت سلیمان بھی کہا جاتا ہے۔ سری نگر کو مغل بادشاہوں اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب نے بھی کافی پسند کیا تھا اور انھوں نے کئی دفعہ کشمیر کی سیاحت کی اور کافی وقت یہاں گزارا تھا۔ 1635 میں شاہجہاں کے حکم سے ڈل جھیل کے کنارے چنار کے 1200 درختوں کو لگایا گیا جنھیں پانی کے ساتھ دودھ سے بھی سینچا گیا۔ یہ تمام درخت (ایک مستطیل کی شکل کے زمینی حصے کے چاروں کونے پر) چار چنار کے پیٹرن پر لگائے گئے ہیں۔ ان چاروں چنار کے مرکزی حصے میں کھڑے شخص کو دن میں کسی بھی وقت دھوپ کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ چنار کے درختوں پر مشتمل اس باغ کو نسیم باغ کا نام دیا گیا۔ یہ نسیم باغ فی الحال کشمیر یونیورسٹی کا حصہ ہے اور یہاں چنار کے کچھ درخت تو 300 سال سے بھی زیادہ پرانے ہیں۔ موسم خزاں میں چنار کی پتیاں سرخ ہوجاتی ہیں اور ان کا نظارہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ یہاں لگے چنار کے اونچے درخت آج بھی صدیوں سے فاتحانہ انداز میں کھڑے ہیں اور جیسے کہہ رہے ہوں کہ کشمیر آکر ہمیں نہ دیکھا تو کیا دیکھا۔ اسی طرح شالیمار باغ کو شہنشاہ جہانگیر نے اپنی بیگم نور جہاں کے لیے بنوایا تھا۔ نشاط باغ کو نور جہاں کے بھائی آصف جاہ نے بنوایا تھا۔ سری نگر میں چشمہ شاہی، ہری پربت، پری محل اور حضرت بل بھی سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہیں۔ حضرت بل ایک مشہور درگاہ اور مسجد ہے جہاں حضور اکرمؐ کے موئے مبارک محفوظ ہیں جنھیں سال میں دو دفعہ زیارت کے لیے کھولا جاتا ہے اور دور دور سے زائرین یہاں تشریف لاتے ہیں۔ یہ تمام مقامات سری نگر میں واقع ہیں ان کے علاوہ گلمرگ، پہلگام، سون مرگ، دودھ پتھری، وولر جھیل، بیتاب ویلی وغیرہ بھی سیاحوں کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں۔

کشمیر کی اپنی تہذیب و ثقافت رہی ہے اور یہاں کے کھانے اور ان کو تیار کرنے کا نرالا انداز بھی کشمیر اور یہاں کے لوگوں کو ممتاز بناتا ہے۔ کشمیر میں زمانہ قدیم میں سنسکرت، بولی جاتی تھی پھر فارسی اور بعد میں ہندی و اردو کا چلن ہوا۔ ساتھ ہی مقامی زبانیں کشمیری اور پہاڑی وغیرہ بھی بولی جاتی ہیں۔ 1889 میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے دور اقتدار میں ریاست جموں و کشمیر میں فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہوا حالانکہ ان سے قبل مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دور میں بھی ریاست میں اردو زبان کافی پھلی پھولی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے سنسکرت کی کتابوں

کتاب میلے پر اہم شخصیات کے تاثرات

سلطان الحق شہیدی

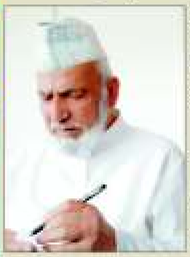

میں سلطان الحق شہیدی اردو زبان و ادب کا استاد اور 26 کتابوں کا مصنف اور مترجم ہوں۔ 1954 میں انجمن ترقی اردو کی کشمیر میں پطرس بخاری اور قاضی عبدالغفار کے مشورہ پر بنیاد ڈالی۔ پہلا اردو مجلّہ 'نیا قدم' نام سے نکالا اور اس کی تشہیر کی۔ اردو اکادمی کے قائم کرنے میں بنیادی ممبر کی حیثیت سے کام کیا۔ میرے ساتھیوں میں اردو کے مشہور افسانہ اور ناول نویس عمر مجید اور نور شاہ کے علاوہ اور بھی لوگ رہے ہیں۔

کشمیر سے باہر کی اردو دنیا سے میرے ستر سال سے تعلقات رہے ہیں۔ جوش ملسیانی، الم مظفر نگری، قمر مرادآبادی، مخمور سعید، گلزار دہلوی اور نہ جانے شہریار جیسے کتنے چوٹی کے شعرا سے رابطہ رہا۔ کل ہند مشاعروں میں شرکت کرتا رہا اور اردو کی ترویج و توسیع کی راہ پر مسلسل گامزن ہوں۔

اب کے فروغ اردو زبان ادب کے شعبے کی طرف سے سری نگر کشمیر یونیورسٹی میدان میں کل ہند اردو کتاب میلہ ایک احسن قدم ہے۔ مجھے اردو کونسل کشمیر کے سکریٹری جاوید ماٹجی کے خیالات سے بالکل اتفاق ہے۔ اس لیے اس عبارت کو دہرانا نہیں چاہتا۔

فروغ اردو کے قومی ادارے کے کارکنان نے بڑی محنت اور صبر آزمائی سے کام لیا ہے۔ ڈائرکٹر عقیل صاحب کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں اور ان کے معاونین کو دعا دیتا ہوں۔

پروفیسر عبدالرشید

(شعبہ اسلامک اسٹڈیز، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر)

قومی سطح کا یہ کتاب میلہ ایک قابل ستائش قدم ہے۔ اس میں تقریباً ملک کے سبھی اہم اردو پبلشرز اور سیلرز شریک ہیں۔ اسٹال اچھی طرح سے سجائے گئے ہیں اور Discount بھی معقول ہے۔ اردو زبان اور ادب کے علاوہ سماجیات، تاریخ اور اسلامیات پر بہت عمدہ کتابیں

پر مشتمل ایک لائبریری بھی قائم کی تھی۔ ساتھ ہی فارسی اور سنسکرت کی مختلف کتابوں کے کشمیری و اردو میں ترجمے بھی کرائے گئے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ مختلف علوم و فنون سے دلچسپی رکھتے تھے اور ان کی اس دلچسپی نے کشمیر کو دانشوروں، فلسفیوں کی آماجگاہ بنا دیا۔ یہ ریاست تین خطوں جموں، وادی کشمیر اور لداخ پر مشتمل ہے۔ ریاست میں ہندی، کشمیری، ڈوگری، پہاڑی، بلتی، لداخی وغیرہ زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن اردو کے سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے یہ زبان پوری ریاست میں عام طور پر سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ یہاں بنیادی اور ثانوی سطح پر اردو تعلیم کا بہتر نظم ہے۔ ڈگری کالجوں میں بھی اردو پڑھائی جاتی ہے اور یہاں قائم یونیورسٹیوں (جموں یونیورسٹی، کشمیر یونیورسٹی، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی اور سنٹرل یونیورسٹی آف کشمیر) میں اردو کے شعبے قائم ہیں اور طلبہ کی اچھی خاصی تعداد اردو تعلیم حاصل کر رہی ہے۔

یوں تو پورا کشمیر ہی جنت بے نظیر ہے لیکن سری نگر میں واقع کشمیر یونیورسٹی کا حسن اپنے آپ میں دیکھتے بنتا ہے۔ اسی کشمیر یونیورسٹی کی علامہ اقبال لائبریری میں 23ویں کتاب میلے کا انعقاد کیا گیا۔

کشمیر میں اس سے قبل 2014 میں نیشنل بک ٹرسٹ کے زیر اہتمام کتاب میلے کا انعقاد ہوا تھا جس میں قومی اردو کونسل نے بھی شرکت کی تھی اور کئی پروگراموں کا انعقاد بھی کونسل کے تعاون سے کیا گیا تھا۔ قومی اردو کونسل نے 2003 میں بھی یہاں کتاب میلے کا انعقاد کیا تھا جس میں تقریباً 22 لاکھ روپے کی کتابیں فروخت ہوئی تھیں۔ یہ میلہ بھی کافی کامیاب رہا تھا لیکن 2019 کے میلے نے یہاں منعقدہ گذشتہ سارے میلوں کا ریکارڈ توڑ دیا۔ کونسل اب تک دہلی ممبئی، لکھنؤ، حیدرآباد، پٹنہ، سری نگر، بنگلور، اورنگ آباد، مالیگاؤں اور سولاپور جیسے شہروں میں کتاب میلے کا انعقاد کر چکی ہے جن میں سرکاری اور نجی ناشرین بڑی تعداد میں شریک ہوئے اور ہر میلے میں لاکھوں روپے کی اردو کتابیں فروخت ہوئیں۔ ملک کے طول و ارض میں ابھی تک 22 کتابوں میلوں کا انعقاد ہو چکا ہے اور یہ قومی اردو کونسل کا تیئسواں اردو کتاب میلہ تھا۔

کتاب میلے سے چار دن قبل ہی قومی اردو کونسل کی ٹیم شعبہ فروخت کے انچارج جناب شاہنواز خرم کی قیادت میں سری نگر پہنچ چکی تھی اور وہاں کتاب میلے کی تیاریوں کی دیکھ ریکھ کر رہی تھی۔ میلے کے دوران ہی شاہنواز محمد خرم کو حج ڈیوٹی کے لیے سعودی عرب جانا پڑ گیا جس کی وجہ سے اس کی دیکھ ریکھ کا ذمہ قومی اردو کونسل کے اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر جناب اجمل سعید کو سونپا گیا۔

دستیاب ہیں۔ کتاب میلہ میں طلبہ و طالبات، ریسرچ اسکالرس اور اساتذہ کے علاوہ ریاست کے ادیبوں کی بڑی تعداد نظر آرہی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ موجودہ انٹرنیٹ کے باوجود لوگ کتابوں کے شوقین ہیں اور کتاب بینی کی اپنی اہمیت اور افادیت ہے اس سے ہم سب اتفاق کرتے ہیں۔

حمیداللہ حمید

(ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ آفیسر، لداخ، کشمیر)

کتاب میلہ کو یونیورسٹی کے احاطے میں دلچسپی سے دیکھا۔ پہلا موقع ہے اس قسم کا خوش نما میلہ دیکھنے کو ملا۔ پورے چار گھنٹے ان اسٹالوں پر گزارے۔ کئی کتابوں کو خریدا۔ میری تجویز ہے کہ سال میں دو تین بار سرینگر کے مرکز میں کتابوں کی نمائش ہونی چاہیے ہر قسم اور ہر موضوع پر کتابیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مبارکباد کے مستحق ہیں وہ اصحاب اور ادارے جو اس قسم کی نمائش کا اہتمام کرتے ہیں۔ نہ صرف ادبا، پروفیسران، لیکچرار، شاعروں اور ادبا کے علاوہ طلبا کو فائدہ ملتا ہے مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قانون سے متعلق کتابوں کا اسٹال آگے لگنا چاہیے تا کہ وکلاء بھی ادھر آسکیں۔

جاوید ماٹجی

(سکریٹری جنرل جموں کشمیر اردو کونسل)

سرینگر میں قومی اردو کتب میلے کا انعقاد ایک احسن قدم ہے جس کے لیے قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جملہ انتظامیہ مبارکباد کی مستحق ہے۔ اس کتاب میلے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اردو زبان کے تئیں ارباب اقتدار اور عوام اپنی اپنی ذمے داریاں محسوس کرنے لگے ہیں۔ گذشتہ تیس سال کے نامساعد حالات نے یہاں کے سبھی شعبوں کو متاثر کر کے رکھ دیا ہے اور لوگ خاص کر نئی پود علم و ادب زبان تہذیب تمدن اور روایات کے بارے میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہے ہیں ایسے میں اردو کتب میلہ ایک اہم کڑی ہے کہ ان اہم شعبہ جات کی جانب لوگوں کی توجہ مرکوز کرائی جاسکے۔ اس کے علاوہ کتابوں کے تئیں جو منفی رجحان ہمارے سماج میں پایا جاتا ہے اس میں بھی تبدیلی اور مثبت سمت میں رواں ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے کیونکہ اردو کتب میلہ میں لوگوں کی بڑی تعداد

انھوں نے اپنی لیاقت اور صلاحیت سے اس میلے کو کامیاب بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور میلے سے متعلق تمام کاموں کو بخیر وخوبی انجام تک پہنچایا۔ یہ میلہ کشمیر یونیورسٹی کی علامہ اقبال لائبریری کے تعاون سے منعقد کیا گیا تھا جس میں وہاں کے لائبریرین پروفیسر جی این پیر زادہ صاحب اور ان کی ٹیم کا خصوصی تعاون شامل رہا اور انھوں نے ہر قدم پر میلے سے متعلق مختلف کاموں میں ذاتی دلچسپی لی اور تقریباً ہر دن میلے میں موجود رہے۔

یہ کتاب میلہ 15 جون سے 23 جون تک منعقد کیا گیا۔ میلے کے انعقاد سے قبل 14 جون کو ایک پریس کانفرنس کا اہتمام مقامی پریس کلب، ایوان صحافت میں کیا گیا جس میں کشمیر کے مختلف صحافیوں نے شرکت کی۔ اس پریس کانفرنس میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے صحافیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ صارفیت کے اس عہد میں کتاب کلچر سے قارئین اور عوام کا رشتہ ٹوٹتا جا رہا ہے، ایسے میں عوام کو کتابوں سے قریب لانے کے لیے کتاب میلے کا انعقاد وقت کی اہم ضرورت ہے کیونکہ اگر کتابوں سے رشتہ ٹوٹ گیا تو ہم اپنی تاریخ اور تہذیب سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ کتابیں ہماری تاریخ اور تہذیب کا تحفظ کرتی ہیں اور ہمیں انسانی اقدار سے روشناس کراتی ہیں۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے یہ بھی کہا کہ قومی اردو کونسل ہندوستان میں اردو کتابوں کا سب سے بڑا اشاعتی ادارہ بھی ہے۔ شعر و ادب کے علاوہ اس نے جغرافیائی تاریخی، تہذیبی، تمدنی، لسانی، اقتصادی، معاشرتی، طبی، سائنسی، سیاسی، انتظامی اور عدالتی نظام سے تعلق رکھنے والے جن موضوعات پر کتابیں شائع کی ہیں ان کی تعداد اب تک 1300 سے تجاوز کر چکی ہے۔ لغات، فرہنگ، انسائیکلوپیڈیا، نصابی اور امدادی نصابی کتب ان کے علاوہ ہیں۔ ان کتابوں کی رفتار فروخت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تصور سراسر غلط ہے کہ اردو اب صرف شعر و ادب کی زبان ہو کر رہ گئی ہے۔

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کونسل اور کشمیر کے حوالے سے کہا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ملک کے مختلف حصوں میں کمپیوٹر، اردو، عربی اور فارسی کے مراکز چلا رہی ہے۔ کشمیر میں بھی 160 سینٹر ہیں جن میں 12199 طلبا تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے قومی اردو کونسل کی اردو کی خدمات کے حوالے سے کہا کہ ملک کے مختلف حصوں میں اردو زبان کو فروغ دینے کے لیے قومی اردو کونسل رضا کار اور دیگر تنظیموں، اداروں کو سیمینار، ورکشاپ، تعلیمی کانفرنس، پروجیکٹس، مسودے کی

کی آمد اور شرکت اس بات کی غماز ہے۔ ان لوگوں میں زیادہ تعداد نوجوان طلبہ اور طالبات کی ہے۔ ہم بجا طور پر امید کرتے ہیں کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کتب میلہ کو تمام نہیں سمجھے گی بلکہ اردو کے حوالے سے مستقبل میں بھی اپنی سرگرمیاں جاری وساری رکھے گی اور اس فوری ضرورت کی جانب بھی کونسل انتظامیہ اپنی توجہ مرکوز کرے گی کہ سرینگر میں این سی پی یو ایل کا ایک ریجنل دفتر قائم کیا جائے۔

ڈاکٹر الطاف انجم
(شعبۂ فاصلاتی نظامِ تعلیم، کشمیر یونیورسٹی)

یہ کتاب میلہ اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے اہم ذریعہ ثابت ہو رہا ہے۔ میری ذاتی رائے کے مطابق تشنگانِ علم اور ادبی ذوق رکھنے والے حضرات و خواتین کے لیے یہ موقع نہایت ہی شاندار اور جاندار ہے سنہ 2004، سنہ 2014 اور 2019 کے یہ کتب میلے کشمیر میں اردو کے مستقبل کے حوالے سے اہم پڑاؤ ثابت ہو سکتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی آئندہ بھی اہلِ کشمیر کے ذوقِ ادب کے لیے ایسے سامان فراہم کرتی رہے گی۔

ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری
(محکمہ اعلیٰ تعلیم حکومت جموں و کشمیر)

این سی پی یو ایل اردو دنیا کا سب سے بڑا ادارہ ہے جو اردو کے فروغ کے تئیں مختلف سطحوں پر کام کر رہا ہے۔ اب جہاں تک اس کتاب میلے کا سوال ہے یہ ایک ایسا Event ہے جہاں ایک قاری اور کتابوں کے شوقین افراد کے لیے نئی نئی کتابیں دیکھنے اور خریدنے/ حاصل کر لینے کے لیے موقع فراہم کیا جاتا ہے۔ یہاں ہم جیسے بہت سارے شائقین کتب نے اپنی اپنی من پسند کتابوں کو خرید لیا ہے۔ ایک پچھڑی ہوئی اور نامساعد حالات کی شکار اس وادی میں اس میلے میں شرکت کرنے سے ہمیں راحت اور سکون میسر ہوا۔

اشاعت اور کتابوں کی بڑی تعداد میں خریداری کے لیے مالی تعاون فراہم کرتی ہے۔ قومی اردو کونسل چار اہم جرائد، سہ ماہی 'فکر و تحقیق'، ماہنامہ 'اردو دنیا'، ماہنامہ 'بچوں کی دنیا'، اور ماہنامہ 'خواتین دنیا' بھی شائع کرتی ہے۔

کتاب میلے کا پہلا دن

کشمیر یونیورسٹی میں 23ویں کل ہند اردو کتاب میلے کا افتتاح ڈاکٹر فاروق عبداللہ (سابق وزیر اعلیٰ، جموں وکشمیر)، پروفیسر طلعت احمد (وائس چانسلر، کشمیر یونیورسٹی) اور قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کیا۔

ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے اپنی تقریر میں ریاست جموں وکشمیر میں علاقائی زبانوں اور اردو کی موجودہ صورت حال پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ کشمیری عوام کو اپنی مادری زبان کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی تعلیم وتدریس پر بھی زور دینا چاہیے۔ اردو ہندوستانی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ کشمیر کی سرکاری زبان بھی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ غیر ملکی زبانوں سے ہمیں مرعوب ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ اردو میں تمام علوم وفنون کا خزانہ موجود ہے۔

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کتاب میلے کے افتتاحی اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس عہد میں اردو کتابوں کا تحفظ، فروغ اور اس کی اشاعت کی راہیں پہلے کے مقابلے میں زیادہ آسان ہوگئی ہیں۔ اب نئی ٹیکنالوجی نے کتابوں تک عام قارئین کی رسائی آسان کردی ہے۔ پھر بھی بہت سے علاقے اچھی اور معیاری کتابوں سے اب بھی محروم ہیں۔ اس لیے قومی اردو کونسل ہندوستان کے مختلف علاقوں میں کتاب میلے کا انعقاد کرتی رہی ہے۔ جنت ارضی کشمیر میں بھی کتاب میلے کے انعقاد کے پیچھے مقصد یہی ہے کہ عام قارئین تک کتابوں کی رسائی ہو اور ہماری کتابیں قارئین کے دروازے تک پہنچ سکیں۔ کشمیر چونکہ اردو کا مرکز ہے، علم و ادب کا گہوارہ ہے اور یہاں اردو کے چاہنے والوں کی اچھی خاصی تعداد ہے، اس لیے قومی اردو کونسل نے اس بار کشمیر میں کتاب میلے کے انعقاد کا فیصلہ کیا اور مجھے امید ہے کہ کشمیر کا یہ کتاب میلہ ایک نئی تاریخ رقم کرنے میں کامیاب ہوگا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ریاست جموں وکشمیر کی سرکاری زبان اردو ہے، یہاں اردو کے بڑے بڑے ادبا اور شعرا پیدا ہوئے ہیں اور انھوں نے پورے ہندوستان میں اردو زبان و ادب کو نئی جہتوں سے آشنا کیا ہے۔ یہاں کے کئی شعرا اور ادبا کل ہند سطح پر شناخت اور شہرت رکھتے ہیں نیز کشمیری زبان سے اردو زبان کا بہت ہی گہرا رشتہ ہے۔ اس لیے امید ہے کہ اس کتاب میلے سے

ایسا موقع یہاں ہمیں ہر سال ملنا چاہیے۔ اس سے عام لوگ بھی یہاں اردو کی طرف راغب ہوجائیں گے۔

محمد یوسف/ڈاکٹر رحمت اللہ میر

(صدر شعبہ اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج بارہمولہ
واسسٹنٹ پروفیسر ڈگری کالج، بارہمولہ)

پہلی بار قومی کتاب میلے کا انعقاد ایک خوش آئند قدم ہے۔ مجھے ذاتی طور پر بے حد خوشی ہورہی ہے۔ سرکاری زبان ہونے کے ناطے ایسے میلے بار بار منعقد کیے جائیں تو اچھا رہے گا۔

شیخ محمد منصور الحق

(بارہمولہ جموں وکشمیر)

قومی سطح کا شاندار کتاب میلہ سرینگر میں منعقد ہوا جس کی وجہ سے وادی کے بچوں میں کتابیں خریدنے کا شوق مزید بڑھ گیا۔ ان کے علم میں کافی اضافہ ہوجائے گا۔ اردو جموں کشمیر کی سرکاری زبان ہے جب کہ پورے ملک میں واحد ریاست جس کی سرکاری زبان اردو ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ آئندہ بھی اس طرح کا کتاب میلہ وادی میں منعقد ہونا چاہیے۔ ہم شکریہ ادا کرتے ہیں قومی اردو کونسل کی پوری ٹیم کا خاص کر قومی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کا جن کی کاوشوں سے یہ پروجیکٹ پایۂ تکمیل تک بخوبی واحسن طریقے سے اختتام کو پہنچا۔

ڈاکٹر محمد شفیع ڈار

(پلوامہ، کشمیر)

اردو زبان وادب کی ترقی کے حوالے سے ایسے میلے کا انعقاد کرنا خوش آئند قدم ہے۔ شائقین علم وادب آج اس میلے سے اپنی لائبریری میں کچھ نئی اور اہم کتابوں سے لائبریری کو مزین کرسکتے ہیں۔

کشمیری زبان اور اردو زبان کے درمیان رشتوں میں اور مضبوطی پیدا ہوگی۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے توقع ظاہر کی کہ کتاب میلے کے توسط سے ہمیں کشمیری زبان وثقافت سے بھی آشنائی ہوگی اور یہاں کے سماجی سروکار سے بھی ہم آگاہ ہوسکیں گے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ کشمیر ہمارے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے اور ہمیں کشمیری ادیبوں اور شاعروں سے اپنے رشتے کو اور بھی مضبوط کرنا ہے اور فروغ اردو کے منصوبوں میں کشمیری ادیبوں اور شاعروں کو خصوصی طور پر شامل کرنا ہے۔

کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے اظہار مسرت کرتے ہوئے کہا کہ کشمیر یونیورسٹی کونسل کے تعاون سے اردو زبان کی ترویج وترقی کے لیے ہر نوع کے پروگرام کرنے کے لیے تیار ہے۔ اردو زبان کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہے بالخصوص جموں وکشمیر میں، چونکہ اس کو یہاں سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ لہٰذا اس کے فروغ کے لیے نہ صرف اعلیٰ سطح پر بلکہ پرائمری سطح پر بھی زور دینے کی ضرورت ہے۔

اس افتتاحی تقریب سے کشمیر یونیورسٹی کے رجسٹرار اور علامہ اقبال لائبریری کے لائبریرین نے بھی خطاب کیا۔ اس تقریب میں اردو شائقین، شعبہ اردو کی صدر پروفیسر عارفہ بشریٰ، مشتاق حیدر کے علاوہ دیگر اساتذہ حضرات، وادی کشمیر کے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبا کثیر تعداد میں موجود تھے۔

دوسرا دن

کتاب میلے کے دوسرے دن علامہ اقبال لائبریری، یونیورسٹی آف کشمیر کے آڈیٹوریم میں وادی کشمیر میں چل رہے CABA-MDTP مراکز کے ذمے داروں کے ساتھ ایک روزہ مذاکرے کا انعقاد کیا گیا جس میں سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر کے وائس چانسلر پروفیسر معراج الدین میر بطور مہمان ذی وقار اور کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد مہمان خصوصی کے طور پر موجود تھے۔ اس تقریب میں وادی کشمیر میں چل رہے CABA.MDTP کے 89 مراکز کے سینٹر انچارج، طلبا اور اردو عربی اور فارسی سینٹر کے انچارج شریک تھے۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کشمیر خطے کی زمین اردو زبان کے لیے بڑی زرخیز ہے اس لیے قومی اردو کونسل اپنی تمام اسکیمیں زیادہ سے زیادہ یہاں کے این جی او، کالجوں اور مدرسوں کے توسط سے چلانا چاہتی ہے تاکہ یہاں کے عوام ان اسکیموں سے بھرپور فائدہ اٹھائیں۔ ڈاکٹر شیخ

پروفیسر محسن مقبول

(شعبۂ اردو گورنمنٹ ڈگری کالج خانصاحب)

اردو کی تعمیر وترقی اور فروغ میں ایسے کتاب میلوں کا انعقاد کرنا ایک خوش آئند قدم ہے۔ اردو کی ترویج میں کتابوں کے یہ میلے ریڑھ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس طرح کتاب میلے اردو کے ارتقا میں انقلابی کردار ادا کرتے ہیں۔

سمیہ صادق

(لیکچرر، جی ڈی سی خانصاحب)

We the faculty along with students visited the Urdu Mela. It was highly appreciated by the students. They were made aware about the Book Fair. We along with students visited the different stalls. It would have been more beneficial if stalls would be in also different subjects. Still students enjoyed and boughtbooks.

عبیداللہ امتیاز احمد

(اسسٹنٹ پروفیسر شوپیان کالج، کشمیر)

اس میں کوئی شک نہیں کہ قومی اردو کونسل ایک فعال ادارہ ہے اور اس کے اکثر کام تشفی بخش ہیں۔ اس ضمن میں یہ عرض کرنا ہے کہ اردو کے حوالے سے سافٹ ویئر تیار کرائیں جائیں اور ایم ایس ورڈ میں اردو لغت یعنی غلط الفاظ کی نشاندہی کا سافٹ ویئر تیار کرایا جائے۔

محمد اشرف خان

(خان کالونی، جہان پوراہ، سرینگر، کشمیر)

عرض کرنا چاہوں گا کہ آج یہاں کشمیر یونیورسٹی میں کتابوں کا میلہ دیکھ کر دل بہت ہی شاد ہوا۔ کافی عرصے کے بعد قومی کونسل نے یہاں یہ کتاب میلہ منعقد کروایا۔ شاید پچھلا میلہ یہاں لال چوک میں ایس پی کالج میں منعقد ہوا تھا۔ وہ بھی کافی کامیاب رہا۔ ماشاء اللہ آج بھی یہاں یونیورسٹی میں لوگوں میں کافی جوش وخروش دیکھنے کو ملا۔ آخر میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ایسا ہی دوسرا میلہ جلد از جلد منعقد کروا کر ہمیں علم سے مستفید کرائیں۔

عقیل احمد نے مزید کہا کہ کشمیر اور ہندوستان کی دیگر ریاستوں میں چل رہے تمام کمپیوٹر سینٹرس اور اردو، فارسی و عربی کے سینٹر محض اسٹڈی سینٹر نہیں ہیں بلکہ ہم اسے این سی پی یو ایل کے ذیلی مراکز کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور ان سینٹرس کے انچارج ہماری طاقت ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ ان سینٹرس سے ہزاروں کی تعداد میں طالب علم اردو، فارسی، عربی اور کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کرکے برسرروزگار ہو رہے ہیں اور ان سینٹرس میں ہزاروں کی تعداد میں اساتذہ درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر کے وائس چانسلر پروفیسر معراج الدین میر نے اپنی تقریر میں کہا کہ قومی اردو کونسل کو کمپیوٹر، اردو، عربی اور فارسی کے مزید سینٹر یہاں کھولنے چاہیے۔ یہی نہیں بلکہ اردو صحافت کو بھی یہاں مستحکم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ہماری یونیورسٹی طلبا کو تعاون دینے کے لیے تیار ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ کونسل کے جو مراکز یہاں چل رہے ہیں ان کی بہترین کارکردگی کے لیے ایک کمیٹی کی بھی تشکیل کی جانی چاہیے تاکہ اگر ان کی کارکردگی میں کسی نوع کی کمی آتی ہے تو انھیں دور کیا جاسکے۔ انھوں نے مزید کہا کہ کونسل کے سینٹرس کو یہاں کے کالجوں اور اسکولوں میں کھولنا طلبا کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوگا۔

کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے اپنی تقریر میں کہا کہ میرے نزدیک تمام طلبا ایک جیسے ہیں خواہ وہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہوں یا قومی کونسل کے مختلف مراکز میں۔ اردو کا جو حق ہے وہ اسے ملنا چاہیے اس کے لیے یہاں کی عوام کو آگے بڑھ کر کونسل کی مختلف اسکیموں سے استفادہ کرنا چاہیے۔ انھوں نے پروفیسر معراج الدین میر کی اس بات کی مزید تائید کرتے ہوئے کہا کہ کشمیر یونیورسٹی میں صحافت کا شعبہ بہ حسن و خوبی چل رہا ہے اور اردو صحافت کو مستحکم کرنے کے لیے صحافیوں کی تربیت وقتاً فوقتاً ضروری ہوتی ہے۔ لہٰذا کونسل کے تعاون سے ان صحافیوں کی تربیت کا پروگرام منعقد کیا جانا چاہیے۔

اس تقریب کی نظامت کے فرائض انتخاب احمد (ریسرچ آفیسر، قومی اردو کونسل) نے انجام دیے جب کہ اظہار تشکر اجمل سعید (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر، قومی اردو کونسل) نے کیا۔

تیسرا دن

کتب بینی موجودہ عہد کی ایک اہم ضرورت ہے۔ آج ہم مادیت پرستی اور صارفیت کے عہد میں ترقی کی نئی عبارت تو تحریر کر رہے ہیں لیکن ہم نے اپنی تاریخ اور اپنی تہذیب کو بھلا دیا ہے اور ہمیں پھر سے کتابوں سے دوستی کرنی ہوگی، ہم سب کو کتب بینی کی عادت اپنانی ہوگی تبھی ہم اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ باتیں سری نگر میں قومی اردو کونسل کے کل ہند اردو کتاب میلے کے تیسرے دن کشمیر بک پروموشن ٹرسٹ کے تعاون سے منعقدہ پروگرام کتابیں ہم نشیں میری میں ریڈیو کشمیر کی سابق ڈائرکٹر محترمہ رخسانہ جبیں نے کہیں۔ انھوں نے لڑکیوں کی تعلیم پر بھی توجہ مرکوز کرنے پر زور دیا اور کہا کہ آج لڑکیاں ہر میدان میں آگے جا رہی ہیں اور انھیں مزید مواقع دینے کی ضرورت ہے۔ اس پروگرام میں کشمیر کی مختلف درسگاہوں سے تشریف لائے اسکالروں نے کتب بینی کی ضرورت اور اہمیت پر مقالے پیش کیے۔ کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے ڈاکٹر شاداب ارشد، بک پروموشن ٹرسٹ کے چیئرمین رشید احمد، سلطان الحق

شہیدی، بشیر احمد شاکر وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا۔

دوپہر 2 بجے کتابوں پر گفتگو پروگرام کے تحت 'جہان حمد و نعت' پر مذاکرے کا اہتمام کیا گیا۔ مذاکرے میں پروفیسر مرغوب بانہالی نے اپنی تقریر میں 'جہان حمد و نعت' کو نئی نسلوں کی تربیت کا ذریعہ بتایا اور کہا کہ اس مجلّے کو ہر گھر میں ہونا چاہیے۔ مجلّے کے مدیر ڈاکٹر جوہر قدوسی نے اس کی اشاعت سے متعلق تفصیلات بیان کیں۔ ڈاکٹر نصرت جبیں نے بھی مجلّے کی اہمیت پر اظہار خیال کیا۔ اس پروگرام میں ڈاکٹر مجتبیٰ فاروق اور ڈاکٹر امتیاز آفرین نے بھی اظہار خیال کیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر امتیاز احمد نے کی۔

سہ پہر تین بجے سے کشمیر یونیورسٹی کے ماڈل اسکول کے ہونہار طالب علموں رولیس احمد، حارث منظور وغیرہ نے نعت خوانی پر مشتمل خوبصورت پروگرام پیش کیا۔ نعت خوانی کے پروگرام کے بعد شام غزل کا انعقاد کیا گیا جس میں وادی کے باصلاحیت فنکار اعجاز راز اور فاروق کھوکھر نے خوبصورت غزلیں اور صوفیانہ کلام پیش کیے اور سامعین کی ڈھیروں داد وصول کی۔ کتابوں کے شائقین کی بڑی تعداد میلے میں نظر آئی اور لوگ وادی میں اس اردو کتاب میلے کے انعقاد سے کافی خوش نظر آئے۔

چوتھا دن

کشمیری زبان کے ساتھ ساتھ یہاں کے طلبا کو اردو زبان و ادب کے مطالعے پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ یہ باتیں کشمیری زبان کے معروف شاعر و دانشور پروفیسر مرغوب بانہالی نے کشمیر یونیورسٹی میں منعقدہ کل ہند اردو کتاب میلے میں پروگرام 'معتقد ادبی شخصیات سے ملاقات' میں کہیں۔ انھوں نے اپنے حالات زندگی پر بھی گفتگو کی۔ اس پروگرام میں کشمیر کے معروف افسانہ نگار جناب نور شاہ نے اپنے افسانوی سفر پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ

اردو کتابوں کی فروخت کا قومی ریکارڈ

قومی اردو کونسل کے کتاب میلوں کا حساب کتاب

	ماہ	سال	مقام	مجموعی فروخت
1	نومبر	2000	لال قلعہ، دہلی	10 لاکھ روپے
2	نومبر	2001	لال قلعہ، دہلی	12 لاکھ روپے
3	جنوری	2003	انجمن اسلام، صابو صدیق گراؤنڈ ممبئی، مہاراشٹر	16 لاکھ روپے
4	ستمبر	2003	سری نگر، جموں کشمیر	22 لاکھ روپے
5	جنوری	2004	انجمن اسلام، صابو صدیق گراؤنڈ ممبئی، مہاراشٹر	23 لاکھ روپے
6	دسمبر	2004	حیدرآباد، آندھرا پردیش	24 لاکھ روپے
7	دسمبر	2005	لکھنؤ، اترپردیش	23 لاکھ روپے
8	دسمبر	2006	کولکاتہ، مغربی بنگال	16 لاکھ روپے
9	نومبر	2007	پٹنہ، بہار	14 لاکھ روپے
10	جنوری	2009	ممبئی، مہاراشٹر	26 لاکھ روپے
11	فروری۔مارچ	2010	حیدرآباد، آندھرا پردیش	52 لاکھ روپے
12	مارچ	2011	جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی گراؤنڈ دہلی	15 لاکھ روپے
13	جنوری	2012	انجمن اسلام، صابو صدیق گراؤنڈ ممبئی، مہاراشٹر	52.4 لاکھ روپے
14	نومبر	2012	لکھنؤ، اترپردیش	25 لاکھ روپے
15	ستمبر	2013	شیواجی، چھوٹا میدان، بنگلور، کرناٹک	31 لاکھ روپے
16	دسمبر۔جنوری	2013-14	مالیگاؤں	87 لاکھ روپے
17	دسمبر۔جنوری	2014-15	عام خاص میدان، اورنگ آباد	1,29,40,722 روپے
18	نومبر	2015	جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی گراؤنڈ دہلی	ایک کروڑ سے زائد
19	دسمبر	2015	قلی قطب شاہ اسٹیڈیم، حیدرآباد	50 لاکھ روپے
20	دسمبر	2016	رئیس ہائی اسکول، بھیونڈی، مہاراشٹر	ایک کروڑ 12 لاکھ روپے
21	دسمبر	2017	ایم اے پانگل اینگلو اردو ہائی اسکول	تقریباً 62 لاکھ روپے
22	اپریل	2018	روئی دھاسہ میدان، کشن گنج، بہار	تقریباً 20 لاکھ روپے
23	جون	2019	علامہ اقبال لائبریری گراؤنڈ، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر، جموں کشمیر	تقریباً 50 لاکھ روپے

انکشاف کیا کہ ان کی پہلی کہانی شاہدہ شاہین کے نام سے رسالہ بیسویں صدی میں چھپی تھی۔ اس سے قبل انھوں نے اپنے نام سے کہانیاں بھیجی تھیں تو وہ واپس کردی گئی تھیں۔ دو تین کہانیوں کی اشاعت کے بعد انھوں نے اپنے نام سے کہانیاں بھیجنی شروع کیں جو رسائل وجرائد میں تواتر سے شائع ہونے لگی۔ اس موقع پر وادی کے معروف اخبار کشمیر عظمیٰ کے مدیر اور معروف صحافی جناب جاوید آزر نے بھی اپنے تعلیمی وصحافتی سفر پر گفتگو کی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ نوجوان نسل کو کتابوں کے مطالعے کی عادت ڈالنی چاہیے اور ایک ڈکشنری ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیں۔ کتابوں کو اپنی زندگی کا ساتھی بنالیں۔

دوپہر دو بجے نظامت فاصلاتی تعلیم، جامعہ کشمیر نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اہتمام سے ''ہم ادب کیوں پڑھیں'' کے عنوان پر ایک مباحثہ کا اہتمام کیا۔ اس مباحثہ میں پروفیسر محمد زماں آزردہ، ڈاکٹر پرویز اعظمی اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور شامل ہوئے۔ ڈاکٹر محمد الطاف انجم نے پروگرام کی نظامت کی۔ اس ادبی مجلس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر محمد زماں آزردہ نے کہا کہ ادب انسان کو انسان بناتا ہے۔ ادب مختلف کیفیات اور محسوسات کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ ادب ہمیں روح کا سکون فراہم کرتا ہے۔ ڈاکٹر پرویز اعظمی نے موجودہ مشینی دور میں ہم ادب کیوں پڑھیں؟ کیا اس ترقی یافتہ دور میں ادب کا مطالعہ کسی صورت مفید ثابت ہوسکتا ہے؟ یہ اور اس طرح کے کئی دوسرے اہم نکات کے حوالے سے اپنے تاثرات پیش کیے۔ انہوں نے ادب پڑھنے اور ادب سے لگاؤ کو آج کے انسان کی ایک اہم ضرورت قرار دیا۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ''موجودہ دور میں ادب سے اخلاقی تربیت کیسے حاصل کرسکتے ہیں'' سے متعلق گفتگو کی۔ مقررین نے اس مجلس کو منعقد کرانے میں ڈاکٹر الطاف انجم اور ڈاکٹر عرفان عالم کی کوششوں کو سراہا۔ اس پروگرام کے بعد نظامت فاصلاتی تعلیم، جامعہ کشمیر نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے 'کتابیں ہم نشیں میری' کے تحت ڈاکٹر عرفان عالم کی تصنیف 'اقبال معروضی تجزیے اور سائنسی مباحث' پر ایک مذاکرے کا انعقاد کیا جس میں پروفیسر شاد اندرابی، پروفیسر عبدالرشید بٹ، ڈاکٹر محمد معروف شاہ اور ڈاکٹر عرفان عالم نے شرکت کی۔ ڈاکٹر مشتاق احمد نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

سرینگر میں منعقدہ قومی اردو کونسل کے کل ہند اردو کتاب میلے کے چوتھے دن سرینگر کے مضافات کے مختلف کالجوں اور اسکولوں کے طلبا واساتذہ نے بڑی تعداد میں شرکت کی اور کتابیں بھی خریدیں۔ سرینگر میں اس کتاب میلے کے انعقاد سے مقامی لوگ کافی خوش ہیں اور جوق در جوق میلے میں تشریف لارہے ہیں۔

شام میں ریاستی کلچرل اکادمی کی جانب سے محفل شعر ونغمہ کا انعقاد کیا گیا جس میں وادی کے معروف فنکار منیر احمد میر، زاہدہ ترنم اور محسن دلشاد نے اپنی مسحور کن آواز میں خوبصورت کلام پیش کیے اور سامعین سے داد وصول کی۔ کلچرل اکادمی کے ذمے دار جناب اشرف ٹاک نے استقبالیہ کلمات پیش کیے۔ اس پروگرام میں علامہ اقبال لائبریری کے سرپرست پروفیسر جی۔ ایم۔ پیرزادہ و یونیورسٹی کے دیگر ذمے داران بھی موجود تھے۔

پانچواں دن

سرینگر میں قومی اردو کونسل کے ذریعہ منعقدہ کل ہند اردو کتاب میلے کے پانچویں دن مختلف اسکولوں وکالجوں کے اساتذہ نے اپنے طلبہ کے ساتھ شرکت کی اور کتابیں خریدیں۔ میلے کے میدان میں ہی طلبہ کو اساتذہ ہجوم کی شکل

میں جمع کر کے کتابوں کی اہمیت بتاتے نظر آئے۔ وادی میں اس کتاب میلے کو لے کر کافی جوش وخروش پایا جا رہا ہے۔ گورنمنٹ کالج فار وومن بارہمولہ، آر پی اسکول گاندربل، ڈگری کالج بٹ پورہ سری نگر، گورنمنٹ ڈگری کالج فار بوائز سوپور، امر سنگھ کالج سری نگر کے طلبا و اساتذہ پر مشتمل وفد نے میلے میں شرکت کی اور بڑی تعداد میں کتابیں خریدیں۔

کتاب میلے میں شائقین کی دلچسپی کے مد نظر مختلف علمی، ادبی وثقافتی پروگراموں کا بھی انعقاد کیا جاتا ہے۔ صبح دس بجے اقبال ہائی اسکول صورہ کے زیر اہتمام اور قومی اردو کونسل کے اشتراک سے ایک انٹر اسکول تقریری مباحثہ بعنوان 'جموں وکشمیر کے نظام تعلیم میں اردو زبان کی اہمیت' منعقد کیا گیا۔ اس مباحثے میں جج کے فرائض جناب فاروق احمد میر، ڈاکٹر راشد عزیز، عبدالمجید نوشہری اور ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری نے انجام دیے۔ جناب جاوید ماٹجی نے سبھی مہمانان اور شرکا کا استقبال کیا۔ تقریباً بیس اسکولوں نے اس تقریری مقابلے میں شرکت کی جس میں اسلامیہ اسکول کی عربش منظور، خانیار اسکول کی ماریہ اور اقبال ہائی اسکول کی طیبورہ کو بالترتیب پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کا حقدار قرار دیا گیا۔

دوپہر دو بجے نظامت فاصلاتی تعلیم، جامعہ کشمیر کے زیر اہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئی دہلی کے اشتراک سے ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ اس مشاعرے میں ریاست اور بیرون ریاست کے نامور اور بین الاقوامی شہرت یافتہ شعرا و شاعرات نے شرکت کی۔ ان میں سلطان الحق شہیدی، رفیق راز، نذیر آزاد، راشد عزیز، رخسانہ جبین، شبنم عشائی، نکہت نظر، کوثر رسول، سلیم ساغر، اشرف عادل، پرویز مانوس، منیر انجم، عرفان عالم شامل ہیں۔ مشاعرے کی صدارت وادی کے معروف شاعر جناب سلطان الحق شہیدی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عرفان عالم نے انجام دیے۔ شرکا و سامعین نے ڈاکٹر الطاف انجم اور ڈاکٹر عرفان عالم کی کاوشوں کو سراہا اور انھیں اس مشاعرے کے انعقاد پر مبارکباد پیش کی۔ مشاعرے میں پروفیسر عارفہ بشریٰ، ڈاکٹر ریاض توحیدی، جناب اقبال لون اور دیگر معزز شخصیات موجود تھیں۔

چھٹا دن

جنت نظیر کشمیر کی خوبصورت سرزمین پر منعقدہ قومی اردو کونسل کے کل ہند اردو کتب میلے کا چھٹا دن مختلف ادبی وثقافتی سرگرمیوں کے نام رہا۔ جموں وکشمیر اردو کونسل کے زیر اہتمام اور قومی اردو کونسل کے اشتراک سے کشمیر یونیورسٹی کی علامہ اقبال لائبریری کے ابن خلدون آڈیٹوریم میں ایک سمینار بعنوان 'جموں وکشمیر میں اردو صحافت کا مستقبل' منعقد کیا گیا جس کی صدارت ماہر تعلیم غلام نبی وار نے کی۔ ایوان صدارت میں کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ صحافت کے استاد ناصر مرزا، نامور صحافی ریاض مسرور اور جموں کشمیر اردو کونسل کے نائب صدر پروفیسر حمید نسیم رفیع آبادی بھی موجود تھے۔ پروفیسر حمید نسیم رفیع آبادی نے استقبالیہ کلمات ادا کیے اور ریاست کی اردو صحافت کا مختصر جائزہ پیش کیا ساتھ ہی کونسل کی کارکردگی سے بھی حاضرین کو واقف کرایا۔ انھوں نے وادی کے اردو صحافیوں کی خدمات پر بھی روشنی ڈالی۔ سمینار میں شہباز ہاکباری، جاوید کرمانی، جناب ناصر مرزا اور بی بی سی اردو کے نمائندہ ریاض مسرور نے مقالے پیش کیے۔ ریاض مسرور نے اپنی صحافتی زندگی اور کشمیر کے صحافیوں کو درپیش مسائل کی نشاندہی کی ساتھ ہی اردو صحافت کو اپنا پیشہ بنانے والے طلبہ کو مفید مشوروں سے نوازا۔ انھوں نے صحافت کو روزگار سے جوڑنے پر بھی زور دیا۔ ماہر تعلیم جناب غلام نبی وار نے صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ اخبارات کو سیکولر اور انسان دوست ہونا چاہیے۔ انھوں نے قومی سطح پر رائج ہونے والی نئی

تعلیمی پالیسی پر بھی اظہار خیال کیا۔ اس سمینار میں جموں و کشمیر اردو کونسل کی جانب سے ریاست میں معیاری صحافت کے لیے 'وادی کی آواز'، 'کشمیر نیوز سروس' اور 'ای ٹی وی نیوز 18 اردو' کو اعزازات دیے گئے۔

یونیورسٹی آف کشمیر کے خوبصورت میدان میں منعقدہ قومی اردو کونسل کے تیئیسویں اردو کتاب میلے میں اردو کی ادبی و نصابی کتابوں کی فروخت زیادہ ہو رہی ہے۔ میلے میں شرکت کر رہے کئی پبلشروں اور کتب فروشوں کا کہنا ہے کہ یہاں بی اے، ایم اے اور ریسرچ کے طالب علم بڑی تعداد میں تشریف لا رہے ہیں اور اپنی پسند کی کتابیں خرید رہے ہیں۔ شاعری میں لوگ میر، غالب، اقبال، پروین شاکر اور جون ایلیا کی کتابیں زیادہ پسند کر رہے ہیں۔ کچھ ناشرین کی یہ بھی شکایت ہے کہ عام شخص کی دلچسپی کی کتابیں یہاں کم فروخت ہو رہی ہیں۔ کتابوں پر طلبہ کے لیے خصوصی ڈسکاؤنٹ بھی دیا جا رہا ہے جس سے ریاست کے طلبا کافی فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ میلے میں قومی اردو کونسل کی جانب سے پیپر ماشی اور کیلی گرافی کا بھی اسٹال لگایا گیا ہے جو لوگوں کی توجہ کا خصوصی مرکز بنا ہوا ہے۔

دن میں ڈھائی بجے قومی اردو کونسل کے اشتراک سے جموں اینڈ کشمیر فکشن رائٹرس گلڈ کی 169 ویں نشست کا انعقاد کیا گیا۔ اس محفل افسانہ کی صدارت معروف افسانہ نگار جناب نور شاہ نے انجام دی جبکہ جناب خالد حسین نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ گلڈ کے صدر ڈاکٹر نذیر مشتاق نے سبھی مہمانان اور سامعین کا استقبال کیا۔ نشست میں رافعہ ولی، ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی، دیپک کنول اور وحشی سعید نے افسانے پیش کیے۔ محفل افسانہ کی نظامت زبیر قریشی نے انجام دی۔ سہ پہر چار بجے کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے زیر اہتمام شام غزل بعنوان 'غزل اُس نے چھیڑی' کا انعقاد کیا گیا جس میں وادی کے مشہور فنکاروں نے اپنی خوبصورت آواز کا جادو بکھیرا۔ شام غزل میں یونیورسٹی اور شہر کی متعدد معزز شخصیات موجود تھیں۔

ساتواں دن

قومی اردو کونسل کے ذریعہ کشمیر یونیورسٹی میں لگائے گئے کل ہند اردو کتب میلے میں ساتویں دن بھی طلبہ و اساتذہ کی کافی بھیڑ نظر آئی۔ بڑی تعداد میں لوگ کتابیں خریدتے نظر آئے۔ اس کتاب میلے میں کتابوں پر کافی ڈسکاؤنٹ بھی دیا جا رہا ہے۔ قومی اردو کونسل کی 100 سے زیادہ کتابوں پر 75 فیصد تک رعایت دی جا رہی ہے۔ ریاست جموں و کشمیر کے اردو طلبا اور عام اردو قاری اس میلے سے کافی استفادہ کر رہے ہیں۔ قومی اردو کونسل کے اسٹال پر وضاحتی کتابیات، دیوان تاباں، تمل ناڈو میں اردو، رام پرشاد بسمل کی آپ بیتی، چولا راجگان، قواعد کیٹلاگ سازی، زراعتی انکشافات، فن طباعت، اتر پردیش کے لوک گیت، کلیات چودھری محمد علی ردولوی، گلشن بے خار، خالدہ ادیب خانم اور ہندوستان، ہمارا قدیم سماج، آزادی کے بعد سے سائنس، ٹکنالوجی اور ترقی اور تاریخ تعلیم ہند جیسی مفید اور کارآمد کتابوں پر 75 فیصد تک رعایت دی جا رہی ہے۔ اچھی کتابیں ہر گھر میں ہونی چاہیے اس لیے کونسل کے ذمے داران نے وادی کی اردو آبادی سے درخواست کی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ کتابیں خریدیں اور اپنے بچوں اور احباب کو مطالعے کی جانب راغب کریں۔ طالب علموں اور اساتذہ کے لیے کتابوں پر خصوصی ڈسکاؤنٹ بھی دیا جا رہا ہے۔

سرینگر اور مضافات کے مختلف اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ اور طلبہ کتاب میلے میں آئے اور کتابیں خریدیں جن میں ہمدرد گرامر اسکول، ترال، گورنمنٹ گرلز

ہائر سکنڈری اسکول، نوا کدل، سرینگر، گورنمنٹ ڈگری کالج، شوپیان، گورنمنٹ ڈگری کالج خان صاحب، گورنمنٹ امر سنگھ کالج، سری نگر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ میلے میں آنے والے طلبہ کو قومی اردو کونسل کے ذمے داران نے کونسل کی مختلف سرگرمیوں سے بھی واقف کرایا۔

ثقافتی تقریبات کے تحت اقبال ہائی اسکول صورہ کے زیر اہتمام اور قومی اردو کونسل کے اشتراک سے کشمیر یونیورسٹی کی علامہ اقبال لائبریری کے ابن خلدون آڈیٹوریم میں یک روزہ بین اسکولی مقابلہ نظم گوئی منعقد کیا گیا۔ اس پروگرام کی نظامت میر شبیر نے کی جبکہ مہمانان کا استقبال جناب جاوید ماٹجی نے کیا۔ انھوں نے پروگرام کی غرض و غایت بیان کی اور اقبال ہائی اسکول کا تعارف بھی پیش کیا۔ انھوں نے بتایا کہ اقبال ہائی اسکول گذشتہ تیس برسوں سے تعلیمی میدان میں اپنی خدمات انجام دے رہا ہے اور یہاں سے فارغ طلبہ آج کئی بڑے اور اہم عہدوں پر بھی کام کر رہے ہیں۔ اس اسکول میں زیادہ تر غریب بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور بہت سارے بچوں کو مفت تعلیم بھی دی جارہی ہے۔ اس مقابلہ نظم گوئی میں جناب منیر میر، جناب شاہنواز، محترمہ روحی سلطانہ اور جناب راجہ بلال نے جج کے فرائض انجام دیے جب کہ صدارت جناب غلام نبی وارنے کی۔ پروفیسر ناصر مرزا نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی اور معروف شاعر جناب سلطان الحق شہیدی بطور چیف آبزرور موجود تھے۔ اس مقابلہ نظم گوئی میں مومویت اسکول سعدی کدل کی منہاج جان، اقبال ہائی اسکول کی آنیکا اور گورنمنٹ گرلز ہائر سکنڈری اسکول ڈڈی بل کی درخشاں کو بالترتیب اول، دوم اور سوم انعامات کا حقدار ٹھہرایا گیا۔

سہ پہر تین بجے سے انسٹی ٹیوٹ آف میوزک اینڈ فائن آرٹس، یونیورسٹی آف کشمیر کی جانب سے ابن خلدون آڈیٹوریم میں کلاسیکل نغمہ اور قوالی کا رنگا رنگ پروگرام منعقد کیا گیا جس میں طلبہ کی بڑی تعداد موجود تھی۔ اس پروگرام کے بعد محفل نعت خوانی کا اہتمام کیا گیا جس میں 18 نعت خواں نے شرکت کی۔

آٹھواں دن

کشمیر کی عوام کتاب دوست ہے اور یہاں کے لوگ اردو زبان و ادب سے محبت کرتے ہیں۔ کتابوں سے ان کی محبت اور دوستی دیکھ کر ہمیں بے حد خوشی ہو رہی ہے۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے یونیورسٹی آف کشمیر کی علامہ اقبال لائبریری کے سبزہ زار پر جاری کل ہند اردو کتاب میلے کے تناظر میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ قومی اردو کونسل اپنے کمپیوٹر مراکز اور پیپر ماشی کے مراکز کے قیام میں کشمیر کو ترجیح دیتی ہے کیوں کہ یہاں ہمیں زبان و ادب اور ٹکنالوجی کے میدان میں مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم مستقبل میں مزید مراکز کے قیام کی کوشش کریں گے۔ میلے میں کتابوں کی فروخت اور یہاں کے لوگوں کا خلوص اور کتابوں کے تئیں دلچسپی دیکھ کر بھی ناشرین کتب اور تاجرین کتب خوش ہیں اور وہ وادی میں دوبارہ بھی آنا چاہتے ہیں۔ یہاں کی اردو آبادی بھی میلے کے اہتمام سے خوش ہے اور کئی افراد نے اس طرح کے میلوں کے دوبارہ انعقاد پر زور دیا ہے۔

سرینگر اور مضافات کے مختلف اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ اور طلبہ کتاب میلے میں آئے اور کتابیں خریدیں۔ گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین، بارہمولہ، گورنمنٹ ڈگری کالج، چرار شریف، گورنمنٹ ڈگری کالج، پانپور، گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین، اننت ناگ، گورنمنٹ ڈگری کالج، کنگن، گورنمنٹ ڈگری کالج، پٹن، گورنمنٹ گرلز ہائر سکنڈری اسکول، رعناواری، گورنمنٹ گرلز ہائر سکنڈری اسکول، مجہ گنڈ وغیرہ کے طلبہ و اساتذہ

نے آج میلے میں شرکت کی۔ کونسل کے ڈائرکٹر نے بھی طلبہ کا استقبال کیا اور قومی اردو کونسل کی مختلف سرگرمیوں سے واقف کرایا۔

میلے کے ساتھ ثقافتی تقریبات بھی جاری رہیں۔ نظامت فاصلاتی تعلیم جامعہ کشمیر کے زیر اہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے ابن خلدون آڈیٹوریم، علامہ اقبال لائبریری میں 'کلاسیکی شعری اصناف کی عصری معنویت' کے عنوان سے ایک ادبی سمپوزیم کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس سمپوزیم میں نظامت فاصلاتی تعلیم، جامعہ کشمیر سے وابستہ ایم۔اے۔ اردو کے طلبہ کے ساتھ ساتھ ریسرچ اسکالروں نے بھی مقالات پیش کیے۔ان میں مسرت حمید، عمر نبی، شبنم جان، اسماء بدر، توصیف احمد ڈار، عابد نور الامین، عمر نبی وانی، شازیہ جان، نرگس رسول شامل ہیں۔ نظامت قیصر الحق نے کی۔ ڈاکٹر الطاف انجم نے مہمانوں کا استقبال کیا اور ساتھ ہی کلاسیکی اصناف سے متعلق اپنے خیالات پیش کیے۔ اس سمپوزیم میں قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد، معروف ادیب و دانشور پروفیسر محمد زماں آزردہ، ڈاکٹر محمد یوسف، ڈاکٹر محمد الطاف نقشبندی، ڈاکٹر محمد امتیاز احمد اور ڈاکٹر عبدالحی ایوان صدارت میں موجود تھے۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے سمپوزیم طلبہ کی تربیت کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ انھوں نے اس طرز کے پروگراموں کے انعقاد پر زور دیا۔ مقررین نے ڈاکٹر الطاف انجم اور ڈاکٹر عرفان عالم کو اس طرح کے پروگرام کے انعقاد پر مبارکباد دی۔

سہ پہر نظامت فاصلاتی تعلیم، کشمیر یونیورسٹی کے زیر اہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے ایک ادبی مجلس 'بزمِ شعر' کا انعقاد کیا گیا جس میں ریاست کے مختلف علاقوں سے نو آموز شعرا حضرات نے شرکت کی اور اپنے کلام سے نوازا۔ ان میں عرفان عالم، عابد نورالامین، اسرار جاوید، صابر شبیر بڈگامی، بلال احمد، محمد یونس، ظہور تنویر، ذاکر عنایت، معراج الدین، راشف اعظمی، عنایت فہیم، ظہیر تنویر وغیرہ شامل ہیں۔ اس مجلس میں جناب عاصم اسدی بطور مہمانِ خصوصی شامل رہے جبکہ جناب خیال لداخی نے بزمِ شعر کی صدارت کی۔ جامعہ کشمیر کے مختلف شعبہ جات کے ساتھ ساتھ کئی کالجوں کے طلبا و طالبات بھی اس مجلس میں موجود تھے۔

نواں دن

9 روزہ کل ہند اردو کتاب میلے میں محبان اردو اور شائقین اردو کے ہجوم کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ کشمیر میں اردو کا مستقبل روشن اور تابناک ہے۔ اس کتاب میلے میں کشمیر کے بیشتر کالجوں اور اسکولوں کے طالب علموں اور ان کے اساتذہ کی موجودگی کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو کے اساتذہ حضرات اور طالب علم اردو کی ترقی و ترویج کے تئیں بے حد سنجیدہ اور بیدار ہیں۔ یہاں کے اردو اساتذہ کی رہنمائی میں طالب علموں میں کتابوں کے تئیں بیش بہا ذوق وشوق پیدا ہوگا۔ یہ باتیں کشمیر یونیورسٹی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے گذشتہ 9 دنوں سے لگائے گئے کل ہند اردو کتاب میلے کی اختتامی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ کشمیر کے کل ہند اردو کتاب میلے میں اہل کشمیر نے جس قدر اچھا ریسپانس دیا ہے ہم اس کے لیے آپ سب کے شکر گذار ہیں۔ آپ کو یہ بتاتے ہوئے ہمیں خوشی ہورہی ہے کہ یہاں آئے ہوئے تقریباً سبھی پبلشرز حضرات خوش ہیں اور وہ دوبارہ بھی یہاں آنا چاہتے ہیں۔ یہاں منعقدہ 23 ویں کل

ہند اردو کتاب میلے میں تقریباً 50 لاکھ روپے کی کتابیں فروخت ہوئی ہیں جس کے لیے ہم اہل کشمیر کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ کشمیر میں اردو کا مستقبل روشن ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ اس میلے کو آپ سب نے پسند کیا اور یقیناً اس کے اثرات دیرپا ثابت ہوں گے اور یہاں اردو زبان و ادب کی سمت میں مزید پیش رفت کی جائے گی۔ ہم جلدی ہی کشمیر میں اردو صحافیوں کی تربیت سازی کے ورک شاپ کا بھی اہتمام کریں گے۔ انھوں نے میلے میں تعاون کے لیے کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر، لائبریرین اور رجسٹرار و دیگر اسٹاف کا شکریہ بھی ادا کیا۔

اختتامی تقریب میں صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے کہا کہ کتاب میلہ فروغ اردو کی سمت میں ایک اچھا قدم ہے۔ کتاب میلے کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے قومی اردو کونسل کو کشمیر یونیورسٹی کے دوسرے کیمپس میں بھی اس طرح کے پروگرام کا انعقاد کرنا چاہیے تاکہ دور دراز کے اردو شائقین بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔ تقریب کے مہمان خصوصی معروف دانشور اور ادیب پروفیسر زماں آزردہ نے کہا کہ قومی اردو کونسل نے میلے کے ذریعہ پورے کشمیر میں اردو کا ماحول بنا دیا ہے۔ کشمیر یونیورسٹی کے رجسٹرار ڈاکٹر نثار احمد میر نے بطور مہمان ذی وقار شرکت کرتے ہوئے کہا کہ ہم مستقبل میں بھی قومی اردو کونسل کے پروگراموں میں تعاون دینے کو تیار ہیں۔ انھوں نے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر سے کشمیری زبان کی نایاب کتابوں کا ترجمہ اردو میں اور اردو کی نایاب کتابوں کا ترجمہ کشمیری زبان میں کرانے کی تجویز پیش کی جس پر ڈائرکٹر نے غور کرنے کا وعدہ کیا۔

میلے کے کوآرڈینیٹر اور کشمیر یونیورسٹی کی علامہ اقبال لائبریری کے لائبریرین پروفیسر جی این پیرزادہ نے کلمات تشکر ادا کیے اور میلے کے کامیاب انعقاد کے لیے یونیورسٹی اسٹاف، قومی اردو کونسل کے اسٹاف اور دیگر تمام حاضرین اور مختلف تنظیموں، اداروں سے وابستہ افراد کا بھی شکریہ ادا کیا۔

تقریب میں قومی اردو کونسل کی جانب سے پبلشروں کو اعزازات بھی دیے گئے۔ کتابوں کے بہترین کلیکشن کے لیے کتاب دار ممبئی کو، سب سے بہتر فروخت کے لیے الحسنات بکس پرائیویٹ لمٹیڈ کو جب کہ بہترین ڈسپلے کے لیے نیشنل بک ٹرسٹ کو اعزازات سے نوازا گیا۔ ان کے علاوہ میلے میں مختلف ثقافتی پروگراموں اور مقابلوں میں پہلی دوسری و تیسری پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کو بھی انعامات تقسیم کیے گئے۔ اختتامی تقریب میں نظامت کے فرائض قومی اردو کونسل کے آفس سپرنٹنڈنٹ جناب منیر انجم نے بحسن وخوبی انجام دیے۔

کتاب میلے کی کامیابی میں علامہ اقبال لائبریری کے اسٹاف، المیزان پبلی کیشنز، جموں کشمیر اردو کونسل، فکشن رائٹرز گلڈ، کلچرل اکادمی، بگ ایف ایم 92.7، شعبۂ اردو نظامت فاصلاتی تعلیم، اقبال ہائی اسکول صورہ وغیرہ کے اساتذہ، معاونین اور ذمہ داران کا خصوصی تعاون شامل رہا۔ کتاب میلے کی خبریں جموں کشمیر کے تقریباً سبھی اردو، انگریزی، اخبارات میں تواتر سے شائع ہوتی رہیں جس سے کشمیر کی اردو برادری تک کی جانکاری پہنچی۔ جاوید ماجی نے ریڈیو کشمیر کے لیے کتاب میلے پر اداریہ بھی تحریر کیا اور یہ اداریہ 24 جون کو نشر کیا گیا۔ معروف قلمکار و سماجی کارکن اور جموں کشمیر اردو کونسل کے سکریٹری، ای ٹی وی اردو اور دیگر ریڈیو ٹی وی چینلوں نے بھی کتاب میلے سے متعلق خبریں اور پروگرام نشر کیے۔ کشمیر کا کتاب میلہ ان معنوں میں بھی اہمیت کا حامل رہا کہ وادی کے باہر دہلی، کانپور، پٹنہ، کولکاتا، رانچی، ممبئی، حیدرآباد، لکھنؤ وغیرہ کے اخبارات نے بھی میلے کی خبریں شائع کیں۔ ہم ان سب کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

■

Abdul Hai
ahaijnu@gmail.com

خواجہ محمد اکرام الدین

غیر ملکی جامعات میں اردو تدریس

صورت حال اور مستقبل کے امکانات

اردو موجودہ دنیا میں تیزی سے مقبول ہونے والی زبانوں میں سے ایک ہے 2018 کا اتھنالوگ ایڈیشن (Edition of Ethnologue Published by SIL 2018) جسے ایس آئی ایل یعنی سمر انسٹی ٹیوٹ آف لنگویسٹک نے شائع کیا، کے مطابق دنیا میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبانوں میں اردو گیارویں نمبر پر ہے۔ 2015 کے سروے کے مطابق انگلینڈ میں بولی جانے والی زبانوں میں اردو چوتھی پوزیشن پر ہے۔ ہندستان کے سینسس 2011 کے مطابق ہندستان میں سب سے زیادہ بولی جانی والی زبانوں میں اردو ساتویں نمبر پر ہے۔ ایس آئی ایل کی تازہ ترین رپورٹ کے لحاظ سے خلیجی ممالک کے علاوہ اردو امریکہ، انگلینڈ اور فرانس میں بہت تیزی سے مقبول ہونے والی زبان ہے۔ ایس آئی ایل نے یوروپی ممالک میں صرف فرانس کا ذکر کیا ہے لیکن فرانس کے علاوہ جرمنی بھی بڑا ملک ہے جہاں اردو کے شعرا و ادبا کی بڑی تعداد ہے اور اردو بولنے والوں کی ایک بڑی آبادی رہتی ہے۔ گوگل کی اگر بات کریں تو اس میں دو طرح کی سروے رپورٹ ہے ایک کے مطابق یہ دنیا کی چوتھی بڑی زبان ہے، جب گوگل یہ کہتا ہے تو اس میں بولی جانے والی زبان کے اعتبار سے بات کی گئی ہے جس میں اردو اور ہندی دونوں کو شامل کیا گیا ہے کیونکہ بول چال کی زبان میں یہ دونوں زبانیں بہت قریب ہیں۔ لیکن گوگل جب صرف اردو کی بات کرتا ہے تو کبھی اسے ساتویں نمبر پر کبھی اکیسویں نمبر پر رکھتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اردو، عربی کے بعد دنیا کی دوسری بڑی زبان ہے جس نے تہذیبی و ثقافتی اعتبار سے دنیا کے طول و عرض کا سفر کیا ہے۔ یعنی تہذیبی ہجرت کے لحاظ سے اردو دنیا کی دوسری بڑی زبان ہے۔ یہ اردو والوں کے لیے باعث فخر ہے۔ لیکن اس فخر و مباہات کا ذکر اب تک ہم اس تزک و احتشام سے نہیں کر پائے ہیں جتنا کہ ہونا چاہیے تھا۔ شاید اس معاملے میں خود ہم اپنی دور افتادہ تہذیبی وراثتوں سے یا تو واقف نہیں ہیں یا مزید تلاش و جستجو کی کوشش نہیں کرتے۔ ورنہ اردو کے تلاطم خیز سمندر، اس کی موجوں کی طغیانی اور اس کی تہوں میں ابھی بھی بہت سے دُرِ نایاب موجود ہیں۔

بہر کیف ان اعداد و شمار کے بعد ایک اور پہلو کی جانب اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک افریقی جزیرہ جسے ہم چھوٹا ہندستان بھی کہتے ہیں اس کا نام ماریشس ہے۔ یہاں کی کل آبادی کا تقریباً 33 فیصد حصہ مسلمان ہے۔ ماریشس میں زبان کی تدریس کا یہ نظام ہے کہ مذہب اور کلچر کے اعتبار سے انھیں ان کی تعلیم ان کی زبان میں دی جاتی ہے جیسے مسلمان کے لیے اردو، ہندو کے لیے ہندی، فرانسیسی کے لیے فرانسیسی کی تعلیم لازمی کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے دیار غیر میں ماریشس ایسی اردو کی بستی ہے جہاں ابتدائی سطح سے اعلیٰ تعلیم کی سطح تک اردو پڑھانے کا سرکاری طور پر نظم ہے۔ اس کے علاوہ عرب ممالک میں صرف مصر ہی ایک ایسی اردو کی بستی ہے جہاں اردو کی تعلیم کئی جامعات میں ہوتی ہے۔

ان اعداد و شمار کے بعد ذیل میں ان ممالک کی تفصیلات ملاحظہ کریں۔ سب سے پہلے مشرق وسطیٰ کی بات کرتے ہیں۔

مشرق وسطیٰ میں تاشقند اردو۔ ہندی کا عظیم مرکز

مشرق وسطیٰ میں اردو کی تعلیم و تدریس کے لیے تاشقند ایک اہم مرکز ہے جہاں ابھی حال ہی میں اردو تعلیم کا پچھتر واں جشن منایا ہے۔ گیا یہاں بی۔ اے کی سطح سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی سطح تک کی تعلیم کا نظم ہے۔ تاشقند ازبکستان کی راجدھانی ہے اس لیے اس شہر کو کئی اعتبار سے اہمیت اور شہرت حاصل ہے لیکن برصغیر کے لیے اس شہر کی ایک بڑی شناخت اردو کی تدریس سے بھی ہے کیونکہ تاشقند اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز کے تحت 1947 سے اس ادارے میں اردو۔ ہندی کی تعلیم دی جارہی ہے اور یہ سلسلہ آج بھی برقرار ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اردو کے طالب علموں کو ہندی اور ہندی کے طالب علموں کو اردو ایک مضمون کی حیثیت سے لازمی طور پر پڑھنا ہوتا ہے اس طرح اس ادارے سے وابستہ طلبہ و طالبات کے ساتھ ساتھ اکثر اساتذہ بھی دونوں زبانوں سے واقف ہوتے ہیں۔ اردو ہندستان کی قدیم زبان ہے جو ایک عرصے تک سرکاری زبان بھی رہی ہے اس کے بولنے والوں کی تعداد برصغیر میں تقریباً تیس کروڑ سے زیادہ ہے۔ اردو زبان میں ازبکستان بالخصوص مشرق وسطیٰ کے تہذیبی اور تمدنی عناصر کو نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ اردو زبان میں کثرت سے مشرق وسطیٰ کی زبانوں اور علاقائی بولیوں کے الفاظ آج بھی موجود ہیں۔

اردو اور ہندی زبان کی تدریس اور تعلیم کے لیے سب سے پہلے یہ ادارہ قائم ہوا لیکن پہلے اس ادارے کا نام 'ترکستان انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز' تھا جہاں اردو- ہندی کے علاوہ کئی اور مشرقی زبانیں پڑھائی جانی شروع ہوئیں۔ بعد میں 1991 میں اس ادارے کا نام تبدیل ہو کر 'تاشقند اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز' رکھا گیا۔ اس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ مشرق وسطیٰ تہذیبی، لسانی اور اقتصادی اعتبار سے جن ممالک سے نزدیک رہا ہے ان کی تہذیب و تمدن کو زبان کے ذریعے سیکھا اور سکھایا جائے۔ چنانچہ اس ادارے نے محنت و مشقت سے ایشیائی ممالک میں اپنی ایک شناخت قائم کی اور بہت تیزی سے یہ ادارہ ایشیا اور یوروپ کے ممالک میں پہچانا جانے لگا۔ مجموعی طور پر اردو۔ ہندی زبان کی

تعلیم و تدریس کی وجہ سے ہمارے لیے یہ ادارہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔

اس ادارے سے اردو اور ہندی کی کئی نامی گرامی شخصیات وابستہ رہی ہیں۔ ابھی پروفیسر الفت محب صاحبہ اس شعبے کی صدر ہیں۔ ان کے علاوہ اساتذہ میں ڈاکٹر سراج الدین نورمتوف، ڈاکٹر محیا عبدالرحمانوا، ڈاکٹر لولا مکتوب، موجودہ صادیقوا، سلیمانو امعمورا، شارا حمیدوالخلصہ، کمالہ ارگا شیوا اور محترمہ تمارا خوجائیوا صاحبہ بہت ہی اخلاص اور محنت و مشقت سے درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ ان اساتذہ میں بہت سے ایسے ہیں جن کے مضامین ہند و پاک کے رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ زیادہ تر اساتذہ پی ایچ ڈی کے علاوہ ڈی لٹ کی بھی ڈگری حاصل کر چکے ہیں۔ ازبکستان میں تدریس کا ایک ایسا انوکھا نظام بھی ہے جسے دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی ہوئی۔ یہاں اساتذہ سبکدوش نہیں ہوتے۔ سبکدوشی کے بعد بھی یہ جب تک چاہیں تدریس سے وابستہ رہ سکتے ہیں۔ فی الوقت محترمہ تمارا صاحبہ ہیں جو تقریباً اسی سال کی نفیس خاتون ہیں وہ اب بھی بڑی سنجیدگی سے درس و تدریس سے وابستہ ہیں، عمر کے اس حصے میں بھی جس طرح ان کو چاق و چوبند دیکھا وہ قابل رشک ہے۔ اسی طرح محترمہ حمیدوالخلصہ بھی سبکدوشی کے بعد وقت کی پابندی کے ساتھ انسٹی ٹیوٹ آتی ہیں اور کلاسیں لیتی ہیں۔ دوسری قابل ستائش بات یہ ہے کہ تمام اساتذہ بڑے خلوص اور دوستانہ ماحول میں ایک ساتھ رہتے ہیں، کسی کے چہرے پر کسی کے لیے کوئی شکن نہیں دیکھا، سب ایک دوست کی طرح ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور ساتھ مل کر انسٹی ٹیوٹ کی ترقی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ طلبہ وطالبات کی بھی بڑی تعداد ہے۔

اس ادارے سے جہاں تک اردو کی تعلیم کے امکانات کی بات کریں تو ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ہماری جانب سے اور اس ادارے کی جانب سے کوتاہیاں ہوئی ہیں۔ آج کے دور میں بین الاقوامی سطح پر جب تک دیگر تعلیمی اداروں سے معاہدے نہ ہوں اس وقت تک زبان کی تعلیم کے فروغ کے امکانات محدود رہتے ہیں۔ اب تک ہندستان کی چند جامعات سے ہی اس کے معاہدے ہیں جن میں جے این یو، ڈی یو اور حال ہی میں اردو یونیورسٹی حیدر آباد سے اس کا معاہدہ ہوا ہے۔ حالانکہ حکومت ہند کی جانب سے اس ادارے کے طلبہ وطالبات کو بڑی تعداد میں وظیفے دیے جاتے ہیں جن میں اردو کے طلبہ وطالبات بھی شامل ہیں۔ ایک اہم بات جس کی جانب توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہاں پی ایچ ڈی اور ایم کے مقالے ازبکی زبان میں لکھے جاتے ہیں۔ ازبکی زبان میں لکھے جانے کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ ازبک جاننے والے اردو ادب سے واقف ہوتے رہتے ہیں لیکن نقصان یہ ہے کہ اردو کے طلبہ کی زباندانی کی صلاحیت کم رہتی ہے۔

مصر اردو کی تابناک سرزمین

اردو کی نئی بستیوں کا جب بھی ذکر آتا ہے اکثر ہم یوروپ و امریکہ سے اس کی ابتدا کرتے ہیں اور اسی پر بات ختم بھی ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اردو کی دیگر بستیوں سے پہلے یوروپ و امریکہ میں اردو پہنچی اور یہاں کے

ادیب وشاعر یقیناً قابل مبارکباد ہیں جو اردو زبان و تہذیب کو زندہ و تابندہ رکھے ہوئے ہیں لیکن اس کے علاوہ بھی اردو کی کئی اہم بستیاں ہیں جن تک ہماری رسائی کم ہوئی ہے اور ان کو اس طرح نہیں سراہا گیا جتنا کہ وہ مستحق ہیں۔ ان بستیوں میں مصر سرفہرست ہے جہاں اردو کی تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف اور اردو سے عربی میں ترجمے کا کام بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔ ہم اردو والوں نے یہاں کے ادیبوں اور اساتذہ کی خدمات کو نظر انداز کیا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ دانستہ ایسا ہوا ہے شاید روابط کی کمی کے سبب اردو دنیا میں بالخصوص مصر کو متعارف کرانے میں ہم اردو والوں سے کوتاہی ضرور ہوئی ہے۔ مصر اگرچہ افریقہ براعظم کا حصہ ہے لیکن یہاں کی تہذیب پورے طور پر عربی تہذیب ہے، بلکہ اس کی تہذیب خود اپنے آپ میں مایہ ناز ہے۔ عربی زبان کا ملک ہونے کے باوصف اس ملک نے دیگر مشرقی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کی آبیاری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کالج سے یونیورسٹی کی سطح تک اردو کی تدریس اور ریسرچ کے حوالے سے مصر کے اہل اردو کا بڑا کام ہے۔ انھوں نے اردو زبان کی تعلیم کے ذریعے برصغیر سے تہذیبی روابط کو بحال کرنے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

مصر میں اردو کے طلبہ واساتذہ کی تعداد کو دیکھیں یا اردو تصنیف و تالیف کو دیکھیں تو خوشی ہوتی ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں اساتذہ، طلبہ وطالبات اردو کی تعلیم و تدریس میں مصروف عمل ہیں۔ کالج سے یونیورسٹی کی سطح تک اور پی ایچ ڈی کی سند کے حصول تک کا سفر اردو کے لیے فال نیک ہے۔ مصر میں فی الوقت طلبہ وطالبات اور اساتذہ کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔ جن یونیورسٹیز میں اردو کی تعلیم کا باضابطہ نظم ہے ان میں ازہر یونیورسٹی کے دو شعبے (لڑکیوں اور لڑکوں کے لیے الگ الگ) عین شمس یونیورسٹی، قاہرہ یونیورسٹی، اسکندریہ یونیورسٹی، طنطا یونیورسٹی اور منصورہ یونیورسٹی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ازہر یونیورسٹی کا شعبہ اردو برائے خواتین اور ازہر یونیورسٹی کا لڑکوں کے لیے شعبہ اردو، عین شمس یونیورسٹی اور قاہرہ یونیورسٹی میں سنجیدہ موضوعات پر تحقیقی مقالے بھی لکھے جا رہے ہیں۔

مصر میں اردو کی تاریخ کی ایک صدی بھی ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے لیکن اس کے کارنامے حروف زریں سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ ہمارے محترم دوست ڈاکٹر پروفیسر یوسف عامر، وائس چانسلر ازہر یونیورسٹی جو بنیادی طور پر اردو کے پروفیسر ہیں، سے اس سلسلے میں ہماری اکثر گفتگو ہوئی ہے انھوں نے مجھے مصر میں اردو کی تاریخ کے حوالے سے چند اہم موڑ کی نشاندہی کی اسی کے ساتھ ڈاکٹر پروفیسر ابراہیم محمد ابراہیم، ڈاکٹر احمد القاضی اور ڈاکٹر جلال السعید الحفناوی کے مضامین سے مصر میں اردو زبان کی نشو ونما اور ارتقا کا علم ہوا۔ ابھی میرے سامنے ڈاکٹر ابراہیم کا مضمون ہے جو عربی زبان میں ہے۔ میں نے اپنے مصری شاگرد مصطفیٰ علاء الدین کی مدد سے اسے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر ابراہیم کا یہ مضمون کافی طویل اور مفید مطلب ہے لیکن کچھ اقتباسات کا مفہوم اس طرح ہے ''سنہ 1930 میں بڑی تعداد میں ہند و پاک کے لوگ مصر تشریف لائے۔ یہ لوگ اردو زبان اچھی طرح سمجھتے

اور بولتے تھے۔ اوران میں ہندوستانی ابوسعید العربی کا نام قابل ذکر ہے، جنھوں نے پہلی بار اردو زبان کا رسالہ (جہان اسلامی) کے نام سے قاہرہ سے شائع کیا۔ اسی سال 1930 میں ایک ہفتہ وار اخبار نکالا جس کے مدیر محمود احمد عرفانی تھے۔ اس اخبار کے اجراء میں ان کے بھائی محمد ابراھیم علی عرفانی نے بھی مکمل تعاون دیا اوران کی حوصلہ افزائی کی۔ اردو زبان کی تدریس مصری یونیورسٹیوں، تعلیمی اداروں میں پچھلے اسی (80) سال سے چل رہی ہے۔ مصری حکومت نے مشرقی زبانوں کی تعلیم وتدریس پر بیسویں صدی کے نصف اول ہی سے توجہ دینی شروع کر دی تھی تدریس کے سلسلے کا آغاز سنہ 1939 میں قاہرہ یونیورسٹی کے معہد اللغات الشرقیہ (اورینٹل لینگویج انسٹی ٹیوٹ) میں ہوا۔ جولائی سنہ 1952 کے بعد مصری حکومت نے اردو زبان میں ریڈیو نشریات کا آغاز کیا تاکہ اس کے ذریعہ ہندو پاک کے ساتھ مصر کے دوستانہ تعلقات استوار رہیں۔ یہ پروگرام شام 6 بجے سے 8 بجے تک قاہرہ کے وقت کے مطابق 'ریڈیو قاہرہ' سے نشر کیا جاتا ہے۔''

(پروفیسر ابراہیم محمد ابراہیم کے مضمون سے ماخوذ)

قاہرہ کے بعد ازہر یونیورسٹی، عین شمس یونیورسٹی اور دیگر جامعات میں اردو درس وتدریس کے سلسلے کا آغاز ہوا۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ جلد ہی مصر کی دیگر یونیورسٹیوں میں بھی اردو کے شعبے قائم ہونے والے ہیں۔ اتنی بڑی تعداد میں اردو پڑھنے پڑھانے والے موجود ہیں لیکن ابھی تک شاید ہندو پاک کی یونیورسٹیز سے ان کا باضابطہ کوئی معاہدہ نہیں ہے کہ جس کے تحت طلبہ واساتذہ ایک دوسرے ملک میں تعلیم اور تحقیق کے لیے آ، جا، سکیں۔ البتہ ہندستانی حکومت کے وظیفے منظور ہیں۔ کئی طلبہ و طالبات ہندستان میں ان وظائف پر تعلیم بھی حاصل کر رہے ہیں۔ جامعات کے مابین باضابطہ معاہدے کے لیے ہندستان کی جانب سے پہل کی ضرورت ہے اور خود مصری جامعات کو بھی اس جانب متوجہ ہونا چاہیے۔

مصر میں اردو کے آغاز کی تاریخ ستر برسوں (70) پر محیط ہے لیکن ابھی تک صرف چند احباب نے ہی ہند و پاک کی جانب رخ کیا اور یہاں سے فراغت کے بعد اردو کی خدمت میں مصروف ہیں۔ قاہرہ میں جن اساتذہ نے جامعہ ازہر سے اردو میں بی۔اے کرنے کے بعد پاکستان سے اردو میں پی ایچ ڈی کی ان میں ایہاب حفظی عز العرب، ابراہیم محمد ابراہیم اور جنھوں نے ہندستان سے پی ایچ ڈی کی ان میں احمد القاضی اور یوسف عامر صاحبان ہیں۔ فی الوقت میری نگرانی میں ایک مصری طالب علم مصطفیٰ علاء الدین پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ رہے ہیں۔ ازہر یونیورسٹی کے کئی طالب علموں سے اس سفر میں ملاقات ہوئی جو ایم اے اور پی ایچ ڈی کے لیے ہندستان آنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ پروفیسر ابراہیم محمد ابراہیم کے علاوہ یہ چاروں اساتذہ کئی بار ہندستان کے بڑے سمیناروں کے لیے مدعو کیے گئے۔ اس ناچیز نے پروفیسر جلال الحفناوی اور پروفیسر احمد القاضی کو دو عالمی سمیناروں میں مدعو کیا تھا، انھوں نے میری دعوت قبول کرکے ہمارے سمینار کو بامقصد بنایا۔ پروفیسر یوسف عامر کی ضیافت کا شرف تو حاصل نہ ہوسکا لیکن انھوں نے میری دعوت پر جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں لیکچرز دیے۔ ڈاکٹر رانیا فوزی سے بھی پہلی ملاقات پروفیسر یوسف عامر کے ہمراہ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں ہوئی اور گزشتہ سال ڈاکٹر مروہ لطفی کو لکھنؤ کے لیے زحمت دی تھی۔ ڈاکٹر بسنت محمد شکری اس سال ایوان غالب، نئی دہلی کی دعوت پر ہندستان آئی تھیں۔ ان کے علاوہ مصر کے دیگر اساتذہ جیسے ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی، ڈاکٹر رباب محمد، ڈاکٹر ایناس عبدالعزیز وغیرہ سے سوشل میڈیا کے ذریعے میرا تعارف تو تھا لیکن براہ راست ملاقات اس سفر میں ہوئی۔ اساتذہ کے علاوہ بہت سے طالب علموں سے میں سوشل میڈیا کے ذریعے ہی رابطے میں رہا۔ ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم صاحب سے میری پہلی ملاقات فیصل آباد، پاکستان کے ایک بین الاقوامی سمینار میں ہوئی تھی۔ جن اساتذہ کا ابھی ذکر ہوا ہے اس کے علاوہ بھی کئی نامور اساتذہ مصر کی مختلف یونیورسٹیز میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں جن سے اس سفر میں پہلی بار ملاقات ہوئی۔ یہ تمام سینئر اساتذہ کئی درجن کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر اردو کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ ڈاکٹر یوسف عامر کی کتاب 'جدید عربی اردو شاعری کا تقابلی مطالعہ' ہندستان کے معروف ادارے انجمن ترقی اردو ہند سے شائع ہوکر کافی مقبول ہوئی۔ مصر میں حکومت کا ایک ادارہ 'قومی سینٹر برائے ترجمہ' ہے جہاں سے اردو کی مترجمہ سیکڑوں کتابیں شائع ہوئی ہیں جس کے سبب اردو عالم عرب سے روبرو ہورہی ہے۔ جن اساتذہ کی کتابیں اس ادارے سے شائع ہوئی ہیں ان میں پروفیسر ابراہیم محمد ابراہیم، پروفیسر یوسف عامر، پروفیسر جلال الحفناوی، پروفیسر احمد القاضی وغیرہ اہم ہیں۔ اس کے علاوہ جامعہ ازہر کے شعبہ اردو سے سالانہ رسالہ بھی نکلتا ہے جو اردو اور عربی دونوں زبانوں میں ہوتا ہے۔

اردو کے مصری اساتذہ سے ملنے اور مجموعی طور پر اردو کے شعبوں کے دورے کے بعد ایک کمی کا احساس ہوا جس کی جانب اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے محسوس ہوا کہ اردو کے اساتذہ اور طلبہ اکثر آپس میں عربی زبان میں ہی باتیں کرتے ہیں۔ اگر اساتذہ اس جانب متوجہ ہوں اور ایسی کوشش کریں کہ کم ازکم شعبے میں تمام اساتذہ اور طلبہ وطالبات اردو میں ہی باتیں کریں تو اردو کی تفہیم اور تدریس میں مزید تیزی آئے گی۔ گاہے بگاہے ان شعبوں میں قومی اور بین الاقوامی سمینار بھی منعقد ہوتے رہتے ہیں لیکن سمینار کی زبان اکثر عربی ہوتی ہے اگر یہ تمام سرگرمیاں اردو زبان میں ہوں تو اردو کا رواج زیادہ ہوگا جو نئے طالب علموں کے لیے مفید بھی ہوگا۔ دوسری بات جس کا خصوصی طور پر میں ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ مصر کے اساتذہ کی زیادہ تر تصانیف اور ریسرچ اسکالر کے مقالے عربی زبان میں ہیں۔ اگر یہ اپنی تحریریں اردو میں لکھیں اور ہندو پاک کے رسائل میں شائع ہوں تو یہ خود بخود برصغیر اور اردو کی دوسری بستیوں میں متعارف ہوں گے۔ اردو کے مجری ادیب ہر جگہ اپنی تخلیقات کے سبب جانے جاتے ہیں۔ مصر کے اساتذہ میں بھی بخوبی تخلیقی صلاحیتیں موجود ہیں میری ان سے گزارش ہے کہ اس جانب بھی متوجہ ہوں۔ مجموعی طور پر میں اہل مصر اور حکومت مصر کو ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں کہ وہ برصغیر کی زبان وتہذیب کو پروان چڑھانے کی دل سے کوشش کررہے ہیں۔

جاپان کی جامعات میں اردو کی تدریس

جاپان بھی اردو کا بڑا گہوارہ ہے یہاں اردو کی تعلیم کا سلسلہ سو برس پر محیط ہے۔ ٹوکیو یونیورسٹی میں اردو تدریس کے سو برس پورے ہونے پر 2010 میں جشن صد سالہ منایا تھا۔ جاپان میں تین اہم یونیورسٹیز ہیں جہاں ایم۔اے کی سطح تک کی تدریس کا نظم ہے ان میں ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز جس کا قیام 1908 میں عمل میں آیا۔ اس کا نام پہلے ٹوکیو اسکول آف فارن لینگویجیز تھا جسے بعد میں یونیورسٹی کا درجہ ملا اس یونیورسٹی میں 'ہندستانی شعبہ' کھولا گیا جس میں اردو۔ ہندی کی تعلیم دی جاتی تھی لیکن 1947 میں تقسیم ملک کے بعد اس شعبے کا نام بدل کر شعبہ اردو رکھا گیا۔ یہاں بی۔اے سے ایم۔اے کی سطح تک کی تعلیم کا نظم ہے۔ ہندستان کے مقابلے اس ادارے کا پاکستان سے گہرا تعلق ہے۔ یہاں مستقل پاکستان سے اردو کے اساتذہ تدریس کے لیے جاپانی حکومت کی جانب سے بلائے جاتے ہیں۔ اس وقت یہاں پروفیسر ہیروشی ہاگیتا صدر ہیں یہ جاپانی زبان میں اردو کا ایک رسالہ بھی نکالتے ہیں۔ ان سے ہماری کئی بار کی ملاقات

ہے۔ ان کے علاوہ اس شعبے میں پروفیسر اساوا اور پروفیسر مامیا کین ساکو اور ایک پاکستانی استاد ہیں۔ میرے مشورے سے انھوں نے حال میں اپنے رفیق کار ڈاکٹر مامیا کین ساکو کو جے این یو سے باضابطہ معاہدے کے لیے بھیجا تھا جو الحمد للہ ہو گیا اور دونوں جانب سے طلبہ و اساتذہ کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو سکتا ہے۔ اس شعبے سے منسلک پروفیسر اساوا اور پروفیسر سوزوکی تاکشی کا اہم نام ہے۔

پروفیسر آرگاموکو جاپان میں 'بابائے اردو' کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اردو تدریس اور اردو زبان کے فروغ میں ان کی کوششوں کا بڑا اہم رول رہا ہے۔ حالانکہ جاپان میں اردو تدریس کی ابتدا کے حوالے سے ہندستان کے انقلابی رہنما مولوی برکت اللہ کا نام سرفہرست ہے۔ وہ 1908 میں جاپان گئے اور انھوں نے ہی وہاں اردو تدریس کی بنیاد ڈالی۔ جاپان میں ٹوکیو اسکول آف فارن لینگویجز کے شعبہ ہندوستانی کے اولین استاد پروفیسر انوئی تھے جو تین برس تک اس شعبے سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد ٹوکیو سے ہی فارغ اردو کے طالب علم ریچی گامو یہاں استاد مقرر ہوئے اور وہ باضابطہ اردو کے پروفیسر بنائے گئے۔ ان کی کوششوں سے اردو کی تدریس نے کافی ترقی کی۔ انھوں نے ہندوپاک کے ادیبوں سے رابطے بھی کیے ان میں پروفیسر نور الحسن کا نام اہم ہے۔ ان دونوں نے مل کر اردو بول چال کی درسی کتاب تیار کی جو آج بھی نصاب میں شامل ہے۔

ٹوکیو یونیورسٹی کے بعد اوساکا یونیورسٹی اور دائتو بنکا یونیورسٹی کا نام آتا ہے۔ یہاں بھی اردو بی۔ اے اور ایم۔ اے کی سطح تک پڑھائی جاتی ہے۔ اوساکا میں 1921 سے اردو تدریس کا سلسلہ شروع ہوا۔ 1921 میں اوساکا اسکول آف فارن لینگویجز کا قیام عمل میں آیا جو آگے چل کر 1944 میں کالج بنا اور 1945 میں اس نے یونیورسٹی کا درجہ حاصل کیا۔ اس شعبے سے منسلک اساتذہ میں پروفیسر ہیروشی کان کاگایا، پروفیسر تسونیو ہماگچی، پروفیسر میتسو مورا استاد پروفیسر سویامانے اردو میں اچھی شاعری کرتے ہیں۔ دائتو بنکا یونیورسٹی کے اساتذہ میں ایک اہم نام پروفیسر ہیروجی کتاؤکا ہے۔ یہ اب سبکدوش ہو چکے ہیں یہ بہت نفیس اردو بولتے ہیں اور اردو میں اچھی شاعری کرتے ہیں اور غالب کے کلام کو لحن سے جاپانی انداز میں پڑھتے ہیں۔ اس کے علاوہ جاپانی ادارہ برائے بین الاقوامی تعاون جائیکا کا تربیتی مرکز ہے جہاں اردو کی ثانوی سطح کی تدریس کا انتظام ہے۔

مجموعی طور پر جاپان جیسے ملک میں اردو کی تدریس کا انتظام ہے مگر زیادہ تر یونیورسٹیز میں طلبہ و طالبات کی تعداد بی۔ اے میں زیادہ سے زیادہ بیس اور ایم۔ اے میں پانچ یا چھ ہوتی ہے۔ ان یونیورسٹیز سے پاکستان کے تعلقات زیادہ بہتر ہیں اور جاپانی یہ سمجھتے ہیں کہ اردو پاکستان کی زبان ہے

اس لیے وہ زیادہ تر معاہدے پاکستان کی جامعات سے کرتے ہیں۔ ہندستان کے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کو چاہیے کہ ان سے اردو کے نام کے حوالے سے رابطہ قائم کریں۔

ماریشس میں اردو کی تدریس

ماریشس کو ہم چھوٹا ہندستان کہتے ہیں اس لیے کہ یہاں کی آبادی کا ایک بڑا حصہ ہندستانی مہاجرین کا ہے اسی لیے یہاں کی تہذیب و تمدن میں ہندستانی خوشبو موجود ہے اور بڑی تعداد میں اردو بولنے والے ہیں۔ ماریشس میں اردو تدریس کی کے سلسلے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ یہاں اسکولوں میں اردو تدریس کا نظم ہے۔ ماریشس میں اردو کے ایک ادیب فاروق رجل نے وہاں کی منسٹری کی ایک رپورٹ مجھے بھیجی ہے جس کے مطابق وہاں اسکولوں میں معلمین کی تعداد 254 ہے۔ اردو کی اعلیٰ تعلیم کے لیے مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ ہے جس کی بنیاد اس وقت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے 1970 میں رکھی تھی۔ 1974 سے یہاں اردو تعلیم کا نظم ہوا۔ یہاں کئی ہندستانی زبانیں جیسے اردو، ہندی، تمل، تلگو، مراٹھی وغیرہ پڑھائی جاتی ہیں۔ اس انسٹی ٹیوٹ میں بی اے اور ایم اے کی سطح کی تعلیم ہوتی ہے۔ لیکن جس طرح اسکولوں میں اردو تدریس کا انتظام ہے۔ اعلیٰ اردو تدریس کے لیے صرف یہی ایک ادارہ ہے جہاں بی اے میں تو تقریباً بیس طلبہ و طالبات ہوتے ہیں مگر ایم اے کی سطح پر طالب علموں کی تعداد بہت کم رہ جاتی ہے۔ اس ادارے کے پہلے انچارج قاسم ہیرا تھے اس کے بعد اس قافلے میں عنایت حسین عیدن شامل ہوئے جو ماریشس میں اردو کے بڑے ادیب ہیں انھوں نے ناول، افسانہ، ڈرامے لکھے۔ ان کے علاوہ صابر گوروڑ، اعجاز رحمت علی، آصف علی محمد، سکینہ، زینب، نازیہ اور مہرین کا نام ہے۔

یہاں بی اے اور ایم اے میں ایک پیپر کے طور پر طلبہ مقالہ لکھتے ہیں جس کو دیکھنے کے لیے ہندستان یا پاکستان سے بیرونی ممتحن کے طور پر بلایا جاتا ہے۔ ایک دہائی قبل آئی سی سی آر کی جانب سے اردو کے اساتذہ بھیجے جاتے تھے مگر اب یہ سلسلہ شاید اہل ماریشس کی تساہلی کے سبب بند ہو گیا ہے۔ میں نے بھی دو سال اس ادارے میں بیرونی ممتحن کے طور پر خدمات انجام دی ہیں۔ میں نے یہاں کے اساتذہ کو اس جانب متوجہ کیا مگر اب تک کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا ہے۔

ترکی میں اردو کی تدریس

اردو تدریس کے لحاظ سے ترکی اردو کی ایک اہم بستی ہے۔ ترکی میں اردو تدریس کے سو سال مکمل ہو چکے ہیں اور 2015 میں استنبول یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے اردو تدریس کا جشن صد سالہ منایا جس میں دنیا بھر سے سو سے زائد مندوبین نے شرکت کی تھی۔ استنبول میں تین بڑی یونیورسٹیز میں اردو پڑھائی جاتی ہے ان میں استنبول یونیورسٹی، انقرہ یونیورسٹی اور سلجوق یونیورسٹی، (قونیا) ہیں۔ اردو تدریس کا سلسلہ سب سے پہلے انقرہ یونیورسٹی میں 1956 سے شروع ہوا۔ پاکستانی حکومت نے اس سلسلے میں بڑی مدد کی اور اپنے ملک سے ڈاکٹر داؤد رہبر کو یہاں اردو تدریس کے لیے بھیجا انھوں نے اردو کورسیز کو مرتب کیا اس طرح یہ شعبہ ترقی کرتا گیا۔ اردو کے پہلے ترک استاد شوکت بولو ہیں ان کی سبکدوشی کے بعد ڈاکٹر سلمیٰ بینلی نے انقرہ یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو کا عہدہ سنبھالا۔ اس درمیان پاکستان سے کئی اردو کے اساتذہ جاتے رہے۔ فی الوقت یہاں ڈاکٹر گلسرین ہالی جی اوز کان، ڈاکٹر آسمان بیلن اوز جان اور ایمیل سلیم اردو کی

استاد ہیں۔ یہاں بی اے، ایم اے اور پی ایچ ڈی کی سطح تک اردو کی تعلیم کا نظم ہے۔ لیکن یہاں بھی پی ایچ ڈی کے مقالے ترکی زبان میں لکھے جاتے ہیں۔

سلجوق یونیورسٹی جو قونیا میں واقع ہے یہاں بھی اردو کا بڑا شعبہ ہے جو ڈاکٹر ایرکن ترکمان کی کوششوں سے 1985 میں قائم ہوا۔ یہاں بھی ایم اے تک کی تعلیم کا نظم ہے اس شعبے میں اردو کے طلبہ وطالبات کی خاطر خواہ تعداد ہے۔ یہاں بھی ایم کے مقالے ترکی زبان میں لکھے جاتے ہیں۔ یہاں کے اساتذہ میں ڈاکٹر نوریے بلک، ڈاکٹر درمش بلغور، ڈاکٹر خاقان قیومجو۔ ڈاکٹر رجب درگن کے نام اہم ہیں۔

ترکی میں اردو کا تیسرا اور سب سے بڑا شعبہ استنبول یونیورسٹی میں 1974 میں قائم ہوا۔ یہاں بی۔اے۔، ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی تک کی تعلیم ہوتی ہے۔ترکی میں سب سے فعال یہی شعبۂ اردو ہے۔ یہاں کے نامی گرامی پروفیسر خلیل طوق آر ہیں جو اردو کے اچھے نثر نگار اور شاعر بھی ہیں انھوں نے پچاس سے زائد کتابوں کی تصنیف اور ترجمہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ پروفیسر جلال سوئیدان، ڈاکٹر کارداش ذکائی اور خدیجہ گورگن اس شعبے سے وابستہ ہیں۔ ایک ہندستانی استاد ڈاکٹر راشد کو ذاتی طور پر رکھا گیا ہے۔اس شعبے نے تحقیق، تنقید اور شاعری کی سمت میں بڑے کام کیے ہیں۔ یہاں اکثر و بیشتر ادبی سمناروں کا بھی انعقاد کیا جاتا رہا ہے۔

مجموعی طور پر ترکی میں اعلی سطح پر اردو کی تدریس ہو رہی ہے۔ یہاں مختلف اصناف نثر و نظم پر سو سے زائد پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ کچھ مقالے جستہ جستہ شائع بھی ہوئے ہیں جن سے کم از کم ترکی جاننے والے مستفید ضرور ہوئے ہیں۔ ان تمام یونیورسٹیز سے حکومت پاکستان کے گہرے روابط ہیں۔ ہندستان کو بھی ان سے روابط پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ان اساتذہ کے لیے مشکل یہ ہے کہ یہاں اردو بولنے کا رواج کم ہے اسی لیے زیادہ تر یا اپنی زبان میں باتیں کرتے ہیں اسی لیے کچھ اساتذہ بہت روانی سے اردو نہیں بول پاتے۔ لیکن مقام شکر ہے کہ اردو کی تدریس کا سلسلہ جاری وساری ہے۔

یوروپی ممالک میں اردو کی تدریس

یوروپی ممالک میں اردو کی تدریس کے لحاظ سے سب سے پہلے ہائیڈل برگ یونیورسٹی کا نام سامنے آتا ہے۔ یہاں کا شعبۂ اردو کرسٹینا اوسٹر ہلڈ کی وجہ سے بہت مشہور ہوا کیونکہ کرسٹینا ایک پڑھی لکھی خاتون ہیں، وہ خالص لب و لہجے میں بہت نفیس اردو بولتی ہیں۔ انھوں نے ہندو پاک کے علاوہ کئی ممالک میں اردو کے سمناروں میں شرکت کی ہے۔ ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں بی۔اے۔اور ایم۔اے سطح کی تعلیم ہوتی ہے۔ لیکن اب طلبہ و طالبات کی تعداد کم ہوگئی ہے۔ اس ادارے کو پاکستانی حکومت نے اقبال چیئر دے رکھا ہے جس کے تحت پاکستان سے اکثر اردو کے پروفیسران وہاں جاتے ہیں۔ ابھی کئی برسوں سے یہ چیئر خالی ہے۔

برلن یونیورسٹی میں اردو تدریس کا سلسلہ بہت قدیم تھا لیکن اتحاد کے بعد یہ سلسلہ موجود نہیں۔ اب برلن میں ہمبولٹ یونیورسٹی میں بھی اردو کی تدریس ہوتی ہے لیکن یہاں ابتدائی اور بی اے کی سطح تک کی تعلیم ہوتی ہے۔ ابھی سرور غزالی اس شعبے سے جڑے ہوئے ہیں، یہاں کے طالب علم جز وقتی اردو کورس کے لیے معاہدے کے تحت جے این یو آتے رہتے ہیں۔ اسی شہر میں 'فری یونیورسٹی' بھی ہے جہاں ابتدائی سطح کی اردو تدریس ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ برلن میں ایرفورٹ میں بھی اردو کا شعبہ تھا جو اب بند ہو گیا ہے یہاں جناب عارف نقوی برسوں تک جڑے رہے۔ اس کے علاوہ بھی جرمنی میں کئی یونیورسٹی ہیں جہاں اردو کی تدریس کا انتظام طلبہ کے مطالبے پر ہوتا ہے لیکن اعلی تعلیم نہیں ہوتی۔ جرمنی میں برلن کی جز وقتی لیکچر شپ ہیمبرگ، بون، ٹوبنگن، میونخ، ورتز برگ، مائنز میں قائم ہے۔ ہالینڈ میں لائیڈن یونیورسٹی میں اضافی مضمون کے طور پر اردو کی تدریس کا نظم ہے۔ اسی طرح ایمسٹرڈیم یونیورسٹی میں خود اختیاری مضمون کے طور پر اردو تدریس کا نظم ہے۔ سوئٹزرلینڈ کی برن یونیورسٹی میں ایم۔ اے کی سطح تک اردو تدریس کا نظم ہے۔ اس یونیورسٹی سے مشہور مستشرق اشپرینگر وابستہ رہے ہیں۔ وارسا یونیورسٹی پولینڈ میں ایم۔اے تک کی تعلیم ہوتی ہے۔ یہاں ہندستانی شعبے کے تحت اردو کی تدریس کا نظم ہے۔ پولینڈ کی دوسری یونیورسٹی آدم میکویز یونیورسٹی میں بھی اردو بطور غیر ملکی زبان پڑھائی جاتی ہے۔اوسلو یونیورسٹی ناروے میں شعبۂ مشرقی علوم کے تحت عربی، فارسی، سنسکرت کے ساتھ اردو کی بھی تدریس ہوتی ہے۔

یوروپ کے ممالک میں فرانس کا نام اردو تدریس کے لیے اہم ہے گارسین دتاسی نے 1828 فرانس میں اردو تدریس کی بنیاد ڈالی۔ گارسیں دتاسی وہی اہم مستشرق کا نام ہے جن کی تحقیقات کو آج بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ فرانس میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ فار لینگویج اینڈ سویلائزیشن جس میں اعلی سطح کی اردو تدریس ہوتی ہے۔ فرانس میں اردو بولنے والے کی اچھی تعداد ہے اسی لیے کئی اردو کی تنظیمیں بھی موجود ہیں۔

یونیورسٹی اورینٹل انسٹی ٹیوٹ، (نیپلز اٹلی) یہ بہت قدیم تعلیمی ادارہ ہے اس کا قیام اٹھارہویں صدی میں ہوا لیکن پہلے اس کا نام ایشیائی علوم کا شاہی مدرسہ جسے Real Asiatieo Collegio تھا پھر اس کا نام اورینٹل انسٹی ٹیوٹ ہوا اس کے بعد انسٹی ٹیوٹ سپریر اورینٹل ہوا اور آخر میں یونیورسٹی اورینٹل انسٹی ٹیوٹ ہوا۔ اس ادارے میں اردو کی اعلی تعلیم کا نظم ہے۔ یہاں پی ایچ ڈی کی سطح تک اردو پڑھائی جاتی ہے۔ اس یونیورسٹی میں کئی اہم تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں۔

روم میں ازمیو یعنی Pero Italiano institute Oriente Esttremo Ed ایک نیم سرکاری ادارہ ہے۔ اس ادارے میں دیگر مشرقی زبانوں کے ساتھ اردو کی تدریس کا اعلی نظام ہے جہاں تین سالہ کورس کے تحت اردو پڑھائی جاتی ہے۔ اس ادارے کی دو شاخیں بھی ہیں ایک میلان میں اور دوسرا تیورن میں۔ چارلس یونیورسٹی۔ پراگ۔ چیک ریپبلک میں 1942 سے اردو کی تدریس کا عمل شروع ہوا۔ پروفیسر ونسنس پورزگا کا شمار اردو تدریس کے نام نہاد مستشرق میں ہوتا ہے۔ کارولین یونیورسٹی (پراگ۔ چیک جمہوریہ) میں بھی اردو تدریس کا نظم ہے پروفیسریان

مارک کا اہم نام اس یونیورسٹی سے جڑا ہوا ہے۔انھوں نے پراگ یونیورسٹی سے اقبالیات پر پی ایچ ڈی کی ہے۔

یوروپی ممالک کی ان جامعات میں اردو کے اہم موضوعات پر کئی قابل قدر تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں اور کئی مستشرقوں نے اردو کی ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ان یونیورسٹیز کی اردو خدمات پر کسی ادارے کی مدد سے تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ دیار غیر میں اردو کی تدریس اور تعلیم کے لیے جو کارہائے نمایاں انجام دیے گئے ہیں ان کو اردو تدریس کی تاریخ میں محفوظ کیا جاسکے۔

برطانیہ میں اردو کی تدریس

برطانیہ میں اردو کے فروغ کی کہانی عام طور پر بر صغیر پر برطانوی تسلط سے شروع ہوتی ہے۔لیکن برطانیہ میں اردو تدریس اور تحقیق کی تاریخ اس سے پہلے کی ہے حالانکہ برطانیہ میں اردو درس و تدریس کا سلسلہ یورپ کے کئی ممالک کے بعد شروع ہوتا ہے مگر برطانیہ نے اردو زبان و ادب اور تدریس میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ قابل قدر ہیں۔خود ہندستان میں فورٹ ولیم کالج بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے جو برطانوی کوششوں کا نتیجہ تھا لیکن خود برطانیہ کے مختلف شہروں میں کئی جامعات اور کالجز ہیں جو اردو کی درس و تدریس میں آج بھی خدمات انجام دے رہے ہیں۔برطانیہ میں ان کی تعداد بہت ہے لیکن یہاں ہم چند اہم جامعات کا ذکر کرتے ہیں۔

برطانیہ کی مختلف یونیورسٹیز میں اردو کی اعلیٰ تعلیم کا نظم ہے ویسے ابتدائی سطح پر اردو کی تدریس بیشتر یونیورسٹیز اور کالجز میں موجود ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ برطانیہ میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبانوں میں اردو چوتھے نمبر پر ہے۔ برطانیہ کے کئی شہروں میں تو مقامی لوگوں سے بھی زیادہ تعداد مہاجرین کی ہے اس لیے اردو تدریس کا نظام کسی نہ کسی طور پر وہاں موجود ہے۔لندن کے علاوہ مانچسٹر، شیفلڈ، برمنگھم اور کئی جگہ اردو پڑھائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں لندن یونیورسٹی کا اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز (SOAS) کا نام بہت اہم ہے کیونکہ اس سے وابستہ کئی مستشرقوں نے اردو تحقیق و تصنیف کے سمت میں ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں، آکسفورڈ یونیورسٹی میں 1859 سے اردو کی تعلیم کا آغاز ہوا، کیمبرج یونیورسٹی میں 1832 سے اردو کی تعلیم کا سلسلہ جاری ہے، رائل ملٹری اکیڈمی میں 1861 سے اردو کی تدریس ہورہی ہے۔ ان کے علاوہ کنگز کالج لندن، چیلٹنہم کالج برطانیہ، ٹرنٹی کالج ڈبلن، رائل ملٹری اکیڈمی ولوچ، ایٹن کالج، ایڈن برگ یونیورسٹی اسکاٹ لینڈ، یونیورسٹی آف ڈرہم، برمنگھم یونیورسٹی وغیرہ میں بھی اردو کی تدریس ہورہی ہے۔

امریکی جامعات میں اردو کی تدریس

امریکہ میں اردو کی تدریس کا نظم کئی ریاستوں میں ہے لیکن زیادہ تر یونیورسٹیز میں اردو بی۔اے کے لیول تک پڑھائی جاتی ہے اعلیٰ تعلیم یعنی اردو میں پی۔ایچ ڈی کی ڈگری شاید ہی کسی یونیورسٹی میں ہوتی ہے۔جن جامعات میں اردو پڑھائی جارہی ہے ان میں اہم یہ ہیں۔ورجینیا یونیورسٹی، یونیورسٹی آف پینن سلوانیا، یونیورسٹی آف شکاگو، آک لینڈ یونیورسٹی، برکلے یونیورسٹی، کارنل یونیورسٹی، پورٹ لینڈ یونیورسٹی، ہارورڈ یونیورسٹی، ڈیوک یونیورسٹی، براون یونیورسٹی، نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی، یونیورسٹی آف نارتھ کیرولینا، نارتھ کیرولینا اسٹیٹ یونیورسٹی، یونیورسٹی آف مِنی سوٹا، یونیورسٹی آف کولوراڈو، بوسٹن یونیورسٹی، یونیورسٹی آف اوتاہ، کولمبیا یونیورسٹی، ہارورڈ یونیورسٹی، اوہیو یونیورسٹی، یونیورسٹی آف لوا، جان ہاپکنس یونیورسٹی، یونیورسٹی آف میشی گن، نیو یارک یونیورسٹی، پرنسٹن یونیورسٹی، ییلے یونیورسٹی۔

امریکہ کے علاوہ کناڈا کی جن جامعات میں اردو کی ابتدائی تدریس کا نظم ہے ان میں اہم یہ ہیں۔کناڈا میں میکگل یونیورسٹی، برٹش کولمبیا یونیورسٹی، ٹورنٹو یونیورسٹی میں بھی اردو تدریس کا نظم ہے۔

افریقہ میں اردو کی تدریس

افریقی ممالک میں اردو کے تدریس کے حوالے سے جوہانسبرگ (جنوبی افریقہ) کا ذکر ضروری ہے۔ جوہانسبرگ میں اُردو بولنے والوں کی اچھی تعداد موجود ہے۔یونیورسٹی آف ڈربن ویسٹ ویل میں شعبہ اردو، فارسی اور عربی ہے جہاں بی۔اے تک اُردو بطور اختیاری مضمون پڑھائی جاتی ہے ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی بھی اردو میں کرسکتے ہیں۔

بنگلہ دیش میں اردو کی تدریس

بنگلہ دیش میں یوں تو اردو کی تدریس کا سلسلہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں 1921 سے ہی شروع ہوتا ہے جہاں ایک ہی شعبے میں اردو، عربی اور فارسی کی تدریس کا نظم تھا۔اس شعبے کو خاطر خواہ ترقی ملی لیکن ملک کی آزادی کے وقت یہ نشیب و فراز کا شکار ہوتا ہے۔لیکن یہ سلسلہ نہیں ختم ہوا۔ 2007 میں طالب علموں کی تعداد بڑھتی گئی تو اردو کو الگ شعبے کے طور پر ڈھاکہ یونیورسٹی نے منظوری دی اور اب یہ اردو کا ایک بڑا شعبہ ہے جس میں 9 اردو کے اساتذہ ہیں۔ یہ سارے اساتذہ بنگالی ہی ہیں۔ابھی حال میں ہندستان کی حکومت کی جانب سے اس یونیورسٹی میں اردو کے استاد کو بھیجنے کی بات چلی ہے۔ ممکن ہے بہت جلد کوئی ہندستانی استاد وہاں مقرر ہوں۔ یہاں ایم۔اے اور پی ڈی کی سطح تک کی تعلیم کا نظم ہے۔

ڈھاکہ یونیورسٹی کی طرح راج شاہی یونیورسٹی میں بھی پی ایچ ڈی کی سطح تک کا نظم ہے یہاں 1962 سے اردو کی تدریس کا سلسلہ ہے لیکن پہلے یہ لینگویجیز ڈپارٹمنٹ کے تحت تھا جس میں کئی غیر ملکی زبانیں پڑھائی جاتی تھی ابھی حال ہی میں 2018 میں یہ خود مختار اردو شعبے کے طور پر بحال ہوا ہے۔ یہاں بھی اساتذہ کی تعداد تقریباً نو ہے۔

ماحصل

مجموعی طور پر غیر ملکی جامعات میں اردو کی تدریس اور صورتِ حال اطمینان بخش ہے۔لیکن تحقیق کی صورت حال چند ممالک میں ہی بہتر ہے۔اس تعارفی مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ:

- بیشتر ممالک میں جہاں اردو میں پی ایچ ڈی کرائی جارہی ہے وہاں کے مقالوں کی زبان ان کی ملکی زبان ہی ہے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہے کہ وہاں کے لوگ اردو ادب سے روشناس ہوں گے۔لیکن ان اساتذہ میں اردو بولنے کی استعداد کم رہتی ہے کیونکہ ان کی تحریری زبان اردو ہے مگر بولنے کی زبان ان کی اپنی ہے۔
- اگر غیر ملکی جامعات کے اساتذہ اور طلبہ و طالبات کی آمد و رفت اور تربیتی پروگرام کا کچھ نظم ہو تو ان ممالک میں اردو کے فروغ کے امکانات بہت روشن ہیں۔
- ضرورت اس بات کی ہے کہ ان سے روابط بحال کیے جائیں اور ان کی تربیت کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ان کی خدمات کا اعتراف کیا جائے۔
- اور جس حد تک ممکن ہو ان کو کتابیں مہیا کرائی جائیں کیونکہ ان کی لائبریوں میں بہت کم کتابیں موجود ہیں خاص کر نئے لکھنے والوں کی کتابیں تو بالکل ہی نہیں ہیں۔

ان تمام کمی و بیشی کے باوجود اردو کے لیے یہ فال نیک ہے کہ اردو زبان دنیا کے مختلف ممالک میں پڑھائی جارہی ہے۔

■

Dr. Khwaja Md Ekramuddin
Professor
Centre of Indian Languages
School of Language
Literature and Culture Studies
Jawaharlal Nehru University
New Delhi - 110067
Mob: 9717977743
www.khwajaekram@gmail.com

محمد فیروز عالم

رائٹ ٹو ایجوکیشن ایکٹ
موجودہ صورت حال اور امکانات

انسانی زندگی کی ترقی میں تعلیم کا بے حد اہم رول ہوتا ہے۔ بدلتے ہوئے حالات کے چیلنجز کا سامنا کرنے کے لیے دنیا کے تمام ممالک اپنے اپنے ملک میں تعلیمی نظام کو بہتر بنانے اور اسے ترقی دینے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ تاکہ بہتر تعلیم کے ذریعے ماضی کے تجربات نیز زمانہ حال کی ضرورتوں کے پیش نظر نئی نسل کے لیے ایک اچھے مستقبل کی تعمیر ہو سکے۔

تعلیم کے حقوق (رائٹ ٹو ایجوکیشن ایکٹ) کا مطلب محض مفت و لازمی تعلیم ہی نہیں ہے بلکہ سب کے لیے معیاری تعلیم کا پہلو بھی اس میں شامل ہے۔ نیز تعلیم کی کوالٹی اس کا ایک اہم جز ہے۔ اگر تعلیمی عمل میں کوالٹی کا فقدان ہو تو وہ بھی بچوں کو ان کے حق سے محروم کیے جانے کے مترادف ہے۔ اس ایکٹ کے تحت اس بات کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ نصاب تعلیم ایسا ہو جس میں بچوں کو سرگرمیوں، گہرے مطالعے اور دریافت و انکشافات کا موقع مل سکے۔ اس طرح ہمارے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ بچوں کے لیے علم کے حصول اور کتابوں کو امتحانات کی بنیاد بنانے سے متعلق اپنے روایتی نظریات میں بغیر کسی چوں چرا کے تبدیلی لائی جا سکے۔ مزید برآں درس و تدریس اور علم کے حصول کے عمل کو ذہنی دباؤ اور بوجھ سے پوری طرح آزاد ہونا چاہیے اور اس نظام کو بچوں کے موافق بنانے کے لیے نصاب تعلیم اور ذریعۂ تعلیم میں وسیع پیمانے پر اصلاحی عمل کی شروعات کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ایک ایسا نظام جو نہ صرف بچوں کے تعلیمی نظریات سے مطابقت و مناسبت رکھتا ہو، بلکہ انھیں بااختیار بھی بنایا جائے۔ اساتذہ کی جوابدہی کے تحت بھی انتظامات و عملی کارروائی کے ذریعے ہمیں اس بات کو یقینی بنانا ہوگا کہ بچوں کا تدریسی عمل کارگر ثابت ہو رہا ہے یا نہیں؟ ایک دوستانہ ماحول میں ان کے تدریسی حق کی کسی بھی طرح کی خلاف ورزی تو نہیں کی جا رہی ہے۔ بچوں کے ٹیسٹ اور جائزے سے متعلق نظام تعلیم کی از سر نو جانچ پڑتال اور تشکیلِ نو کا کام اس طرح کیا جانا چاہیے کہ بچے اسکول اور ٹیوشن مراکز کے درمیان چکر کاٹتے کاٹتے اپنا بچپن ہی نہ گنوا بیٹھیں۔ ہمیں اس ایکٹ کا جائزہ بچوں کے خیالات اور دلچسپی کو ذہن میں رکھ کر کے ہی لینا چاہیے، جو خوف و دباؤ اور فکر و تشویش سے پوری طرح آزاد ہو۔ اس ایکٹ میں ایسی بہت سی دفعات رکھی گئی ہیں جن کے تحت جسمانی سزا، مار پیٹ، بچے کو چھٹی کے بعد اسکول میں روکنے اور اسکول سے ان کا نام خارج کرنے جیسی سرگرمیوں کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ اس بات کا متقاضی ہے کہ ڈسپلن اور کنٹرول سے متعلق اپنے روایتی نظریات کا ہم نہ صرف از سر نو جائزہ لیں، بلکہ اساتذہ و بچوں اور والدین کے درمیان تعلقات اور کلاس روم کے نظم و ضبط سے متعلق اپنے موقف کے کچھ متبادل بھی تلاش کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسکولوں میں بنیادی ڈھانچہ، تربیت یافتہ اساتذہ، نصاب، درس و تدریس سے متعلق ساز و سامان اور مڈ ڈے میل کی فراہمی کی ذمے داری اگرچہ مرکزی و ریاستی تعلیم کے محکموں کی ہی ہے تاہم ہم سب کے لیے ابتدائی تعلیم کو بنیادی حق کے طور پر نصب العین کے حصول کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ پوری حکومت ہی اس کاز کے لیے سرگرم ہو۔ اس تعلق سے مختلف شعبوں کے درمیان اشتراک و تعاون کو یقینی بنانے کے لیے ایک مربوط میکینزم، لائحہ عمل اور پالیسیاں بنانے کی اشد ضرورت ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آزادی کے بعد گذشتہ دہائیوں کے دوران تعلیم کے شعبے میں نمایاں پیش رفت اور تبدیلیاں عمل میں آئی ہیں اور سماج کے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے اب زیادہ سے زیادہ بچوں کا رجحان اسکولی تعلیم کی جانب مبذول ہوتا جا رہا ہے۔ اندراج کے اعداد و شمار پر اگر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اسکولوں میں زیر تعلیم بچوں کی شرح تقریباً 100 فیصد ہے، 98 فیصد بستیوں میں ایک کلومیٹر کے اندر اندر پرائمری اسکول کی تعلیمی سہولتیں مہیا کرائی جا چکی ہیں اور 92 فیصد بستیاں ایسی ہیں، جہاں 3 کلومیٹر کے اندر اندر Upper پرائمری اسکول موجود ہیں۔ پرائمری تا Upper پرائمری سطحوں کی عبوری شرح میں بھی کافی بہتری واقع ہوئی ہے۔ تاہم اس کے باوجود کچھ بچے ایسے ہیں، جو اب بھی اسکولی تعلیم سے محروم ہیں، جو فیکٹریوں اور کارخانوں میں بندھوا مزدوروں کے طور پر کام کرتے ہیں یا وہ ایسے بچے بھی ہیں، جو مویشی کو چراتے ہیں یا ڈھابوں پر کام کرتے ہیں اور کچھ ایسی بچیاں ہیں، جو کھیتوں اور گھروں میں رہ کر یا تو گھریلو ملازماؤں کے طور پر کام کرتی ہیں یا اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں یا کچھ ایسے بچے ہیں جنھیں بچپن میں ہی شادی کے بندھنوں میں جکڑ

دیا جاتا ہے۔ ان میں کافی بڑی تعداد ایسے بچوں کی بھی ہوتی ہے، جن کا اسکولوں میں باقاعدہ اندراج ہو چکا ہوتا ہے، تاہم یا تو وہ بیچ میں ہی پڑھائی چھوڑ بیٹھتے ہیں یا ایک بار اندراج ہونے کے بعد دوبارہ وہ اسکول کا رخ ہی نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ بہت سے ایسے بچے بھی ہیں، مثلاً نقل مکانی کرنے والے یا اسٹریٹ چلڈرین، جو بے حد غیر محفوظ اور انتہائی غربت کے حالات کا شکار ہو جاتے ہیں، ایسے بچوں کو تعلیم کی سہولتوں سے محروم کیا جانا انسانی حقوق کے ہمہ گیر نوعیت کی نفی کرنے کے ہی مترادف ہے اور ہمارے لیے اب یہ ناکافی ہے کہ ہم ان بچوں کے لیے تعلیمی سہولتوں کی فراہمی کا محض ذکر ہی کرتے رہیں۔

اگر چہ اسکولی تعلیم کا ان بچوں کو مہیا کرایا جانا ناگزیر اہمیت کا حامل ہے، تاہم محض سہولیات کی فراہمی ہی انھیں کافی نہیں ہے، کیونکہ یہ یقینی نہیں ہے کہ اس طرح یہ بچے اسکول جانے لگیں گے اور وہاں تعلیم حاصل کرنے لگیں گے۔ اسکول میں تعلیمی سہولیات کی موجودگی کے باوجود یہ ضروری نہیں ہے کہ بچے وہاں جاکر تعلیمی سہولتوں کا فائدہ بھی اٹھا سکیں یا وہ کچھ ماہ بعد بیچ میں ہی تعلیم کو ترک نہ کر بیٹھیں۔ اسکول اور سماجی جائزے کے ذریعے ہمیں ان سبھی سماجی، معاشی، ثقافتی، لسانی اور معلمانہ وجوہات کا پتہ لگانا ہوگا، جن کی وجہ سے پچھڑے و کمزور طبقات سے تعلق رکھنے والے یہ بچے اور بچیاں کبھی باقاعدگی کے ساتھ اسکول میں حاضر نہیں ہو پاتے اور اپنی ابتدائی تعلیم بھی مکمل نہیں کر پاتے۔ اس سلسلے میں تمام تر توجہ غریب ترین اور سب سے زیادہ کمزور طبقات کے بچوں پر ہی دی جانی چاہیے، کیونکہ یہی وہ گروپ ہیں جو سب سے زیادہ وسائل کی کمی کا شکار رہتے ہیں اور جن کو تعلیم کے حق سے محروم کیے جانے اور اس حق کی ان کے تئیں خلاف ورزی کے امکانات عام طور پر زیادہ رہتے ہیں۔

فرد، سماج اور قوم کی ترقی کے لیے تمام شہریوں کا تعلیم یافتہ ہونا از حد ضروری ہے اور مستقبل کے ہندوستان کو مکمل طور پر زیور تعلیم سے آراستہ ہونے کے لیے سب سے پہلے بچوں کی ابتدائی تعلیم پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے، کیونکہ یہی بچے دیش کی کشتی کے اصل ناخدا ہیں۔

بچوں کی تمام تعلیمی سرگرمیوں میں ابتدائی تعلیم اس کی اصل بنیاد ہے جس کے بغیر تعلیمی کارواں آگے بڑھ ہی نہیں سکتا۔ اس لیے مفت تعلیم اور لازمی تعلیم کا قانون ہونا چاہیے۔ یونیسکو کی ورلڈ مانیٹرنگ رپورٹ برائے تعلیم 2010 کے مطابق تقریباً 135 ملکوں نے اپنے آئین میں تعلیم کو مفت اور لازمی کردیا ہے۔ ہندوستان میں 1950 میں 14 سال تک کے بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم دینے کے لیے ملک کے آئین میں دفعہ 45 کے تحت صوبوں کے رہنما اصول کی پالیسی وضع کی گئی ہے۔ 1992 کے اندرا ساہنی اور 1993 کے جے پی انی کرشنن مقدمہ میں سپریم کورٹ نے پالیسی کے رہنما اصولوں نیز بنیادی حقوق میں کسی تفریق یا مخالفت کے بجائے باہمی تعاون کو منظوری دی ہے اور اس کے تحت تعلیم کی دفعہ 45 کو ہندوستانی شہریوں کے بنیادی حقوق میں شامل کیا۔

سپریم کورٹ نے تعلیم کے اس بنیادی حق کو دفعہ 21 کے تحت زندگی و جان کی آزادی کے حقوق میں شامل کیا ہے۔

سرکار نہ چاہتے ہوئے بھی اس موضوع پر قانون بنانے کے لیے مجبور ہوئی جس کے نتیجے میں پارلیمنٹ نے 86 ویں آئینی ترمیم (12 دسمبر 2002) کے تحت 6 سے 14 سال کی عمر کے سبھی بچوں کو لازمی اور مفت تعلیم کا بنیادی حق قرار دیا ہے۔

86واں ترمیم ایکٹ 2002 نے آئین کے حصہ سوم میں ایک نئی دفعہ (A) 21 کو شامل کیا ہے۔

گرین ول آسٹن نے اسے (Part-3) کو آئینی شعور اور سماجی انقلاب کے لیے آئین سازوں کے عزم کا ثبوت تسلیم کیا ہے۔

86 واں آئینی ترمیم کو باا ثر بنانے کے لیے ایک مناسب ضمیمہ کے طور پر قانون کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ 4 اگست 2009 کو پارلیمنٹ کے ذریعے منظور بچوں کے لیے لازمی اور مفت تعلیم کے حق کا قانون اسی مقصد کے پیش نظر منظور کیا گیا۔ صدر جمہوریہ کی تصدیق اسے حاصل ہو چکی ہے۔

مفت اور لازمی تعلیم کا قانون یکم اپریل 2010 کو مکمل طور پر نافذ کردیا گیا ہے۔ چنانچہ مرکزی اور صوبائی سرکار کا فرض ہے کہ وہ مفت اور لازمی تعلیم کا بندوبست کریں۔ تفصیلات درج ذیل ہیں:

(1) 6 سے 14 سال کے ہر بچے کے لیے اسکول میں مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام۔

(2) اگر 6 سے 14 سال کی عمر کا بچہ کسی سبب سے اسکول نہیں جاتا ہے تو اسے تعلیم حاصل کرنے کے لیے اس کی عمر کے مطابق درجہ میں داخلہ دلوایا جائے گا۔

(3) اس کے لیے متعلقہ سرکار اور مقامی انتظامیہ کو اگر ضروری ہو تو اسکول بھی کھولنا پڑے گا۔ اگر کسی علاقہ میں اسکول نہیں ہے تو وہاں پر تین سال کی معینہ مدت میں اسکول کی تعمیر کروانا لازمی ہوگا۔

(4) عمل درآمد کی ذمہ داری مرکزی و صوبائی سرکار دونوں کی ہوگی۔ اس قانون کا سب سے زیادہ فائدہ مزدوروں کے بچے، مہاجروں کے بچے، خصوصی ضرورت مند بچے یا سماجی، تہذیبی، مالی، لسانی یا معذوری کی وجہ سے تعلیم سے محروم بچوں کو ملے گا۔

چیلنجز :

(1) تعلیم ہر بچے کا بنیادی حق ہو گیا ہے۔ لازمی تعلیم کو قانونی حقیقت کا جامہ پہنانے کے لیے سب سے پہلے بڑی تعداد میں تربیت یافتہ اساتذہ کی ضرورت ہوگی۔ ابھی حال میں انسانی وسائل کی وزارت کی ہدایت کے مطابق ٹیچر بننے کے لیے اہلیتی امتحان کو لازمی قرار دیا گیا ہے، لیکن امتحان کا خاکہ کون تیار کرے گا، موضوع کیا ہوگا، امتحان کا وقت کتنا ہوگا؟ اس تعلق سے واضح احکامات کا فقدان ہے۔

(2) دوسری بات اس وقت 14-6 سال کے بچوں کی تعداد اسکول سے باہر ہے، جن میں بیشتر بچے مزدوری وغیرہ سے منسلک ہیں۔ انھیں وہاں سے نکال کر اسکول میں داخل کرنا ایک مشکل امر ہے۔

(3) تیسرا اہم مسئلہ بجٹ کا ہے، کیونکہ بجٹ کا تذکرہ قانون میں نہیں کیا گیا ہے۔

(4) مفت اور لازمی تعلیم کے تحت صرف 25 فیصدی سیٹوں پر ہی سماج کے کمزور طبقہ کے طلبا کو داخلہ ملے گا۔ اس طرح سماج میں مساوات کا جو خواب ہے وہ اب بھی پورا نہیں ہوگا۔

(5) تعلیمی نظام کو موثر طریقے سے چلانے کے لیے منظم بلڈنگوں کی ضرورت ہے جس کی آج بھی بہت کمی ہے۔

لیکن ان تمام خامیوں کے باوجود حق تعلیم کا قانون سنگ میل ثابت ہوگا۔ ہم امید کرتے ہیں۔

تعلیم کے حقوق پر ہر ایک کے لیے یہ جاننا ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ تعلیم کے حقوق کے ذریعہ آنے والی نسل کو تعلیم سے آراستہ کریں تاکہ بچے زندگی کی بصیرت بھی حاصل کرسکیں۔ بچوں کی تعلیم میں یہ جذبہ پیدا کریں کہ وہ قومی زندگی کو بنانے میں مدد کرے، پریم، امن اور بھائی چارے کا سبق دے، ہر پھول سے رس چوسے اور ہر دل میں اپنی مٹھاس اور خوشبو سے گھر بنائے، پھر ہر بچے کا مستقبل تابناک ہوگا۔

■

Dr. Md Firoz Alam
firozmimt@rediffmail.com

ظفرعدیم
کی چند منظومات وامتیازات

منظر اعجاز

ظفرعدیم کی لازوال جنبش قلم نے ورق سادہ پر جو گل بوٹے اور گلزار کھلائے ہیں، ان میں حرکت وحرارت اور رقص وموسیقی کا آہنگ بے مثال ہے۔ اور یہ کمال ان کے اسلوب سے ظاہر ہے۔ مجاز وساحر کے نظمیہ ڈکشن کے دلدادگان میں ایک وہ بھی تھے لیکن انھوں نے خود کو سب سے الگ رکھا اور اس مقام ومرتبے پر ایستادہ کیا جو متقدمین ہی نہیں معاصرین اور متاخرین سے بھی منفرد اور ممتاز ہے۔ ظفرعدیم منثورات ومنظومات کی مختلف تخلیقی جہات پر زبردست دسترس رکھتے تھے۔ وہ ہم عصروں میں مزاجاً بھی عدیم النظیر اور فقید المثال تھے۔

ظفرعدیم نے درجن بھر نثری اور شعری تصانیف میں اپنے مخصوص تخلیقی وجدان کے ساتھ ساتھ طرز و اسلوب کی سطح پر بھی اپنے امتیازات برقرار رکھے ہیں۔ 'لالہ رخ' طویل منظوم ڈرامہ کے علاوہ بھی انھوں نے منظوم کہانیاں لکھی ہیں۔ غزل کے روایتی دیوان 'دیوان عدیم' کے علاوہ بہت سی معرکہ آرا نظمیں کہی ہیں۔ میں یہاں ان کے مجموعہ کلام 'بھینی بھینی مہک' کے باب 'تاثریت' کے علاوہ اسی نوع کی بعض دوسری تاثراتی نظموں کے حوالے پر اکتفا کروں گا۔

ظفرعدیم کا گھر مظفر پور میں کچی سرائے چوک کے پاس مسجد سے متصل اور مسلم کلب کے سامنے تھا۔ ظفرعدیم کے نوعمری کے زمانے تک مسلم کلب میں بھی شاندار مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ شاعری کا ذوق اور ملکہ خداداد تھا چنانچہ دوسرے مقامی اور غیر مقامی شاعروں کے علاوہ انھوں نے فراق اور جگن ناتھ آزاد کے علاوہ کئی عظیم المرتبت شاعروں کو قریب سے دیکھا اور سنا بھی تھا اور ان کی ذات وصفات سے متاثر بھی ہوئے تھے۔ جگن ناتھ آزاد سے مکالمت اور مراسلت بھی تھی چنانچہ 'بھینی بھینی مہک' کے باب 'تاثریت' میں ان دونوں سے متعلق نظمیں ہیں۔ "غریب الوطن۔ شمیں مظفر پوری' کا محرک کیا تھا، کون تھا، اس کا مجھے علم نہیں۔ 'اردواداس ہے' جناب اغفار احمد ناز انصاری کی یاد میں" ظفر انور کی گزارش پر معرض وجود میں آئی۔ 'مجذوب صفت شاعر جناب الیاس نجم مظفر پوری' اس باب کی آخری نظم ہے۔ اس کا محرک ان کے اپنے وجدان کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔ انھوں نے اس قسم کی کئی نظمیں اور کہیں جو کسی نہ کسی کی گزارش یا فرمائش پر معرض تخلیق میں آئیں۔ ان کا یہ مزاج عجیب و غریب اور حیرت انگیز تھا کہ وہ اپنی تحریر یا تخلیقات خود کسی رسالے یا میگزین میں اشاعت کے لیے نہیں بھیجتے تھے۔ ان کے کئی افسانے میں نے 'گلبن' اور 'نیا دور' وغیرہ کو بھیجے۔ نیا دور میں جو افسانہ شائع ہوا اور ان کے افسانوی مجموعہ 'پھول اور خوشبو' میں شامل ہے، میری ہی تحریک پر مظفر پور کے سفر کے دوران لکھا گیا۔ میں نے ان سے ایک بڑے ناقد کے سلسلے میں تاثراتی نظم لکھوائی جو 'انشا' میں شائع ہوئی۔ میں نے فراق کے سلسلے میں مضامین کا مجموعہ 'فراق اور غزل کا اسلوب' شائع کیا تو 'بھینی بھینی مہک' کے باب 'تاثریت' میں شریک نظم 'وحید العصر: جناب رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری' اپنی مرتبہ اس کتاب میں شامل کرلی۔ اس کتاب کے ساتھ فراق ہی سے متعلق ایک دوسری کتاب کا مسودہ کتابت کے مرحلے میں تھا تو فون کے ذریعے فراق سے متعلق ایک نظم کی گزارش کی اور انھوں نے بلا تاخیر نظم ارسال کردی۔ اس کتاب کا عنوان 'فراق ماسوائے غزل' ہے اور ابھی یہ شائع نہیں ہوئی ہے۔ بہرحال وحید العصر: فراق سے متعلق مطبوعہ نظم کا پہلا بند ملاحظہ ہو

پرواز یوں جلو میں لیے رنگ و بو گئی
فطرت بہار بن کے برائے نمو گئی
لوح وقلم کو تھام لیا، دست فکر نے
ذات فراق اوج سعادت کو چھو گئی

یہ وضاحت یہاں غیر ضروری نہ ہوگی کہ ظفرعدیم نے فراق کی شاعری بالخصوص غزل کے حوالے سے تاثراتی مضامین بھی لکھے۔ یہ مضامین بھی فرمائشی تھے۔ فراق کا انتقال 1982 میں فروری کے مہینے میں ہوا۔ میں 'انعکاس' نکال رہا تھا۔ میں نے فراق نمبر کا اعلان کیا تو ظفرعدیم سے مضامین کی گزارش کی اور انھوں نے مضامین لکھے۔ ان کا خیال تھا کہ فراق کی اکثر وبیشتر راتیں بے خوابی میں گزریں اور اکثر وبیشتر غزلیں ایسی ہی بے خواب راتوں میں تخلیق پذیر ہوئیں۔ متذکرہ نظم کے دوسرے بند میں ایسے ہی تاثرات کا اظہار نظر آتا ہے۔

تخلیق لے کے ہاتھ میں قندیل آتی تھی
پہلے پہر، تجلی تخئیل آتی تھی
ہوتا تھا پھر فراق پہ اسرار کا نزول
جیسے فلک سے آیت ترتیل آتی تھی

اس نظم کا چوتھا بند بھی اسی خیال سے مربوط ہے۔

پیراہن نفس میں عروس سخن ملی
شبنم کی چاندنی سے غزل کی کرن ملی
جب پو پھٹی، تو نجم سحر بول اٹھا فراق
کس شان سے پیمبری فکر وفن ملی

ایک نظم کا آخری بند دعائیہ ہے اور اختتام اس کا اس شعر پر ہوا ہے۔

جب تک اردو ہے جہاں تاب، ادب میں آزاد
تیرا رتبہ، تری عظمت، ترا اعزاز رہے

غریب الوطن: جناب شین مظفر پوری۔ مسدس کے فارم میں پانچ بند پر مشتمل ہے۔ شین مظفر پوری نے مدرسہ عالیہ، کلکتہ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ آگے کی تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ پھر وہیں صحافت سے وابستہ ہوگئے۔ افسانہ نگاری بھی اسی دوران شروع ہوئی اور تھوڑے ہی عرصے میں انھوں نے شہرت و مقبولیت حاصل کرلی۔ ماہنامہ آرٹسٹ کے مدیر نے آرٹسٹ کی ادارت سنبھالنے کی دعوت دی تو تقسیم کے سانحے سے پہلے دہلی کا سفر کیا اور اس سانحہ کے رونما ہونے کے ساتھ سیل بلا خیز میں بہتے ہوئے لاہور پھر کراچی چلے گئے۔ یہ سفر اتفاقی اور حادثاتی تھا۔ جب وطن واپس ہوئے تو 'سنگم' روزانہ پھر ماہنامہ 'صنم' اور اخیر میں اردو اکادمی، بہار کے ماہنامہ 'زبان و ادب' کے مدیر مقرر ہوئے۔ یہاں سے سبکدوشی کے بعد اپنے گاؤں باتھ اصلی، سیتا مڑھی، مظفر پور میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور وہیں آخری سانس لی۔ ان کی زندگی جد و جہد اور عسرت میں گزری۔ ظفر عدیم نے اس نظم میں ان کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں کو اختصار اور جامعیت کے ساتھ سمیٹ لیا ہے۔ پہلا بند ملاحظہ ہو۔

نشاں، نقوشِ گزر گاہ چھوڑ آیا تھا
غبار و گردِ سرِ راہ چھوڑ آیا تھا
فضا میں اپنی تڑپ، آہ چھوڑ آیا تھا
شکستہ شمس تھکا ماہ چھوڑ آیا تھا
ضرورتوں کا سمندر عبور کر کے چلا
دیارِ غیر کو بھی کوہ طور کر کے چلا

شین مظفر پوری نے زندگی کا دو تہائی سے زیادہ عرصہ اپنے دیار مظفر پور سے دور غریب الوطنی میں گزارا۔ دیار غیر سے مراد دلی ہے، جہاں وہ ماہنامہ آرٹسٹ کے مالک کے بلاوے پر گئے تھے اور کچھ ہی مہینے بعد آفت ناگہانی میں پھنسے۔ اپنی سرگزشت 'رقصِ بسمل' میں شین مظفر پوری نے زندگی کی محرومیوں، مایوسیوں اور کرب و اضطراب پر نہایت ہی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ ہمیشہ مسائل و مصائب سے دو چار رہے۔ اسی معنوی تناظر میں یہ بند ملاحظہ ہو۔

صعوبتوں میں بھی تخلیق کر گیا کیا کیا
خیال و خواب کے دامن میں بھر گیا کیا کیا
حیات و ذات کے سر سے گزر گیا کیا کیا
اس ایک شخص کے مرنے سے مر گیا کیا کیا

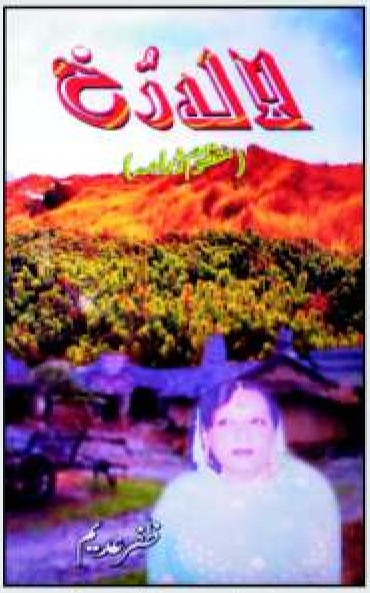

زباں کا طرزِ بیاں کا گداز دفن ہوا
ادب کا سوز، زمانے کا ساز دفن ہوا

ایک نظم 'اردو اداس ہے' جناب اغفار احمد ناز انصاری کی یاد میں تخلیق ہوئی۔ بقول ظفر انور:

"1992 میں دہلی کے عظیم صحافی جناب ناز انصاری صاحب کا انتقال حج کے دوران عرفات کے میدان میں ہوگیا اور وہیں ان کی تدفین ہوئی... ان کے انتقال کے بعد میں نے ناز صاحب کی حیات و خدمات پر ایک مجلّہ شائع کرنے کا ارادہ کیا اور ظفر عدیم صاحب سے گزارش کی کہ آپ ایک منظوم خراج عقیدت تحریر فرمادیں تاکہ میں اسے مجلّے میں شائع کردوں۔ میری درخواست انھوں نے قبول فرمائی اور ایک شاہکار منظوم خراج عقیدت لکھ کر میرے حوالے کردیا۔"

اس بیان سے مترشح ہے کہ یہ نظم پچیس سال پہلے لکھی گئی۔ یہ نظم بھی مسدس کے فارم میں چار بند پر مشتمل ہے۔ پہلا بند اس طرح ہے۔

وہ اک وجود جو کہ ذہانت کی حد پہ تھا
جس کا لطیف ذوق زمانے کی زد پہ تھا
ایسا جنوں کہ دبدبہ اہلِ خرد پہ تھا
جو فن کے اوج فکر کے طولِ بلد پہ تھا
اس کی لحد کا آج پتہ پوچھتے ہیں لوگ
اک دوسرے سے حرفِ دعا پوچھتے ہیں لوگ

آخری بند میں جناب ناز انصاری کے معیار صحافت و ادب کو نشان زد کرنے کی کوشش تحسین طلب معلوم ہوتی ہے۔

وہ ایک شخص جو کہ صحافت کا نور تھا
نازِ ادب تھا بزمِ ادب کا غرور تھا
جس کی زباں میں کیف، قلم میں سرور تھا
قدرت تھی پیشکش پہ بیاں پہ عبور تھا

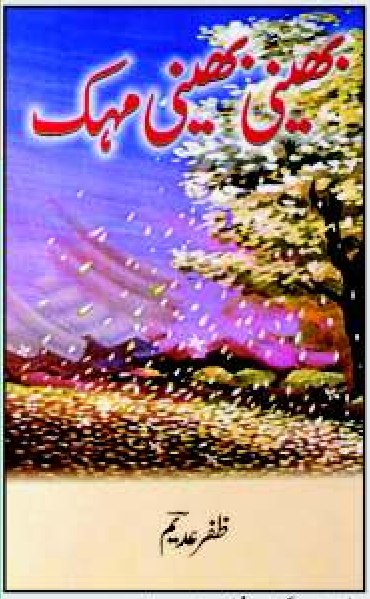

لہجے کا گوشہ نطق کا پہلو اداس ہے
اک شخص کے نہ ہونے سے اردو اداس ہے

ظفر عدیم نے مجذوب صفت شاعر، جناب **محمد الیاس نجم** مظفر پوری سے متعلق نظم میں جذب و کیف کی ایک الگ دنیا ہی بسا دی ہے۔ شروع کے تین بند فلسفہ اخلاق کے تناظر میں عمومی تبصرے کی حیثیت رکھتے ہیں بعد کے چار بند میں جناب نجم کی شخصیت اور فن پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ سوز و گداز اور مترنم آواز کی نشاندہی بھی کی گئی ہے:

نجم شاعر تھا بدلتے ہوئے موسم کی طرح
فکر کی دھوپ بھی تھا، فن کی ہری دوب بھی تھا
یوں بظاہر کوئی فنکار سا لگتا تھا مگر
وہ مدبر بھی تھا، مجنوں بھی تھا، مجذوب بھی تھا

پردۂ سوز میں آواز کے پیکر کا جمال
کربِ انفاس کے تاروں میں سموئے جیسے
خنک احساس میں ڈوبا ہوا لہجے کا سکوت
چاندنی اوس بھری شاخوں پہ سوئے جیسے
نجم اک عہد سفر بھی تھا، سفر نامہ بھی
سنگِ میل اور کبھی قندیل نظر آتا تھا
اس میں سمٹی تھی زمانے کے ادب کی تاریخ
وہ سمندر تھا، مگر جھیل نظر آتا تھا

نجم کے فن میں ہے گزرے ہوئے کل کی خوشبو
نجم کی فکر نئے دور کی ضو پاشی ہے
شعر میں ٹانک دیے نجم سحر، لیلیٰء شب
شاعری ہے کہ خیالات کی عکاسی ہے

اس نظم کے آخری بند میں رسم زمانہ پر متاسفانہ تاثرات کا اظہار ہے کہ بھولی بسری ہوئی تربت کا خیال آتا ہے تو

یادوں کے چراغ جلا لیے جاتے ہیں۔ زندگی میں خراجِ تحسین پیش نہیں کرتے۔ عقیدت کا خیال مرنے کے بعد آتا ہے۔

الیاس نجم مظفر پوری خوش قسمت تھے کہ ظفر عدیم نے ان پر ایسی شاہکار نظم قلمبند کرکے انھیں اردو ادب میں حیاتِ جاودانی عطا کردی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نجم کا ذوق نہایت ہی بالیدہ تھا اور آواز یعنی ترنم بھی ایسا تھا کہ مشاعرے کی محفل پر چھا جاتے تھے۔ لیکن ان کا مجموعہ کلام ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آسکا اور نہ مستقبل میں آنے کی امید کی جاسکتی ہے۔ وہ رسائل و جرائد میں شائع ہونے والے شاعر بھی نہیں تھے۔ البتہ بعض تذکروں میں اکا دُکا کلام ملتے ہیں۔ بہر حال ظفر عدیم نے اپنے طور پر حق رفاقت ادا کردیا ہے۔

ظفر عدیم کی نثری تحریر ہو یا شعری تصنیف، اگر باذوق قاری کے ہاتھ لگ گئی تو وہ اس کے طلسم یا سحر سے فوراً آزاد ہونے میں ناکام رہے گا۔ ان کی ہر تحریر دامن کش دل و نگاہ ہوتی ہے۔ زبان کا اسلوب اور بیان کا پیراہن اس قدر کشش انگیز اور تاثر خیز ہوتا ہے کہ قاری اپنے گرد و پیش سے بیگانہ ہوکر کسی اور ہی دنیا میں سانس لینے لگتا ہے۔ ظفر عدیم نے یہ مہارت مطالعے اور مشق سے حاصل کی تھی۔ ادب و شعر کے میدان میں ان کا کوئی استاد نہ تھا۔ وہ سائنس کے طالب علم رہے تھے۔ تعلیم ادھوری رہی یا پوری ہوئی تو وہ دوا کی ایک کمپنی 'اپکا' (IPCA) سے بطور Medical Representative وابستہ ہوگئے۔ کئی برسوں تک یہی مشغلہ رہا۔ اردو اور ہندی کے علاوہ ان کی انگریزی بھی بہت اچھی تھی۔ فراٹے دار انگریزی بولتے تھے اور شروع میں انھوں نے انگریزی اخباروں کے لیے کچھ مضامین بھی لکھے تھے۔ ماہنامہ 'انجو' کی چیف ایڈیٹری (1997) سے ظفر عدیم نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ (1978) میں فلم نگری بمبئی کے کئی پھیرے لگائے۔ 1978 سے 1979 تک، تقریباً ایک سال پروفیسر سید احمد، مکماسٹر یونیورسٹی، کنیڈا کے ایک علمی پروجکٹ 'لغات ابجد شاری' پر خصوصی مساعد کی حیثیت سے کام کیا۔ اظہار تشکر میں سید احمد صاحب نے ظفر عدیم کی زود فہمی اور سرعت رفتار کی تعریف کی ہے۔ ظفر عدیم حد درجہ زود گو اور زود نویس تھے۔ انھوں نے 1980 میں جب 'روبی' کی ملازمت اختیار کی تو ان کے کام کو دیکھتے ہوئے مدیر گرامی رحمٰن نیر نے کئی پرانے اور بڑے عملہ کی چھٹی کردی تھی۔

ظفر عدیم نہایت ہی خوبرو، خوش وضع، خوش خلق و اخلاق اور ملنسار قسم کے انسان تھے۔ اجنبیوں سے بھی اس انداز میں ملتے جلتے جیسے ان سے دیرینہ شناسائی ہو، دوستوں کی تو خیر بات ہی الگ تھی۔ میں دلی جاتا تو ان کے مکان کے قریب ہی ایک عزیز کے گھر قیام کرتا اور مغرب کے بعد ان کے در دولت پر حاضر ہوتا۔ کبھی کبھار بسمل عارفی بھی آجاتے۔ محفل یاران طریقت جم جاتی، علمی ادبی گفتگو میں وقت کے بھاگنے کا احساس تک نہ ہوتا۔ اکثر گیارہ بج جاتے۔ وہ ویسے بھی دیر رات گئے بستر پر جاتے تھے۔ پہلے باضابطہ ملازمت 'تیج' میں ہوئی تھی بعد میں 'قومی آواز' میں بھی سب ایڈیٹر کی مستقل ملازمت سے وابستہ ہوئے۔ اس دوران بھی دوسرے اخبارات و رسائل سے وابستگی رہی۔ قومی آواز بند ہوگیا تو رضا کارانہ طور پر سبکدوشی ہوگئی۔ لیکن اس کے بعد بھی ان کی مصروفیات حسب معمول رہیں۔ پھر بھی انھوں نے اپنے پرائے کو کبھی ٹالا نہیں۔ میں نے ''فراق ما سوائے غزل'' کے لیے فون کے ذریعہ ہی ان سے درخواست کی اور انھوں نے نظم بھیج دی۔ ابھی تک یہ کتاب شائع نہیں ہوسکی ہے۔ اس لیے ان کی یہ نظم بھی غیر مطبوعہ رہ گئی۔ میں اسے مکمل صورت میں پیش کررہا ہوں تاکہ کچی سیاہی میں محفوظ ہوجائے۔ ظفر عدیم نے اس نظم کے ایک مصرع کو ہی اس کا عنوان بنایا ہے۔ ''تم نے فراق معجزۂ حسن کیا کیا''۔ یہ نظم چھ مصرعوں کے پانچ بند پر مشتمل ہے۔ چھ مصرعی بند کو عموماً مسدس کہا جاتا ہے لیکن یہ بند مسدس کی روایتی ہیئت میں نہیں ہے۔ تکنیک کے لحاظ سے بھی یہ نظم ظفر عدیم کی دوسری نظموں سے مختلف ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ تکرار سے بچنے کی شعوری کوشش بھی کرتے تھے۔ پوری نظم ملاحظہ ہو۔

تم نے فراق آئینۂ حسن کیا کیا
عکسِ شبیہ عشق پھر افزوں ہوا نہیں
فرقت کا رنگ شام سے شب گوں ہوا نہیں
دردِ چراغ نالۂ مجنوں ہوا نہیں
دل آشنائے ذائقۂ خوں ہوا نہیں
تم نے فراق آئینۂ حسن کیا کیا

———

تم نے فراق پیرہن حسن کیا کیا
جسم قبائے نکہتِ ناز اب کہاں سے لاؤں
وہ شعلہ زیرِ پردۂ ساز اب کہاں سے لاؤں
خطِ شکن، بہ شوقِ نیاز اب کہاں سے لاؤں
تا صبح کیف ہجر دراز اب کہاں سے لاؤں

———

تم نے فراق نیشتر حسن کیا کیا
سوزِ جراحتِ دل بے تاب چاہیے
بہر نشاط دیدۂ بے خواب چاہیے
ربطِ سکوں بہ حلقۂ گرداب چاہیے
نجم سحر بھی چشمۂ خوناب چاہیے
تم نے فراق نیشتر حسن کیا کیا

———

تم نے فراق معجزۂ حسن کیا کیا
افسونِ جلوۂ مہ و انجم نہیں رہا
قطرہ بقدرِ دُرد تہ خم نہیں رہا
پہلی سی وہ طلب وہ تقدم نہیں رہا
اظہارِ عشق رو بہ تکلم نہیں رہا
تم نے فراق معجزۂ حسن کیا کیا

———

تم نے فراق دل زدۂ حسن کیا کیا
وہ داغ ہائے عشق تہ آب ہے کہیں
تقدیس جائے عشق تہ آب ہے کہیں
خاک شفائے عشق تہ آب ہے کہیں
رازِ بقائے عشق تہِ آب ہے کہیں
تم نے فراق دل زدۂ حسن کیا کیا؟

مجھے یاد آتا ہے کہ وفات سے دو تین سال قبل ظفر عدیم نے ادب کی کسی بڑی زندہ شخصیت پر اس قسم کی ایک نظم کسی دوست کی فرمائش یا گزارش پر کہی تھی، وہ نظم ماہنامہ 'انشا' میں شائع ہوئی تھی۔ اور میری نظر سے بھی گزری تھی۔ ہوسکتا ہے کہ ایسی نظمیں اور بھی کہی ہوں گی جو آئندہ کبھی دریافت ہوسکتی ہیں۔

■

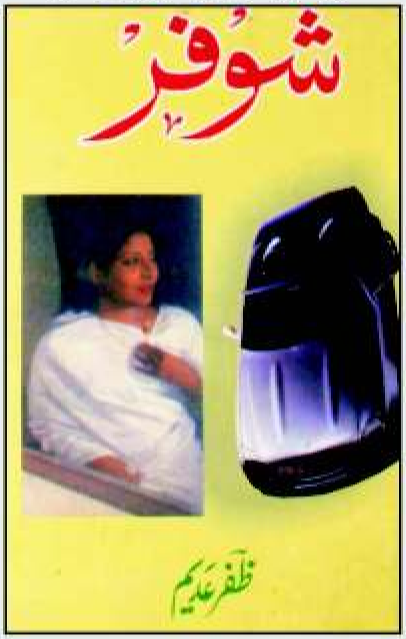

Dr. Manzar Aijaz
Prof. & Head, P.G. Dept of Urdu
A.N. College
Patna - 800013 (Bihar)
Mob.:9431840245

فضا ابن فیضی

کی غزلوں میں خود نقدیت کے عناصر

ایم نسیم اعظمی

فضا ابن فیضی (1923-2009) اردو کے معروف شاعر ہیں، جنھوں نے اردو کی تقریباً سبھی کلاسیکی اصناف شاعری میں کامیاب اور تحیر انگیز طبع آزمائی کی ہے، لیکن وہ بنیادی طور پر غزل گو شاعر ہیں اور ان کی غزلوں میں ہی ان کے فکر وفن کے جوہر سب سے بہتر انداز میں نمایاں ہوئے ہیں۔ مگر بیسویں صدی کی اردو نظم نگاری اور رباعی گوئی میں بھی وہ اپنی مخصوص اور منفرد شناخت بنانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

فضا ابن فیضی ملک کی آزادی کے زمانے سے بیسویں صدی کے اختتام تک تقریباً نصف صدی سے زائد عرصہ تک اردو کے شعری منظرنامے پر پورے تسلسل سے نمایاں رہے ہیں اور شاید ہی ہندوستان و پاکستان کا کوئی ایسا رسالہ ہو جس میں ان کی تخلیقات تواتر کے ساتھ نہ شائع ہوئی ہوں۔ وہ ایک زرخیز ذہن وفکر کے مالک تھے اس لیے ان کے یہاں تنوع، رنگارنگی اور تخلیقی وفور کی کثرت پائی جاتی ہے۔ ان کے یہاں ایسے بہت سارے اشعار بھی پائے جاتے ہیں جو ان کے تخلیقی عمل میں ان کی تنقیدی بصیرت اور اپنے کلام کو خوب سے خوب تر بنانے کے عمل میں ان کی تنقیدی صلاحیت کی بھی غمازی کرتے ہیں اور جسے عموماً تخلیقی عمل میں کام آنے والے تنقیدی شعور و بصیرت سے تعبیر کیا جاتا ہے یا بہ الفاظ دیگر خود نقدیت (Self Criticism) کہا جاتا ہے۔

فضا ابن فیضی ایک اہم اور قابل ذکر شاعر ہیں۔ وہ نہ کوئی باقاعدہ نقاد ہیں اور نہ ہی کسی دبستانِ تنقید سے ان کا تعلق رہا ہے۔ وہ محض شاعر و تخلیق کار تھے، انہوں نے کوئی باقاعدہ تنقیدی کارنامہ بھی انجام نہیں دیا ہے اور نہ ہی مشرقی و مغربی تنقیدی اصول و نظریات کے پابند یا ہم نوا رہے ہیں کہ جن کی روشنی میں ان کے تنقیدی کارناموں کی اہمیت وحیثیت کا تعین کیا جائے۔ یہاں ان کے ایسے اشعار پر گفتگو مقصود ہے جو ان کے اندر موجود تنقیدی صلاحیت کی ترجمانی کرتے ہیں یا ان کے تخلیقی عمل میں تنقیدی رہنمائی کا ذریعہ رہے ہیں اور جن کے بغور مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فضا ابن فیضی کو رومانوی اور جمالیاتی تنقید نے کئی زاویوں سے متاثر کیا ہے اور انھوں نے اپنے اسی تنقیدی شعور سے رہنمائی بھی حاصل کی ہے جس سے ان کی غزلوں کے بعض اشعار میں خود نقدیت کے رومانی اور جمالیاتی حسن و وجدان اور شعور کی کارفرمائی نظر آتی ہے اور ان کی تخلیقات کے معیار حسن و قبح کی جانچ پرکھ کا ذریعہ رہے ہیں، جو ان کے تنقیدی ادراک و فنی عرفان سے تعبیر تو کیے جاسکتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ تنقیدی ادراک اور فنی عرفان بھی ان کے تخلیقی عمل کا پرتو ہیں، اور ان کا اظہار بھی انہوں نے شعری پیکر میں کیا ہے، جس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی تنقیدی آگہی بھی ان کی تخلیقی آگہی بن گئی ہے اور ان اشعار میں جو تاثراتی عناصر پائے جاتے ہیں ان کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ فضا ابن فیضی کی تنقیدی بصیرت و آگہی میں تاثراتی تنقید کی خاص کارفرمائی تھی اور وہ ایک بڑے اور حساس شاعر تھے۔ تاثراتی نقاد بھی عموماً دماغ سے زیادہ دل سے کام لیتا ہے اور دل پر پاسبانِ عقل کے پہرے کا مخالف ہوتا ہے اس لیے اس کے یہاں کوئی مستحکم اور مضبوط تنقیدی نظریہ بھی نہیں ہوتا اور وہ اپنے تنقیدی خیالات کے اظہار میں بھی عموماً تنقیدی اصول وضوابط سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اس کے تنقیدی شعور و آگہی سے اس کے تخلیقی عمل کو فائدہ تو پہنچتا ہے مگر ادب و تنقید کو کسی باقاعدہ فائدے کی امید کم ہی ہوتی ہے۔

فضا ابن فیضی جیسے تخلیق کار کے تنقیدی شعور کا تعلق عملی تنقید سے بھی ہے۔ اس لیے ان کے اندر موجود عملی تنقیدی بصیرت سے اس بات کا تو اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری ادب

وتہذیب کا اہم ترین جزو ہے، مگر اس کا وہ خود بھی کوئی تنقیدی تجزیہ نہیں کر پاتے اور شاعری میں اس قسم کے تنقیدی خیالات کے وضاحتی اظہار کی بھی گنجائش کم ہی ہوتی ہے۔ خصوصاً غزل کے شعر میں جو اختصاریت کا حامل ہوتا ہے، اس لیے وہ یہ بھی نہیں بتا پاتے کہ علم ودانش کے دوسرے شعبوں، دیگر علوم وفنون اور عوامی زندگی کے دیگر عوامل ومحرکات سے اس کا کیسا اور کہاں کہاں رشتہ ہوتا ہے اور ادب وشاعری کا رشتہ اس سے کہاں جا کر مل جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تخلیق کار رشتہ تخلیق کار کے مزاج سے ہوتا ہے، ادب کے بدلتے رویے، اور بدلتی معاشرتی وتہذیبی قدریں اور بدلتے ہوئے سیاسی ومعاشی منظرنامے سے بھی ادب وشاعری کا گہرا تعلق ہوتا ہے اور تاریخ وروایات سے بھی ہوتا ہے۔ لیکن ان تاثراتی، رومانوی اور عملی تنقید میں وہ سماجی اور تہذیبی شعور کی آمیزش کر کے کسی تنقیدی تجزیہ وتحلیل سے کام نہیں لے پاتے اور یہ کام کسی شاعر یا تخلیق کار کا ہے بھی نہیں۔ پھر بھی ان کی شاعری میں جو تنقیدی افکار پائے جاتے ہیں ان کے تناظر میں کہا جا سکتا ہے کہ فضا ابن فیضی کا تنقیدی مسلک تاثراتی، جمالیاتی اور عملی ہے، اور وہ صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ اعلا پائے کے سخن سنج اور شعر فہم بھی تھے اور ان کے اندر شعری جہاں بانی اور کار جہاں بینی کی خصوصیات بیک وقت مستحکم اور توانا حالت میں موجود تھیں۔

فضا ابن فیضی اپنے دور کے اہم ترین غزل گو شاعر ہیں لیکن وہ کوئی مفکر یا فلسفی نہیں ہیں اور نہ ہی نقاد۔ اس لیے ان کی شاعری اور ان کے تنقیدی شعور کے اظہار میں بھی کسی ایسی بلندیٔ فکر کی تلاش نہیں کی جا سکتی جس بنیاد پر یہ ثابت کیا جا سکے کہ فضا ابن فیضی علامہ اقبال کی طرح شاعر کے ساتھ ساتھ مفکر اور پیغامبر بھی تھے یا مرزا غالب کی طرح فلسفی بھی ہیں، لیکن وہ شعر وادب کے مزاج داں ضرور تھے۔ جس طرح میر تقی میر اپنے دور کی سب سے توانا غزلیہ آواز رہے ہیں فضا ابن فیضی بھی بیسویں صدی کے نصف اواخر کے برصغیر کے اہم ترین شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

شاعر پہلے تخلیق کار رہتا ہے پھر کچھ اور۔ ایسے کم ہی نقاد گزرے ہیں جو اعلا پائے کے شاعر بھی ہوں اور بہترین نقاد بھی۔ فضا ابن فیضی اعلا پائے کے شاعر تھے۔ ان کے تنقیدی شعور میں جہاں مشرقی تنقید کے بعض اہم تنقیدی کارناموں کے مطالعہ کی جھلک ملتی ہے وہیں اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے عہد اور ماقبل کے تمام اہم ادبی وتنقیدی اصول ونظریات کا بھی علم رکھتے ہیں۔ نیز علم عروض میں بھی اچھی دسترس رہی ہے لیکن ان تمام واقفیت کا دائرہ صرف ان کے مشق سخن تک ہی محدود رہتا ہے۔ وہ اپنے تنقیدی شعور سے اپنے تخلیقی عمل میں تو کام لیتے ہیں لیکن اپنے تنقیدی شعور وبصیرت کو منظم طور پر متعارف کرانے کا عمل نہیں کرتے، اور یہ بھی ہے کہ اگر وہ چاہتے تو سنجیدہ تنقیدی کارنامے بھی انجام دے سکتے تھے یہ ان کے بس سے باہر کی چیز بھی نہیں تھی اور اپنے دور کے تنقیدی کارناموں سے مطمئن بھی نہیں تھے جیسا کہ انہوں نے ترقی پسندوں کی غزل میں روح عصر کے نہ ہونے کے اعتراض کو تخلیقی طور پر غلط ثابت کرتے ہوئے خود اپنی غزلوں میں روح عصر کی توانائی اس طرح بھر دی کہ اس سے بہتر روح عصر کی مثال ملنی مشکل ہے اور یہ بھی ان کی خود نقدیت اور فنی چابکدستی کا ثبوت ہے۔

یہ میرے دور کے ناقد ہیں کیا خبر تھی مجھے — زمانہ ہاتھ میں اندھوں کے آئینہ دے گا

صحیفے طاق پہ رکھ دے مرا مطالعہ کر — کہ تیرا حاصل بین السطور ہے مجھ میں

شیوۂ فرہاد پر تنقید کرتا ہے بہت — کچھ دنوں اس شخص کو بھی مکتب خسرو میں رکھ

ہم اہل فن بھی ہیں ریشم کے خالقوں کی طرح — کہ جس طلسم سے نکلے اسی میں ڈوب گئے

وہی شعر وفن کی بلاغتیں، وہی جدتیں وہی ندرتیں
کبھی پڑھ کے دیکھ اسے غور سے، مری آگہی کا سبق ہے وہ
تم کو کیا خبر اس کی قافلے معانی کے کتنے کھو گئے اس میں

کس کو اس کا اندازہ حرف ولفظ کا صحرا بے کنار ہے کتنا

فضا ابن فیضی کے تنقیدی شعور اور فنی سلیقہ مندی میں شاعرانہ حسن اور شعری صداقت داخل ہو کر ایک طرف اردو شاعری اور اردو غزل کی روایت میں نئی سمت دکھاتی ہے تو دوسری طرف جدید شعری حسیت سے اپنا فکری رشتہ استوار کرتی ہے۔ ان کا مطالعہ ومشاہدہ وسیع ہے، احساس جمال کا تجربہ بھی خوب ہے۔ وہ اردو، فارسی شاعری اور غزل کی تاریخ اور بتدریج ارتقا سے بھی پوری طرح واقف ہیں۔ غزل کے کلاسیکی رچاؤ اور جدت پسندی سے بھی دلچسپی ہے لیکن ترسیل جذبہ کے مسئلے کو وہ بنیادی اہمیت کا حامل تصور کرتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ترسیل جذبہ کیسے ہو — غزل کہاں کی، رباعی و ریختہ کیسا

تخلیقی عمل میں ترسیل جذبہ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور شاعر وادیب کے لیے کبھی کبھی یہ اہم مسئلہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اس لیے اس کی بڑی معنویت بھی ہوتی ہے، اور کسی بھی ادبی تخلیق میں جو ادبی اور فنی توانائی ہوتی ہے اسی کو افلاطون کی زبان میں موسیقی کی پیدا کردہ مقدس دیوانگی کہا جاتا ہے اور لون جائی نس ترفع (Sublimtion) کا نام دیتا ہے۔ میر تقی میر دل کو کھینچنے والی کشش اور غالب نے غیب سے آنے والے مضامین سے تعبیر کیا ہے۔ علامہ اقبال خون جگر کہتے ہیں جس کے بغیر سارے نقش ناتمام رہتے ہیں۔ فضا ابن فیضی اسے ترسیل جذبہ کا عمل تصور کرتے ہیں۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ فنون لطیفہ (Fine Arts) میں شاعری کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ موسیقی، مصوری اور رقص کی طرح شاعری بھی چوں کہ ایک حسی ترسیل کی طرح ہے اس لیے کہا جاتا ہے کہ شاعری سے الگ الگ افراد پر الگ الگ قسم کا حسی ردعمل بھی ہوتا ہے اور الگ الگ فن کاروں کے جداگانہ شعری نظریات بھی ہوتے ہیں۔ چوں کہ موسیقی، مصوری اور رقص کے مقابلے میں شاعری تہہ دار، زیادہ ہمہ جہت، سیال اور پیچیدہ ہوتی ہے۔ اس میں اسلوب اور طرز ادا کی انفرادیت کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور شاعر کی شخصیت پر جمالیاتی تصورات کے بھی نمایاں اثرات ہوتے ہیں اور یہ سب مل کر شاعر کو منفرد وممتاز بناتے ہیں، نیز فنی بالیدگی اور ندرت سے بھی ہم کنار کرتے ہیں۔ شاعر میں فکری وفنی شعور وآگہی اور تنقیدی بصیرت کا ادراک بھی ضروری ہوتا ہے اور یہ شاعر وفن کار میں جتنا توانا اور مستحکم ہوگا اس کی شاعری وفن میں اتنی ہی انفرادیت، تہہ داری اور معنویت وہمہ جہتی بھی ہوگی۔

تمام رات بسر ہو گئی غزل لکھتے — ترا خیال بھی حرف بہار جیسا تھا

مری لطافت فن کی بھی داد اسی کو دو — غزل کا روپ بدل کر سنور گیا ہے کوئی

لینا پڑا اسی کے سراپا کا جائزہ — تنقید کر رہا تھا غزل کے رچاؤ پر

غزل دروں بینی کا فن ہے، اور بہترین غزلیہ اشعار داخلی کیفیات کی جلوہ گری سے ہی ترتیب پاتے ہیں۔ یہاں خارجی مسئلہ بھی داخلی تجربہ بن جاتا ہے جب کہ دیگر اصناف شاعری میں خارجی عناصر اور تفصیلات کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ لہٰذا غزل کی شاعری میں شعور ووجدان کا ارتقا ناگزیر ہوتا ہے تاکہ مضمون اور موضوع اپنی معنویت میں پورے طور پر تحلیل ہو جائیں اور جبلتوں اور ارتقائے حیات کی کیفیتوں اور لطافتوں میں شعور، تحت شعور اور لاشعور کی تہہ در تہہ پرتیں غزل کے فکر وفن میں شامل ہو کر فکر وعمل، منطق وفلسفہ، نفسیات وفطرت، جذب واحساس اور آرزوئیں ایسا آمیزہ بن جاتی ہیں جو غزل کے شعر کی روح میں شامل ہو کر ایک جہان معنی کی تشکیل کرتی ہیں۔ فضا ابن فیضی کی غزلوں میں ان مخصوص اوصاف کی موجودگی دراصل ان کے غزلیاتی افکار ونظریات کے تنقیدی وفنی عرفان کی ہی دین ہوتی ہے۔

غزل اردو شاعری کی سب سے مقبول اور توانا صنف شاعری ہے۔ یہ صنف اپنی

نزاکت و لطافت اور بے پناہ اہمیت کے باوجود ہمیشہ سے اعتراض وتنقید کی زد پر رہی ہے۔ جس سے یہ صنف شدت عمل اور ردعمل کا بھی شکار ہوتی رہی۔ یہ اردو تہذیب کی سب سے اہم اور نمائندہ صنف شاعری ہے۔ ایجاز واختصار اس کا خاص مزاج بھی ہے اور حسن بھی اور صدیوں کے تخلیقی تجربات نے اردو غزل کو اردو تہذیب کی سب سے خوبصورت اور مستحکم علامت بھی بنادیا ہے اور آج اردو غزل اردو ادب وشاعری کی سب سے بڑی سچائی بن چکی ہے۔ چنانچہ جہاں کہیں بھی اردو ادب وشاعری کی بات ہوتی ہے اردو غزل سامنے آجاتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ قیامت کے تذکرے میں غزل محبوب کی جوانی بن گئی ہے۔ اس کے علاوہ اردو غزل کی جڑیں ہندوستانی تہذیب سے اتنی گہرائی کے ساتھ پیوست ہیں کہ کسی بھی حال میں اسے الگ کیا ہی نہیں جاسکتا اور اپنی زمین سے یہی وابستگی جب آفاقی قدروں سے جاملتی ہے تو اردو غزل اور اس کی ہندوستانیت سارے عالم پر چھاجاتی ہے اور اردو غزل کا جادو سرچڑھ کر بولنے لگتا ہے۔

یہ صنف آبروئے فنِ شاعری ہے فضا   غزل کہو تو مضامین معتبر باندھو
اے فضا! ایجاز ہے سب سے بڑا وصف غزل   سو کہانی ایک حرف مختصر کا جائزہ
تنہا غزل کی دین ہے یہ تازگی فضا   نغموں کا رس گلوئے فضا میں اتر گیا
نئے شعور نے کی تو شکست وریخت بہت   غزل کے سر پہ ابھی تاج داوری کا ہے

غزل چونکہ انسان کی داخلی کیفیات کے فنی اظہار سے عبارت ہوتی ہے، اور اس کا تمام تر تعلق دلی جذبات وواردات سے ہوتا ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس میں خارجی مسائل کی ترجمانی ممنوع ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس میں حیات وکائنات کے خارجی عناصر وعوامل بھی داخلی تجربہ کی صورت میں پیش کیے جاتے ہیں نیز اس میں غم کائنات غم حیات میں بدل جاتا ہے۔ اس میں ہر دور اور ہر عہد کی عصری حسیت تو ہوتی ہے مگر کسی واقعہ یا خیال کی سپاٹ ترجمانی نہیں کی جاتی کیوں کہ یہ نزاکت ولطافت کا فن ہے اس لیے غزل میں برہنہ گفتاری کی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔ اس میں زندگی کی متحرک ،توانا اور جاندار حقیقتوں کی روح کا احساس جلوہ گر ہوتا ہے اور یہی سبب ہے کہ غزل میں لطیف اشارات وعلائم اور استعارات وتشبیہات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ نیز غزل میں حقائق بھی اپنی مادی شکل میں ظاہر ہونے کے بجائے پرچھائیوں کی صورت میں نمایاں ہوتے ہیں اور یہی پرچھائیاں غزل میں تجسس ،لطافت اور تڑپ پیدا کردیتی ہیں جس میں سوز وگداز بھی ہوتا ہے۔

جب غزل کی خوشبو سے میرے لب مہکتے ہیں   تیری یاد کے غنچے روح میں چٹکتے ہیں
اے فضا اندر کی جانب تھا مرے فن کا سفر   میں خود اپنی ذات کے شام وسحر میں کھوگیا
فلسفے کی نقابوں سے بھی شعریت ،حسن و رومان بن کر جھلکتی رہی
مرے ارباب فکر ونظر نے یہاں ،کی تو ویسے نہ تہذیب جذبات کم

غزل کی صنف فارسی سے اردو میں آئی ہے لیکن اسے فارسی غزل کی نقالی یا اس کا چربہ نہیں کہا جاسکتا۔ اور بقول پروفیسر آل احمد سرور۔ ’’اردو غزل پر فارسی کا اثر بہت گہرا ہے مگر یہ فارسی کا چربہ نہیں، یہ ہندوستانی تہذیب کا ایک جلوۂ صد رنگ ہے۔ چنانچہ اس میں لوک گیتوں کی روایت ،ہندوستان کے موسم ،تہوار ،رسم ورواج ،مجلسی اور تمدنی زندگی کے کتنے ہی نقوش محفوظ ہوگئے ہیں۔‘‘

فضا ابن فیضی غزل کے فعال اور متحرک صنف ہونے پر پورا پورا یقین رکھتے ہیں اور غزل کی موجودہ شکل کو حافظ وغالب کی غزل کی ہی ترقی یافتہ صورت مانتے ہیں۔

وہ جس کو حافظ وغالب کا ذہن چھو نہ سکا   غزل کی حد میں وہ فکر ونکات بھی رکھ دو
میرا ادب ہے عبارت اسی تسلسل سے   نہ تجربوں سے روایت کا سلسلہ ٹوٹا
جمال فن کی قسم روشنی کا ماتم کیا   جو اک چراغ بجھا سیکڑوں چراغ جلے

گرفت میں نہ ابھی تک وہ روح عصر آئی   کچھ اور دامنِ فکر و خیال پھیلاؤ
شوخیِ فن کبھی خاموش بھی رہتی ہے فضا   میں ہوں سرتا بہ قدم بولتے جادو کی طرح
یہ بھی شعری تجربوں کا اک تسلسل ہے فضا   اب غزل جیسی ہے وہ کتنوں کے خوابوں میں نہ تھی

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی ہندوستانی سیاست ومعاشرت اور ادب وشاعری کے لیے بڑی ہنگامہ خیز اور اہمیت کی حامل رہی ہے۔ دو عالمی جنگوں کے پس منظر اور پیش منظر کے طور پر عالمی حالات میں تبدیلی کے ساتھ ہندوستان میں بھی سیاسی ،معاشرتی اور ادبی بیداری نے زور پکڑنا شروع کردیا تھا اور مکمل آزادی کا مطالبہ شدت اختیار کرنے لگا اور اسی ہنگامہ آرائی میں 1936 میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا، اور دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستانی ادب وشاعری میں ایک نیا انقلاب برپا ہوگیا اور ترقی پسند تحریک کے اثرات اردو شاعری وادب پر اتنی تیزی سے نمایاں ہونے لگے کہ اردو ادب وشاعری کا منظرنامہ ہی بدلنے لگا اور ترقی پسند تحریک اردو ادب وشاعری کی اب تک کی سب سے بااثر اور توانا تحریک کی صورت اختیار کرنے لگی اور یہی دور فضا ابن فیضی کا بھی تخلیقی عہد شباب تھا۔ ادب وشاعری سے دلچسپی کے باعث فضا ابن فیضی کی نظر ترقی پسند تحریک کے پورے منظرنامے پر رہی ہے مگر انھیں بہرحال ترقی پسند مارکسی نظریات کا حامل نہیں کہا جا سکتا۔ پھر بھی ادب وشاعری کا زندگی ومعاشرت سے رشتہ ،مقصدیت اور ادب وشاعری میں عصری تقاضوں اور زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں اور بدلتے حالات کی تبدیلیوں کو قبول کرنے کی حد تک وہ اپنے بعض ہم عصر ترقی پسند شعرا سے قریب نظر آتے ہیں لیکن ترقی پسندوں نے تحریک کے بالکل ابتدائی دور میں ادب وشاعری میں روایت سے بغاوت کا جو نظریہ پیش کیا تھا فضا ابن فیضی نے اسے عملی طور پر قبول کرنے سے یکسر انکار کردیا تھا اور غزل کے اس بحرانی دور میں بھی پوری طاقت سے اردو غزل اور اس کی روایت کے دامن کو پکڑے رہے۔ ان کا یہ عمل ان کے فکری ،فنی اور تخلیقی جہاد سے بہرحال کم نہیں تھا۔

میں اپنے دور کے ہر تجربے میں زندہ ہوں   مرے شعور کا ماضی ہے حال میں گم سا
ہیں مری فکر پہ تہمت یہ پرانے الفاظ   ڈھونڈ کر لاؤ نئی آگہی والے الفاظ
ہم تجربوں کی کہنہ روایت سہی فضا   لکھیے غزل تو نت نئے تیور نکالیے
آج بھی غازۂ رخسار غزل ہے یارو   شوخ ترکیبیں ،سبک لہجے رسیلے الفاظ
تجربوں سے نہ چراؤ آنکھیں   یہی تہذیب روایت ٹھہری

1950 کے آس پاس ترقی پسند تحریک کا زور کم ہونے لگا اور 1960 آتے آتے اردو شعروادب میں جدیدیت کو فروغ حاصل ہونے لگا اور جدیدیت میں تجرید اور ابہام کو شاعری وادب کے لیے ضروری تصور کیا جانے لگا اور سماج ومعاشرت کے بجائے فرد اور اس کی ذات کو کلیدی اہمیت دی جانے لگی تب بھی فضا ابن فیضی نے اپنے آپ کو اس ہنگامی صورت حال سے دور رکھتے ہوئے اس نئے ادبی وشعری رجحان کے مثبت ومنفی پہلوؤں کی خاموش افہام وتفہیم کرنے میں لگے رہے اور جس طرح انھوں نے صالح ترقی پسندی کو شعری اور تخلیقی تجربے کے طور پر پسند کیا تھا اسی طرح مثبت جدیدیت کو اپنے مخصوص کلاسیکی رنگ وآہنگ کے ساتھ اختیار کرنے میں کسی تامل کے شکار نہیں ہوئے۔

نہیں پسند اسے یہ علامتی اسلوب   کوئی غزل کہوں سادہ تو پھر سناؤں اسے
یہ نئی نسل اٹھا کر خوش ہے   سیدھی بنیاد پہ ٹیڑھی دیوار
الفاظ اپنی قوت اظہار کھو چکے   اب تجھ پہ کیا حقیقت لفظ وبیاں کھلے

لفظ جسم رکھتے ہیں ان کو اپنے جذبوں کے لمس سے جواں رکھو
سطح بے معنی کی لاکھ برف آلودہ ،ذہن کو تپاں رکھو
چن رہے ہیں کوئلے الفاظ کے ساحل پہ لوگ
کیا میں اب ایسے میں عرضِ فکر وفن سے بھی گیا

فضا ابن فیضی کے رنگ تغزل میں ان کا ذوق جمال، احساس حسن اور تخلیقی وفور اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ان کے شعری پیکروں میں ان کے عشقیہ، جمالیاتی اور رومانی تصورات، فکری اور جذباتی شوخی، احساساتی اور فنی لطافت کے ساتھ صحت مند کلاسیکی قدریں، صالح ترقی پسندی اور مثبت جدیدیت غزل کے عناصر سے مملو ہو کر اس انداز میں ظاہر ہوئی ہے کہ وجدانی اور اخلاقی قدریں ایک وسیع زندگی اور کلچر کی شکل اختیار کر کے ان کی پوری غزلیہ شاعری پر چھا گئی ہیں، جس سے ان کی غزلوں میں ہند ایرانی ثقافت کے دل کی دھڑکن واضح طور پر سنائی دیتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ ان کی غزلوں پر فارسیت یا ایرانیت غالب ہو گئی ہے۔ کیوں کہ ان کی غزلوں میں علائم، تراکیب، بندشیں فکر و خیال یہاں تک کہ زبان و بیان پر بھی فارسیت اور ایرانیت کے اثرات نمایاں طور پر محسوس ہونے لگتے ہیں اور ایسا لگتا ہے فضا ابن فیضی ہندوستانی زبان اردو میں ایرانی تہذیب و ثقافت اور جمالیات کی ترجمانی کرنے لگے ہیں لیکن ان کی تہوں میں جانے اور گہرائی سے غور و فکر کرنے سے پتہ لگتا ہے کہ فضا ابن فیضی دراصل ہند ایرانی ثقافت کی ان جڑوں کی گہرائی سے پوری طرح واقف ہیں جہاں ہند ایرانی تہذیب و ثقافت کے آریائی عناصر ایک دوسرے میں خلط ملط ہو گئے ہیں، اور یہ فضا ابن فیضی کے عمیق تہذیبی مطالعوں کی دین ہے۔

فضا ابن فیضی کے تنقیدی شعور اور ان کی غزلیہ فنی بصیرت میں بھی ہندوستانی ادبی روایات کے ساتھ ساتھ ایرانی شعری روایات اور ایرانی تنقیدی اصول و نظریات کے اثرات یکساں طور پر پائے جاتے ہیں اور ایسا غالباً اس لیے ہے کہ اردو غزل کی روایت میں بڑی حد تک فارسی غزل کی روایت بھی شامل ہے پھر بھی اردو غزل کی اپنی الگ حیثیت ہے جو اسے فارسی غزل سے ممتاز و ممیز کرتی ہے اور اپنی جڑوں سے ہندوستانی ارضیت کو کسی بھی حال میں الگ نہیں ہونے دیتی۔ یہ بات بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ فضا ابن فیضی کی پوری شاعری خواہ غزل، نظم، رباعی کسی بھی صنف یا ہیئت میں ہو ہندوستانی تہذیب، ایرانی تمدن اور عالمی کلچر کی آفاقی قدروں سے عبارت ہے۔ چونکہ اردو، فارسی، سنسکرت اور دیگر ہندوستانی زبانوں کی شاعری میں جسمانی اعضا کی قلمی تصویریں کثرت سے ہوتی ہیں، اور اس کے ڈانڈے ایشیائی شاعری کی قدیم روایات سے ملتے ہیں، جن کی بہترین مثال ہڑپہ، موہن جوداڑو اور اجنتا و ایلورا کی گپھائیں ہیں۔ چنانچہ انھیں عناصر کو فضا ابن فیضی کی غزلوں اور رباعیوں وغیرہ میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ مشرقی ادبیات میں اردو، عربی اور سنسکرت کی شعری روایات کے ذخیرے کو وہ عالمی ادبی اثاثے کے طور پر اپنے ذوق و شوق اور میلانِ طبع کے مطابق استعمال کرتے ہیں اور ان کی روایتی قدروں میں جدت و ندرت کے جوہر کی تلاش کرتے ہیں۔

دادِ فن بھی نہ ملی عرض ہنر سے بھی گیا　　اپنی تہہ میں جو نہ اترا وہ گہر سے بھی گیا
گنگنا اٹھتا ہے اس کی لے پہ غزلوں کا بدن　　انگلیوں میں جب قلم پکڑوں تو شہنائی لگے
نکلوں جو اس کی حد سے تو رستہ ہی بھول جاؤں　　میرا شعور ہی مرے فن کی اساس ہے

جواب روایت ہے عہد میں اپنے تجربوں کی کلید تھی وہ
الگ کسی سطح پر نہیں فکر و فن کے محور نئے پرانے

ہر زبان کی اپنی تہذیب، فطرت اور مزاج ہوتا ہے اور وہ زبان اس کی جملہ کیفیات کے ساتھ شعر و ادب کے ظاہری اور معنوی پیکر میں ڈھل جاتی ہے۔ چوں کہ زبان لچکدار ہوتی ہے اور مزاج تنوع پسند ہوتا ہے اور جہاں ان دونوں کے مناسب امتزاج کا صحیح عرفان ہوتا ہے وہاں تخلیقی و فنی معیار و وقار یقینی ہو جاتا ہے اور ایسا ہونا فنکار میں گہرے اور لطیف تخلیقی شعور کے ساتھ ساتھ تنقیدی شعور کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ فضا ابن فیضی کی شاعری بتاتی ہے کہ وہ اس ہفت خواں سے کامیابی کے ساتھ گزر چکے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے فکر و فن کی عمارت کو چراغاں کرنے کے لیے دوسروں سے چراغ مستعار لینے کے بجائے چراغ سے چراغ جلانے کی رسم کو قائم رکھنے کے لیے مصر ہیں، اس لیے ان کی شاعری نہ اساتذہ کی تقلید ہے اور نہ ہی کوری ترقی پسندی اور نہ ہی لایعنی جدیدیت کی ہی بدمزگی کا شکار ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں جہاں پرانی علامتوں اور تراکیب کو نئے انداز سے استعمال کیا ہے وہیں بہت سی نت نئی تراکیب بھی وضع کی ہیں اور بہت سے نئے استعارات، تشبیہیں اور علامتیں بھی اختراع کی ہیں۔

بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں جدید ٹکنالوجی اور سائنس و حکمت کی تیز رفتار ترقی کے بڑھتے رجحانات و میلانات سے انسانی جذبات کے لطیف اور نازک رشتوں اور مابعد الطبعیاتی تجزیے سے الفاظ کے جذباتی استعمال کے بجائے اس کے خالص سائنسی، تکنیکی اور صارفی استعمال پر زور دیا جانے لگا تھا ایسے میں بہت سارے فنکاروں، ادیبوں اور شاعروں کی طرح فضا ابن فیضی کو بھی تشویش ہوئی تو ایک لفظ شناس شاعر کی طرح انہوں نے بھی زبان و الفاظ کے بڑھتے خالص تکنیکی، سائنسی اور صارفی اور غیر تخلیقی استعمال کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے بڑے موثر انداز میں اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کیا تھا۔

بے نوا لفظوں سے کوئی ان کا دکھ کیا پوچھتا　　جس نے لب کھولے صداؤں کے بھنور میں کھو گیا
ان سے کیا معنویت اپنی سنبھالی جائے　　ٹوٹتے رشتوں کی طرح آج ہیں سارے الفاظ
الفاظ اپنی قوت اظہار کھو چکے　　اب تجھ پہ کیا حقیقت حرف و نوا کھلے

ادب و شاعری میں لفظوں کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور کسی بھی شاعر و ادیب کے تخلیقی اظہار کا ذریعہ الفاظ ہی ہوتے ہیں۔ اگر چہ الفاظ کی حیثیت جسم کی ہوتی ہے اور جذبات روح ہوتے ہیں اور الفاظ میں جذبات ضم ہو جاتے ہیں تو وہ بولنے لگتے ہیں۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ شعر و شاعری میں لفظوں کا بہترین تخلیقی استعمال بھی ایک قسم کا تنقیدی عمل ہوتا ہے اور اس میں بھی شاعر یا فنکار کے تنقیدی شعور کی کارفرمائی شامل ہوتی ہے۔

فن کار ہے تو لفظ کو اس حسن سے برت　　ہو سنگ بھی تو صورت شیشہ دکھائی دے
آج بھی غازۂ رخسار غزل ہیں یارو!　　شوخ ترکیبیں سبک لہجے رسیلے الفاظ
سارا جھگڑا ہے فضا طرز ادا کا ورنہ　　سچ یہ ہے کہ نہ میٹھے ہیں نہ کڑوے الفاظ
لفظ ہوتے ہیں صلیبوں سے زیادہ سفاک　　یہ حقیقت تو قلم سے نہ چھپائی جائے

فضا ابن فیضی زبان کے رموز آشنا، لفظوں کے مزاج داں، زبان و بیان اور اسالیب کے اظہار پر قادر ایک ایسے شاعر ہیں جنھیں اپنے جذبات و احساسات اور تجربات و مشاہدات کے اظہار میں کبھی کسی قسم کی دشواری نہیں ہوتی۔ وہ اپنے جذبات و خیالات کے حساب سے جیسے اور جس طرح سے چاہتے الفاظ و تراکیب اور بندشوں کو استعمال کرتے ہیں، اور اپنے ذوق و وجدان سے کام لیتے ہوئے اسالیب اور لب و لہجے کا پوری ندرت کے ساتھ استعمال بھی کر لیتے ہیں جن سے ان کی شاعری میں الفاظ و تراکیب کی دلکشی، اسلوب کی کشش و انفرادیت اور معنوی حیرت خیزی ان کی معاون بن جاتی ہے اور یہ اسلوب ان کے اندر بے پناہ تخلیقی صلاحیت اور تنقیدی بصیرت سے ہی ممکن ہے۔

■

Dr. M. Naseem Azmi
Domanpura (Kasari)
Maunath Bhanjan - (UP)
Mob.:9795384952

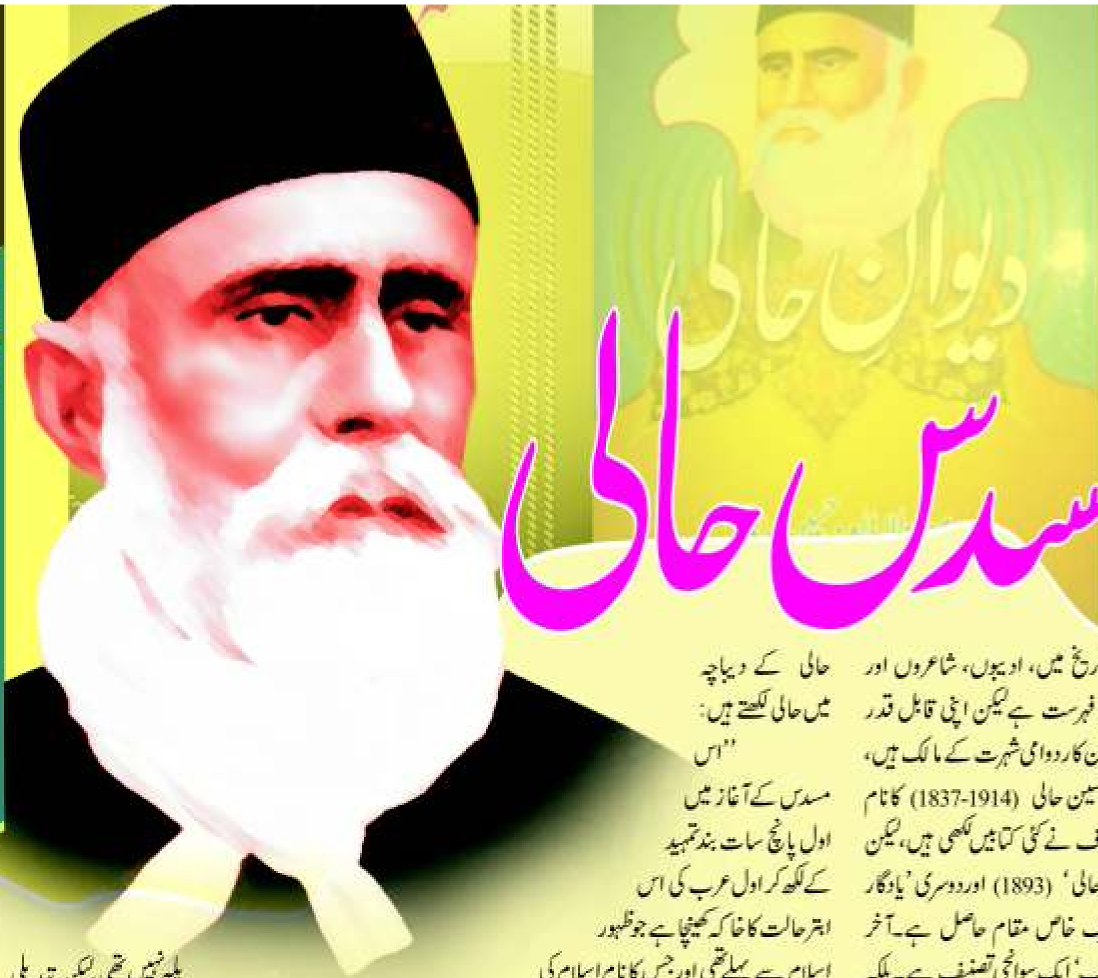

حاذق فرید

مسدس حالی

اردو ادب کی تاریخ میں، ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کی ایک طویل فہرست ہے لیکن اپنی قابل قدر تصانیف کی وجہ سے جوفن کار دوامی شہرت کے مالک ہیں، ان میں مولانا الطاف حسین حالی (1837-1914) کا نام انتہائی اہم ہے۔ موصوف نے کئی کتابیں لکھی ہیں، لیکن ان میں ایک 'دیوان حالی' (1893) اور دوسری 'یادگار غالب' (1897) کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ آخر الذکر کتاب 'یادگار غالب' ایک سوانحی تصنیف ہے۔ بلکہ غالب شناسی کا آغاز اسی کتاب کی دین ہے۔

'مسدس حالی' 'مقدمہ شعروشاعری' ہی کی طرح حالی کے دیوان اردو سے نظم 'مدوجزر اسلام' کو الگ کر کے ایک نئی کتاب شائع کی گئی جسے عام لوگ 'مسدس حالی' کے نام سے جانتے ہیں۔ اسے اردو نظم کا بہترین شاہ کار سمجھا جاتا ہے جو اسلام کے عروج وزوال کا بہترین مرقع ہے اور چودہ سو سال کے مسلمانوں کی مکمل تاریخ سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ ایک آئینہ ہے جس میں مسلمان اپنا ماضی، حال اور مستقبل دیکھ سکتے ہیں۔ اس نظم کو کافی شہرت ملی اور آج بھی مسلم گھرانوں میں بہت شوق اور دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے۔ مذہبی مجلسوں میں؛ اثنائے گفتگو میں اور مولود شریف میں جابہ جا اس کے بند پڑھے جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ نظم 'مدوجزر اسلام' کی تخلیق سرسید احمد خاں (1817-1898) کی تحریک پر 1879 میں ہوئی تھی۔ اس کی تصنیف کا مقصد مسلمانوں کو جھنجھوڑنا تھا تاکہ مسلمان ماضی کی عظمت کو یاد کرتے ہوئے حال کی ذلت کا احساس کریں۔ چنانچہ اس مسدس کے لیے سرسید نے کہا تھا:

''اس کو میں اپنے ان اعمال حسنہ میں سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا تو کیا لایا تو میں کہوں گا حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں۔'' کیونکہ اس مسدس میں ظہور اسلام سے پہلے اور بعد کے حالات کو پیش کیا گیا ہے۔ مسدس حالی کے دیباچہ میں حالی لکھتے ہیں:

''اس مسدس کے آغاز میں اول پانچ سات بند تمہید کے لکھ کر اول عرب کی اس ابتر حالت کا خاکہ کھینچا ہے جو ظہور اسلام سے پہلے تھی اور جس کا نام اسلام کی زبان میں جاہلیت رکھا گیا، پھر کوکب اسلام کا طلوع ہونا اور نبی امی کی تعلیم سے ریگستان کا دفعتاً سرسبز و شاداب ہوجانا اور اس ابر رحمت کا امت کی کھیتی کو ہرا بھرا چھوڑ جانا اور مسلمانوں کا دینی ودنیاوی ترقیات میں تمام عالم پر سبقت لے جانا بیان کیا ہے اور اس کے بعد ان کے تنزل کا حال لکھا ہے اور قوم کے لیے اپنے بے ہنر مند ہاتھوں سے ایک آئینہ خانہ بنایا ہے جس میں آکر وہ اپنے خط وخال دیکھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے اور کیا ہوگئے۔''

(دیباچہ اول' مسدس حالی' صدی ایڈیشن ص 7)

'مقدمہ شعروشاعری' کی طرح 'مسدس حالی' بھی اپنے معاشرے کی تنقید ہے۔ حالی نے شاندار ماضی اور خوں آشام عہد حاضر کے پس منظر میں ایک مستحکم مستقبل کی تشکیل کا خواب دیکھا ہے۔ عہد حاضر کے خوں آشام ماحول ہی نے حالی سے کہلایا ہوگا۔ ''امت پہ تیری آکے عجب وقت پڑا ہے۔'' واقعہ یہ ہے کہ اس نظم کے توسط سے حالی مسلمانوں کے ذہن کو شاندار ماضی کی طرف موڑتے ہوئے انھیں یاد دلانا چاہتے ہیں کہ مسلمان اسلام کے بنائے ہوئے اصولوں کو بھول چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر جگہ ذلیل ورسوا ہورہا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب مسلمان کی حکومت دنیا کی اہم ترین حکومت سمجھی جاتی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ علوم وفنون میں دنیا کی کوئی قوم مسلمانوں کے ہم پلہ نہیں تھی، لیکن تبدیلی آئی اور حاکم سے محکوم ہوگئے۔ چنانچہ حالی مسلمانوں کے اس شاندار ماضی کو ان کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ انھیں اپنی حیثیت کا اندازہ ہو کہ وہ کہاں تھے اور کہاں پہنچ چکے ہیں۔ مسلمانوں کے شاندار ماضی کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

لیے علم وفن ان سے نصرانیوں نے
کیا کسب اخلاق روحانیوں نے
ادب ان سے سیکھا صفاہانیوں نے
کہا پڑھ کے لبیک یزدانیوں نے
ہر اک دل سے رشتہ جہالت کا توڑا
کوئی گھر نہ دنیا میں تاریک چھوڑا

ارسطو کے مردہ فنوں کو جلایا
فلاطوں کو پھر زندہ کرکے دکھایا
ہر اک شہر قریہ کو یوناں بنایا
مزہ علم و حکمت کا سب کو چکھایا
کیا ہر طرف پردہ چشم جہاں سے
جگایا زمانے کو خواب گراں سے

ہوا اندلس ان سے گلزار یکسر
جہاں اُن کے آثار باقی ہیں اکثر

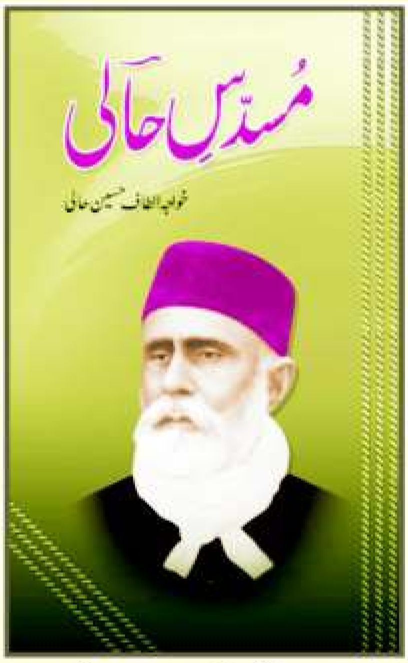

جو چاہے کوئی دیکھ لے آج جاکر
یہ ہے بیت حمرا کی گویا زباں پر
کہ تھے آل عدنان سے میرے بانی
عرب کی ہوں میں اس زمیں پر نشانی

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جاکے دیکھے
مساجد کے محراب و در جاکے دیکھے
حجازی امیروں کے گھر جاکے دیکھے
وہ اجڑا ہوا کروفر جا کے دیکھے
جلال ان کا یوں کھنڈروں میں چمکتا
کہ ہو خاک میں جیسے کندن دمکتا

(مسدس حالی مرتبہ ڈاکٹر اشفاق حسین ص 19-17)

حالی نے پرانی تہذیب وتاریخ کے زیادہ تر حصے کو اپنی آنکھوں سے مسمار ہوتے ہوئے دیکھا تھا، اور اسی مٹتی ہوئی تہذیب وتاریخ پر بے پایاں انسانی ہمدردی، دردمندی اور مایوسی کے ساتھ غیرت قومی پر آنسو بہائے تھے۔ جس طرح اقبال قرطبہ کے کھنڈر کو دیکھ کر آبدیدہ ہوئے اور اس کی بازیابی کے لیے مسجد قرطبہ میں نماز ادا کر کے دعائیں بھی کیں۔

مسجد قرطبہ کے کھنڈر آج بھی اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا ماضی کتنا شاندار گزرا، لیکن آج ہم اپنی عادت وفطرت سے ذلیل وخوار ہو رہے ہیں۔ اس ضمن میں حالی نے اپنے مسدس میں بہت تفصیل سے اپنی بات کو پیش کیا ہے۔ یہاں پر 'مسدس حالی' کے چند بند اور ملاحظہ کریں۔

ہماری ہر اک بات میں سفلہ پن ہے
کمینوں سے بدتر ہمارا چلن ہے
لگا نام آبا کو ہم سے گہن ہے
ہمارا قدم ننگ اہل وطن ہے
بزرگوں کی توقیر کھوئی ہے ہم نے
عرب کی شرافت ڈبوئی ہے ہم نے

نہ قوموں میں عزت نہ جلسوں میں وقعت
نہ اپنوں سے الفت نہ غیروں سے ملت
مزاجوں میں سستی دماغوں میں نخوت
خیالوں میں پستی کمالوں سے نفرت
عداوت نہاں دوستی آشکارا
غرض کی تواضع غرض کی مدارا

نہ اہل حکومت کے ہم راز ہیں ہم
نہ درباریوں میں سرافراز ہیں ہم
نہ علموں میں شایان اعزاز ہیں ہم
نہ صنعت میں حرفت میں ممتاز ہیں ہم
نہ رکھتے ہیں کچھ منزلت نوکری میں
نہ حصہ ہمارا ہے سوداگری میں

(مسدس حالی مرتبہ ڈاکٹر اشفاق حسین ص 28)

سچ تو یہ ہے کہ حالی مسلمانوں کو مرد کامل کی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں، انھیں قوم کی کمزوری اور مفلسی کا بھی احساس ہے رونا تو اس بات پر ہے کہ مسلمانوں کو خود اس کا احساس نہیں ہے۔ وہ اس قدر نکمے اور کاہل ہوگئے تھے کہ محنت ومشقت سے دور بھاگتے تھے۔ وہ اس طرح جی رہے تھے جیسے سب کچھ کر چکے اب صرف مرنا باقی ہے۔ اس صورت حال کے پس منظر میں حالی کہتے ہیں۔

وہ قومیں جو سب راہیں طے کر چکی ہیں
ذخیرہ ہر اک جنس کے بھر چکی ہیں
ہر اک بوجھ بار اپنے سر دھر چکی ہیں
ہوئی کب ہیں زندہ کہ جب مر چکی ہیں
اسی طرح راہ طلب میں ہیں پویا
بہت دور ابھی ان کو جانا ہے گویا

کسی وقت جی بھر کے سوتے نہیں وہ
کبھی سیر ماتم سے ہوتے نہیں وہ
بضاعت کو اپنی ڈبوتے نہیں وہ
کوئی لمحہ بیکار کھوتے نہیں وہ
نہ چلنے سے تھکتے نہ اکتاتے ہیں وہ
بہت بڑھ گئے اور بڑھے جاتے ہیں وہ

مگر ہم کہ اب تک جہاں تھے وہیں ہیں
جمادات کی طرح بار زمیں ہیں
جہاں میں ہیں ایسے کہ گویا نہیں ہیں
زمانے میں کچھ ایسے فارغ نشیں ہیں
کہ گویا ضروری تھا جو کام کرنا
وہ سب کر چکے ایک باقی ہے مرنا

(مسدس حالی مرتبہ ڈاکٹر اشفاق حسین ص 30)

دریں چہ شک، مسدس حالی نے سوئے ہوئے کو جگایا ہے نئی منزل کی طرف افتاں وخیزاں آگے بڑھایا ہے۔ ایک قومی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں اجتماعی زندگی کو متحرک کرنے کا باشعور جذبہ ہے۔ 'مسدس حالی' شعری اعتبار سے جو کچھ بھی ہو علاوہ ازیں حالی کا اخلاص، حالی کی دردمندی، حالی کا دھڑکتا ہوا دل، حالی کا کرب اور حالی کا اضطراب بھی واضح انداز میں پیش ہوا ہے اور یہی وہ پونجی ہے جس کو حالی اپنی قوم کے درمیان تقسیم کردینا چاہتے ہیں۔ اردو کے نامور ناقد و پروفیسر رشید احمد صدیقی کے خیالات تو یہ ہیں کہ:

''حالی اپنی شاعری میں اسلاف اور ان کے کارناموں ہی کا واسطہ نہیں دیتے بلکہ ہندوستان اور اس میں رہنے بسنے والے جس پستی اور غفلت کا شکار نیز بدلے ہوئے حالات میں زندگی اور زمانے کے جن مصائب ومطالبات سے دوچار یا غافل تھے، ان سے بھی عہدہ برآ ہونے کا راستہ دکھاتے اور حوصلہ دلاتے ہیں۔ حالی نے مسلمانوں کو 'مسدس حالی' اور 'شکوۂ ہند' میں ان کا ماضی یاد دلانے کے علاوہ اپنی دوسری نظموں، تقریروں اور تحریروں میں حالی کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی جس دل سوزی اور دلیری سے تلقین کی ہے، ان کے عہد کے کسی دوسرے شاعر نے نہیں کی۔''

(آشفتہ بیانی میری: رشید احمد صدیقی ص 201)

یہاں یہ بات واضح رہے کہ اس عہد کے فن کار نے، اسلام کے افکار واقدار کو اگر ایک طرف مضبوطی کے ساتھ پکڑنے کی کوشش کی ہے تو دوسری طرف سائنسی اور مغربی علوم جو یورپ سے ہندوستان میں منتقل ہو رہے تھے، ان کو بھی سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ گویا اس عہد میں جو نیا ذہن پیدا ہو رہا تھا، وہ دودھاری تلوار تھا ذرا سی بے توجہی ہم کو راہ مستقیم سے بھٹکا سکتی تھی۔ اس صورت حال کا احساس حالی کو بھی تھا لیکن اس موضوع پر حالی کے یہاں وہ شعور پیدا نہیں ہوسکا جس کی پیش کش ڈپٹی نذیر احمد

(1836-1912) کے یہاں ہوئی ہے۔ بہر کیف سائنس نے ایک طرف آزادیِ فکر وخیال کی دنیا کو پیدا کیا تو دوسری طرف مذہبی بیزاری اور مذہبی بے راہ روی بھی پیدا ہوئی۔ حالی اپنے عہد کی ان خصوصیت کا ذکر ان لفظوں میں کرتے ہیں:

''ہمارے اسلاف نے اسلام کا دور دورہ دیکھا تھا جب کہ غیر مذہب والوں کو بھی اس کا اتباع کرنا پڑا تھا اس کے خلاف کوئی دم نہ مار سکتا تھا۔ اس لیے ان کو دین کی حمایت کرنے کی صرف اس قدر ضرورت تھی جس قدر کہ صلح کے زمانے میں فوج رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے مگر ہم کو وہ زمانہ ملا ہے کہ بادشاہ اور رعیت دونوں کے مذہب پر نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ آزادی نے گونگوں تک کو گویا کر دیا ہے، مذہب کا بدلنا کپڑوں کے بدلنے سے بھی زیادہ آسان ہو گیا ہے۔ ادھر کرسچین سلطنت کی مقناطیسی کشش اسے اپنی طرف کھینچتی ہے ادھر سائنس مذہب کا نقش لوگوں کے دلوں سے مٹانا چاہتی ہے۔''

(حیات جاوید از الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو نئی دہلی ص 19)

حالی کو اپنے عہد کے مذہبی انتشار کا گہرا احساس تھا جہاں مذہب لباس کی طرح بدلا جا رہا تھا، اس کو آزادیِ فکر وخیال پر محمول نہیں کر سکتے ہیں اور نہ یہ کوئی بڑی نعمت ہے لیکن حالی اس کو آزادی کی دین سمجھتے ہیں۔

المختصر اس مسدس کی سب سے بڑی خوبی یہ کہ اس کی زبان نہایت ہی صاف ستھری اور عام بول چال کے قریب ہے۔ اس کا ہر بند ایک دوسرے سے زنجیر کی طرح جڑا ہوا ہے اور ساتھ ہی واقعات میں تسلسل بھی برقرار ہے۔ معنوی اعتبار سے اس کا ہر بند کہیں بھی جدا نہیں لگتا، ہر بند ایک مکمل خیال رکھنے کے باوجود ایک دوسرے بند کا محتاج بھی ہے جو ایک نظم کی بڑی خوبی ہے۔ نظم 'مدوجزر اسلام' مسدس کی شکل میں ہے جب کہ حالی سے قبل مسدس صرف مرثیہ کے لیے مخصوص تھا۔ اس ضمن میں انیس ودبیر کے علاوہ مونس خلیق، ضمیر اور دلگیر کا نام انتہائی اہم ہے جنھوں نے مسدس کو مرثیہ کے لیے استعمال کیا لیکن حالی نے اپنی نظم 'مدوجزر اسلام' کے لیے مسدس کا ایسا تجربہ کیا کہ مسدس اور حالی لازم وملزوم ہو گئے۔ مسدس کا نام آتے ہی 'مسدس حالی' نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ حالی نے تین مسدس لکھے (1) نظم مدوجزر اسلام (2) مسدس تحفۂ خدمت (3) مرثیہ حکیم محمود خاں لیکن جو شہرت 'مسدس حالی' کو ملی وہ دوسرے مسدس کو نہیں۔ یہ نظم حالی کا غیر فانی شاہ کار ہے۔ فنی اعتبار سے مسدس میں کچھ ایسی خوبیاں ہیں جو آج بھی اردو شاعری کے لیے مشعل راہ بن سکتی ہیں۔ عروضی اعتبار سے بھی نظم 'مدوجزر اسلام' اور اس کا ضمیمہ دونوں ہی بحر متقارب مثمن سالم کی ہیئت میں ہے جس کی وجہ سے نظم رواں دواں اور شستہ ہے کہیں کہیں پر جب مسلمانوں کو لعنت وملامت کرنے لگتے ہیں تو کچھ خراب سا محسوس ہوتا ہے لیکن اس کی وجہ ان کے جذبات ہیں کیونکہ یہ نظم حالی کے جذبۂ خلوص اور مذہبی تڑپ کا پرتو ہے۔ اس کتاب کے بارے میں سرسید احمد خاں لکھتے ہیں:

''یہ کہنا بالکل مناسب ہوگا کہ اس کتاب نے ہماری صنف نظم میں ایک نیا دور پیدا کر دیا۔ اس کی عبارت کی خوبی اور صفائی اور روانی کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ امر کچھ کم تعجب خیز نہیں کہ اتنا مہتم بالشان مضمون اس قدر واقعیت کی پابندی کے ساتھ اور بلا اغلاق ومبالغہ اور تمثیل واستعارہ کے جو کہ ہماری شاعری کی جان اور شاعروں کا ایمان ہے اور پھر اس قدر موثر اور فصیح طریقے سے بیان کیا جائے۔ اس کے بہت سے بند تو ایسے ہیں کہ ان کو پڑھ کر سخت سے سخت دل کے لوگ بھی بغیر آنسو بہائے نہیں رہ سکتے۔ کیوں نہ ہو جو چیز دل سے نکلتی ہے وہ ضرور دل میں گھر کر جاتی ہے۔''

(تاریخ ادب اردو: رام بابو سکسینہ ترجمہ مرزا عسکری حصہ نظم ص 412)

اردو شاعری کی تاریخ میں دو کتابیں ایسی ہیں جن کو الہامی کتاب قرار دیا گیا ہے۔ ایک 'دیوان غالب' جس کو ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے الہامی کتاب کہا ہے۔ اور دوسری کتاب 'مسدس حالی' ہے جسے ڈاکٹر رام بابو سکسینہ الہامی کتاب قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں: ''مولانا حالی کی یہ سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ مشہور تصنیف ہے۔ یہ ایک نیا دور پیدا کرنے والی کتاب ہے، اس کی مقبولیت اب بھی ویسی ہے جیسی کہ پہلے تھی۔ یہ ایک الہامی کتاب ہے، اور اس کو تاریخ ارتقائے ادب اردو میں ایک سنگ نشان سمجھنا چاہیے۔ یہ ایک نیا ستارہ ہے جو اردو کے افق شاعری پر طلوع ہوا۔ اس سے ہندوستان میں قومی اور وطنی نظموں کی بنیاد پڑی، اور اس نے یہ ثابت کر دیا کہ ایسی پر اثر اور پر درد نظموں کے واسطے مسدس نہایت موزوں چیز ہے......... اس میں اسلام کی گذشتہ عظمت، مسلمانان سابق کے کارنامے، ان کے بلند خیالات اور اولوالعزمیاں اور برخلاف اس کے زمانہ موجود میں ان کی پستی وزوال اور سستی وکاہلی کا ذکر ہے۔ آخر میں مسلمانوں سے اپیل کی گئی ہے کہ تاریخ عالم میں جو ان کا مرتبہ پہلے تھا اب پھر اس کو حاصل کرنے کے لیے کمر ہمت باندھیں۔''

(تاریخ ادب اردو: رام بابو سکسینہ حصہ نظم ص 12-410)

اس ضمن میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے بھی بجا فرمایا ہے:

''کیا یہ کہنے کی، یہ بتانے کی حاجت ہے کہ اب تک کتنے ایڈیشن پر ایڈیشن اس کے نکل چکے، کتنی محفلوں میں اس کے بند پڑھے جا چکے وعظ کی کتنی مجلسوں کو یہ گرما چکے۔ کتنے ادبی امتحانوں کے نصاب میں داخل ہو چکا، کتنے بوڑھوں کی، جوانوں کی، لڑکوں کی زندگی میں انقلابی اثر پیدا کر چکا، کتنوں کو رلا کر یہ رہا، کتنوں کے دل اس نے بڑھائے، غرض مقبولیت کے جتنے بھی معیار ہو سکتے ہیں سب کے لحاظ سے آج اُسے دیکھ لیجیے۔ اصل سوال یہ ہے کہ اس آن کا اور اس شان کا، اس جمال کا اور اس کمال کا اردو میں کوئی اور مسدس ہے بھی۔''

(مسدس حالی صدی ایڈیشن ص 31)

بہر حال یہ حقیقت ہے کہ حالی نے 'مسدس حالی' کے ذریعے اسلام کے روشن ماضی کو خوبصورت انداز میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور جدید ذہن وفکر کے پس منظر میں اسلامی افکار واقدار کی بنیادیں مضبوط کرنے کی بھی سعی کی ہے۔ باوجود اس کے کہ موصوف نے اس کتاب کی تخلیق کے لیے کوئی بہت بڑا دعویٰ پیش نہیں کیا یا انھیں یہ بھی احساس نہیں تھا کہ وہ قوم کے لیے کار نمایاں انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے صرف حکم کی بجا آوری کی ہے۔ ناصح کی بات دل میں گھر کر گئی اور ایک ٹوٹی پھوٹی نظم تیار ہو گئی اور ناصح سے شرمندہ ہونا نہ پڑا۔ میں یہ گفتگو حالی کی مندرجہ ذیل رائے پر ختم کرتا ہوں۔

مولانا حالی اپنی نظم 'مدوجزر اسلام' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

.........''ہمارے ملک کے اہل مذاق ظاہراً اس روکھی پھیکی سیدھی سادی نظم کو پسند نہ کریں گے، کیوں کہ اس میں یا تو تاریخی واقعات ہیں یا چند آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ ہے یا جو آج کل قوم کی حالت ہے اس کا صحیح صحیح نقشہ کھینچا گیا ہے، نہ کہیں نازک خیالی ہے نہ رنگین بیانی، نہ مبالغہ کی چاٹ ہے، نہ تکلف کی چاشنی ہے .... مگر اس نظم کی ترتیب مزے لینے اور واہ واہ سننے کے لیے بھی نہیں کی گئی ہے۔ اب اگر دیکھیں اور پڑھیں اور سمجھیں تو ان کا احسان ہے ورنہ کچھ شکایت نہیں۔''

(مسدس حالی مرتبہ اشفاق حسین ص 8)

■

Dr. Hazique Fareed
Moh: Bari Dargah (River Side)
At & Post: Nawada
Distt: Nawada- 805110 (Bihar)

محمد قاسم انصاری

اردو شاعری میں رام اور رام کتھاؤں کی روایت

اردو میں رام چندر جی سے محبت و عقیدت کے اظہار کی روایت کوئی نئی نہیں۔ علامہ اقبال نے اپنی ایک نظم میں شری رام چندر جی کو 'امام ہند' قرار دیا ہے۔ اقبال کی اس لاثانی نظم کے بعض اشعار کا حوالہ کثرت سے دیا جاتا رہا ہے۔ ان اشعار کی مقبولیت صرف علمی و ادبی حلقوں تک محدود نہیں بلکہ مختلف سیاسی و سماجی حلقوں میں بھی یہ اشعار زبان زد ہیں۔ اقبال کی نظر میں رام چندر جی ہندوستان جیسی قدیم و مقدس سرزمین کے امام ہیں۔ وہ ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی زندگی اور ان کی شخصیت میں مثالیت کے وہ رنگ جلوہ گر ہیں جو انھیں کسی اور میں نظر نہیں آتے۔ ان کی صداقت، ایمانداری اور شجاعت ملک کی عوام اور انسانیت کے لیے مشعل راہ ہے۔ اس لیے ہندوستان کے تمام فرقوں و مذاہب کے لیے وہ محترم ہیں۔ رام چندر جی پر لکھی گئی اقبال کی یہ شاہکار نظم ان تمام پہلوؤں کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔

لبریز ہے شراب حقیقت سے جام ہند
سب فلسفی ہیں خطہ مغرب کے رام ہند
یہ ہندیوں کے فکر فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بام ہند
اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نام ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند
اعجاز اس چراغ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے میں شام ہند
تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں جوش محبت میں فرد تھا

اقبال سے قبل اردو ادب بالخصوص اردو شاعری میں ان کی عظمت کا ذکر کثرت سے ملتا ہے لیکن اقبال نے رام جی سے عقیدت و محبت کے اظہار کے لیے جس ڈکشن، لفظیات، جذبے کا سہارا لیا ہے اس کی نظیر اردو شاعری میں کم ملتی ہے۔ اپنی اس اچھوتی نظم میں انھوں نے امام ہند اور چراغ ہدایت کے ان تمام مثالی اوصاف کو اجاگر کر دیا ہے جن پر اہل ہند ناز کرتے ہیں۔ اقبال اپنے عہد کے بڑے فلسفی، معتبر دانشور اور عظیم شاعر ہیں۔ ان کی نظر صرف فکر اسلامی تک محدود نہیں بلکہ ان کی نظر دنیا کے ہر ڈسکورس (Discourse) پر رہی۔ اپنے عہد کے ہر علمی، ادبی، مذہبی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی Discourse کو انھوں نے بخوبی سمجھا۔ اسلام اور دنیا کے دیگر مذاہب و فلسفہ کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ اس لیے اقبال جیسے عظیم شاعر کی قلم سے رام چندر جی کی عظمت پر نظم کا تخلیق کیا جانا محض اتفاق نہیں ہو سکتا۔ بہت غور و فکر کے بعد انھوں نے رام چندر جی کے لیے 'امام ہند اور چراغ ہدایت' جیسے الفاظ کا استعمال کیا۔ اقبال کی یہ نظم اہل علم اور اہل نظر دونوں سے سنجیدگی اور غور و فکر کی متقاضی ہے۔

دراصل رام کا کردار ایک مثالی کردار تصور کیا جاتا ہے۔ وہ حسن عمل اور حسن اخلاق دونوں کا پیکر ہیں۔ وہ ہر روپ اور ہر رشتے میں ایک مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔ بحیثیت ایک فرمانبردار فرزند، شوہر، بڑے بھائی۔ زندگی کے ہر شعبے میں ان کا یہ کردار مثالیت کے رنگ بھرا ہے۔ وہ مریادا پرشوتم کہے جاتے ہیں۔ علامہ اقبال ان کے اس متحرک کردار سے بے حد متاثر ہوتے ہیں اور پھر انھیں ایک مثالی ہیرو قرار دیتے ہیں۔ رام جی کو امام ہند قرار دینے میں ان کی نظر یقیناً کئی پہلوؤں پر رہی ہوگی۔ پہلا یہ کہ قرآن کریم میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ''اللہ نے مختلف قوموں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے انھیں میں سے نبیوں کو بھیجا'' قرآن کریم میں جگہ جگہ اس امر کا ذکر ملتا ہے۔ اس لیے یہ ممکن نہیں کہ ہندوستان جیسے عظیم ملک میں کوئی نبی نہ بھیجا گیا ہو۔

دوسرا پہلو یہ کہ اقبال کی نظر تاریخ ہند پر بھی رہی ہوگی۔ مغلیہ عہد میں رام چرتر مانس کے تراجم سنسکرت سے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں ملتے ہیں۔ تلسی داس نے رام چرتر مانس کی تخلیق سولہویں صدی میں کی۔ یہ زمانہ اکبر کا تھا۔ اکبر نے دین الٰہی کی تحریک چلائی تھی جس کا بڑا مقصد ہندوستان کے مختلف مذاہب کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنا تھا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے اکبر نے مختلف مذاہب کی مقدس کتابوں اور ان کے مذہبی گرنتھوں کے تراجم کا سہارا لیا۔ اکبر نے 'دارالترجمہ' کے نام سے باقاعدہ ایک ادارہ کی داغ بیل ڈالی۔ اس ادارے کے تحت بالمیکی، رامائن اور تلسی رامائن کے تراجم کیے گئے۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے اپنی کتاب 'منتخب التواریخ' میں ایسے کئی تراجم کی نشاندہی کی ہے۔ جہانگیر کے زمانے میں 'رامائن ہجی' اور 'رامائن ایک قافیہ' کے نام سے ترجمے ہوئے جنھیں خاصی شہرت ملی۔

رام پر اس بحث کے ساتھ رام کے معنی پر بھی غور کیا

جائے کیونکہ 'رام جی' سے متعلق یہ پہلو خاصا دلچسپ اور اہم ہے۔ رام سنسکرت زبان کا لفظ ہے جس کے معنی چمتکاری، منوہر اور پاپیوں کا ناش کرنے والا درج کیے گئے ہیں۔ ہندو عقیدے کے مطابق رام چندر جی وشنو کے دسویں اوتار ہیں۔ بعض کے نزدیک ساتویں اوتار ہیں۔ اوتار کے کم و بیش معنی اردو میں پیغمبر کے ہی ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ جدید ہندی اردو لغت میں رام کے معنی 'تین کا ہندسہ' ہے جو علم عروض کا ایک وزن ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ رام فارسی زبان کا بھی لفظ ہے۔ فارسی اور سنسکرت کے لسانی اور تاریخی رشتے جگ ظاہر ہیں۔ فارسی میں 'رام کردن' کے معنی 'کسی کو اپنا مطیع یا فرمانبردار بنانا' ہے۔ فارسی اور سنسکرت سے قطع نظر رام کی روایت پارسیوں کے یہاں بھی ملتی ہے۔ پارسیوں نے اپنے ماہ اور ایام کے اسما رام کے نام پر رکھے ہیں۔ ان کے کلینڈر کے مطابق اکیسویں دن کا نام رام ہے۔ اقبال کی نظر یقیناً ان پہلوؤں پر رہی ہوگی۔ گرچہ اقبال شری کرشن سے بھی متاثر ہیں اور انھوں نے ان سے بھی اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے لیکن رام چندر جی پر لکھی گئی ان کی اس نظم کو جو شہرت ملی وہ کسی اور کو نہیں۔

اردو میں 'رامائن' اور رام کتھاؤں کی ایک طویل روایت ملتی ہے۔ ان رام کتھاؤں کو گھر گھر تک پہنچانے اور انھیں قبول عام بخشنے میں اردو ادیبوں، شاعروں اور اداروں کا بہت نمایاں کردار رہا ہے۔ اس حوالے سے سر فہرست نام منشی نول کشور اور ان کے پریس 'مطبع نول کشور' کا ہے۔ اس پریس سے رامائن کے مختلف ایڈیشن شائع ہوئے۔ 1860 میں رام چرتر مانس کا پہلا ایڈیشن یہیں سے شائع ہوا اور پھر متعدد ایڈیشن شائع ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ بالمیکی رامائن کا قدیم ترین ترجمہ 1894 میں نول کشور پریس سے ہی شائع ہوا۔ اس کے مترجم گیانی پرمیشر دیال مختار تھے۔ اس نثری ترجمہ کا منظوم ترجمہ دوارکا پرشاد افق لکھنوی نے اردو میں 'مکمل رامائن بالمیکی' کے نام سے کیا اور یہ ترجمہ 1921 میں شائع ہوا۔ اسی طرح شنکر دل فرحت کا ترجمہ 'ادبھت رامائن' کے نام سے خاصا مشہور ہوا۔ 1870 میں اس کی اشاعت ہوئی، اردو میں رامائن کے متعدد تراجم ہوئے۔ یہ ترجمے نظم اور نثر دونوں میں ملتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ ان کے مترجمین صرف ہندو ادیب و شاعر تھے بلکہ مسلم ادیبوں اور شاعروں نے بھی رامائن کے ترجمے کیے۔ ان میں سے بیشتر کے ماخذ تلسی داس کی رامائن 'رام چرتر مانس' ہے لیکن ایسا نہیں کہ بالمیکی کی رامائن کو نظر انداز کر دیا گیا۔ بالمیکی رامائن کے بھی اردو تراجم شائع ہوئے اور یہ سلسلہ یونہی جاری رہا۔ بعد کے تراجم میں 'تلسی کرت رامائن' انتہائی خصوصیت کی حامل ہے۔ گرچہ یہ ناگری رسم الخط میں ہے اور اس کی زبان ہندی ہے لیکن اس رامائن کو حرف بہ حرف اردو میں منتقل کیا گیا۔ اس کے مترجم منشی سوامی دیال تھے۔ دوارکا پرشاد افق نے بالمیکی رامائن ترجمہ نظم اور نثر دونوں میں کیا غرض یہ کہ تراجم کا یہ سلسلہ مختلف ادوار میں جاری رہا۔ معروف اردو ادیب و قلمکار علی جواد زیدی نے اردو میں ان تراجم کی تعداد تقریباً 300 بتائی ہے۔ ان میں سے کئی تراجم کو خاصی شہرت ملی۔ علی جواد زیدی نے منشی جگناتھ خوشتر کی رامائن کو مقبول ترین ترجمہ قرار دیا ہے۔ خوشتر کی اس رامائن کا ایک نمونہ ملاحظہ کیجیے۔

پدر کے سامنے آئے شتاباں
ز بس حال پدر دیکھا پریشاں
زمیں پر اس طرح تھا شاہ کا حال
ہما غلطاں ہے گویا بے پر و بال
کہا تب رام نے با اشکباری
کہ ہے کس واسطے یہ سوگواری
جو ہو تقصیر میری، وہ عطا ہو
بجا لاؤں جو صاحب کی رضا ہو

اسی طرح شنکر دیال فرحت کی رامائن کا ایک سین ملاحظہ کیجیے جو ادبھت رامائن سے ماخوذ ہے۔ یہ سین اس وقت کا ہے جب سیتا جی ہنواس کی خبر سنتی ہیں تو ان کا کیا حال ہوتا ہے۔

جناب جانکی نے جب سنا حال
تو جوش گریہ سے آنکھیں ہوئیں لال
نہ تھا ضبط شکیبائی کا یارا
ہوئی شوہر کی فرقت ناگوارا

دوارکا پرشاد افق کا منظوم ترجمہ کچھ اس طرح ہے۔ سُپ نکھ کے جب دونوں بھائی مارے جاتے ہیں تو وہ راون کے دربار میں کس طرح فریاد کرتی ہے؟ ملاحظہ کیجیے۔

روئی، واویلا مچائی، سر دھنا نالے کیے
پیش راون جا کے لنکا میں ہوئی محو فغاں
شاہ راون نے سنی جب سُپ نکھا کی سرگذشت
بہر خونریزی کمر بستہ ہوا مثل کماں

اردو کے معروف ادیب و شاعر پروفیسر مظفر حنفی نے رامائن کے تراجم پر مبنی ایک جامع فہرست تیار کی ہے جس سے اردو میں رامائن کی روایت پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ یہ فہرست کچھ اس طرح ہے:

(1) رامائن نظم اردو: شنکر دیال فرحت، 1866
(2) ادبھت رامائن: شنکر دیال فرحت، 1870
(3) تلسی کرت رامائن بہار: بانکے بہاری لال بہار، 1886
(4) تلسی کرت رامائن فرحت: شنکر دیال فرحت، 1886
(5) رامائن مہر: سورج رامائن مہر، 1914
(6) تلسی کرت رامائن خوشتر: جگن ناتھ خوشتر، 1924
(7) رامائن ایک قافیہ منظومہ افق: دوارکا پرشاد افق لکھنوی
(8) پشپک رامائن (بطرز نوٹنکی): ہری نرائن شرما ساحر
(9) منظوم رامائن: نفیس خلیلی
(10) رامائن تلسی کرت اصل مع منظوم ترجمہ: سورج پرشاد تصور
(11) مسدس رامائن: بنواری لال شعلہ
(12) رام کہانی: نفیس خلیلی
(13) رام گیتا: شیو پرساد راحل
(14) رام لیلا: منشی رام سہائے تمنا
(15) رامائن: مہدی نظمی

مذکورہ فہرست پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر مظفر حنفی لکھتے ہیں:

''یہاں میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مذکورہ بالا تصنیفات و تراجم میں بعض ترجمے اصل کے مطابق ہیں اور بعض میں مترجم نے حسب ضرورت تلخیص کر لی ہے۔ ان منظوم تراجم میں بطور خاص منشی شنکر دیال فرحت کی رامائن 'رامائن منظوم' جگناتھ خوشتر کی 'رامائن خوشتر' بانکے بہاری لال' کی 'رامائن بہار' سورج نرائن مہر کی 'رامائن مہر' دوارکا پرشاد افق کی 'رامائن ایک قافیہ' اور نفیس خلیلی کی 'رامائن منظوم' شعری محاسن اور ادبی شان کے اعتبار سے ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔'' (نقد ریزے: مظفر حنفی، ص 194)

کم و بیش ہر عہد کے اردو ادیبوں و شاعروں نے رامائن کے واقعات کو اپنی شاعری میں جگہ دینے کی کوشش کی ہے۔ زمانہ قدیم سے لے کر دور جدید تک رامائن کے واقعات شعرا و ادبا کے لیے ایک خاص توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ ان واقعات کی ادبی و مذہبی حیثیتیں مسلم ہیں۔ رامائن ایک طویل قصہ ہے۔ اس قصہ کی طوالت کے علاوہ اس کے کسی ایک پہلو کو لے کر بھی نظمیں لکھی گئیں۔ ان میں ظفر علی خاں و دیگر شعرا کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ ظفر علی خاں نے اس مقصد کو ''ایک رشی کے داغ جگر کی کہانی راجہ دشرتھ کی زبانی' کے عنوان سے قلمبند کیا ہے جس کا یہ شعر بے حد مقبول ہے۔

نقش تہذیب ہنود اب بھی نمایاں ہے اگر
تو وہ سیتا سے ہے، لکشمن سے ہے، اور رام سے ہے

اسی طرح درگا سہائے سرور جہان آبادی کی 'سیتا جی کا اصرار' پنڈت دتا تریہ کیفی کی 'بن باس کی صبح' تلوک چند محروم کی سیتا ہرن اور شاد عارفی کی دسہرا استان اور پنڈت

برج نارائن چکبست کی 'رامائن کا ایک سین' خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں چکبست کی رامائن کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کی نظم 'رامائن کا ایک سین' کو بے پناہ شہرت حاصل ہوئی اور اس نظم کو ایک شاہکار تصور کیا جاتا ہے۔ اس نظم میں مراثی انیس و دبیر کی جھلک نمایاں ہے لیکن چکبست نے اپنے تخلیقی ذہن کے بھی بہترین نمونے پیش کیے ہیں۔ بطور مثال ان کی اس نظم کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں جس سے آپ چکبست کی انفرادیت اور مذکورہ خوبیوں کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ چکبست کے ان اشعار میں اس منظر کو پیش کیا گیا ہے جب رام چندر جی کو بنواس ہوتا ہے۔ بنواس میں جانے سے پہلے رام چندر جی کی اپنی ماں سے جو بات چیت ہوئی چکبست نے اسے بہت موثر، دلکش اور جذباتی انداز میں قلمبند کیا ہے اور اس میں ایک ادبی روح پھونک دی ہے۔ ملاحظہ کیجیے اس نظم کے چند اشعار

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام
راہِ وفا کی منزل اول ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام
دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام
اظہار بے کسی سے ستم ہوگا اور بھی
دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال
خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال
سکتہ سا ہوگیا ہے یہ ہے شدتِ ملال
تن میں لہو کا نام نہیں، زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں، کوئی تصویرِ سنگ ہے

ان ابتدائی اشعار کے بعد اب ذرا اس نظم کے آخری اشعار ملاحظہ کیجیے

تاثیر کا طلسم تھا معصوم کا خطاب
خود ماں کے دل کو چوٹ لگی سن کے یہ جواب
غم کی گھٹا سے ہٹ گئی تاریکی عتاب
چھاتی بھر آئی ضبط کی باقی رہی نہ تاب
سرکا کے پاؤں گود میں سر کو اٹھا لیا
دونوں کے دل بھر آئے ہوا اور ہی سماں
گنگ و جمن کی طرح آنسو ہوئے رواں
ہر آنکھ کو نصیب یہ اشک وفا کہاں
ان آنسوؤں کا مول اگر ہے تو نقد جاں
ہوتی ہے ان کی قدر فقط دل کے راج میں
ایسا گہر نہ تھا کوئی دشرتھ کے تاج میں

رامائن کی شعری روایت میں چکبست کے مذکورہ اشعار کا متبادل نایاب نہیں تو کمیاب ضروری ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی ایک نظم یا تخلیق کسی بھی ادیب وشاعر کی شہرت کی ضامن ہوسکتی ہے۔ ماہرین یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر وہ کچھ نہ کرتے تو صرف اسی ایک شعر، نظم یا تخلیق سے ان کی ادبی شان میں فرق نہ آتا اور وہ ممتاز ہوتے۔ غالب سے لے کر عہد جدید تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس حقیقت کا اطلاق چکبست پر بھی ہوتا ہے۔ چکبست کچھ نہ کرتے تب بھی وہ اپنی اس ایک نظم سے اردو دنیا میں مقبول ہوتے کیونکہ اس نظم میں وہ تمام کمالات اور ادبی جواہر موجود ہیں جو ایک لازوال ادبی وشعری تخلیق کے لیے درکار ہوتے ہیں۔

اردو میں رام اور رامائن کی اہمیت کو اجاگر کرنے کا یہ سلسلہ عہد حاضر میں بھی جاری ہے۔

اردو میں رام اور رام کتھاؤں کی روایت دو صورتوں میں ملتی ہے۔ پہلی مذہبی اور دوسری ادبی، مذہبی صورت سے مراد وہ رام کتھا جو ہمیں مذہبی گرنتھوں، کتابوں اور لوگوں کے عقائد کے حوالے سے ملتی ہے۔ ان میں فقط ہندو علماء ہی نہیں بلکہ مسلم علما و دانشور بھی شامل ہیں جو نہ صرف رام کے احترام کی تلقین کرتے ہیں بلکہ وہ خود ان کے مثالی کردار سے متاثر نظر آتے ہیں۔ دوسرے وہ ادیب وشاعر جنھوں نے شری رام کو اپنے شعر و ادب میں نمایاں جگہ دی۔ یہاں بھی صرف ہندو ادیب وشاعر نہیں بلکہ مسلم ادیبوں وشاعروں نے رام کو اپنے سینے سے لگایا اور انھیں اپنے شعر و ادب میں نمایاں جگہ دی ہے۔ اردو کی مختلف نثری وشعری اصناف میں اس کی لاتعداد مثالیں بکھری پڑی ہیں جو اردو زبان کے سیکولر مزاج کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔ اردو زبان اپنی ابتدا سے ہی سیکولر مزاج واقع ہوئی ہے اور اس کی یہ خوبی اظہر من الشمس ہے۔ اس لیے اس زبان کو ایک مخصوص فرقہ یا طبقے کی زبان قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس زبان نے ملک میں بسنے والی مختلف قوموں کے عقائد، رسم و رواج، طرز معاشرت، ان کے تہواروں اور ان کے فکر و فلسفہ کو بحسن وخوبی پیش کیا ہے۔ زبان کی اس خوبی کی بنا پر ہی اردو کو گنگا جمنی تہذیب کی علامت قرار دیا جاتا ہے۔ قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے فروغ میں اس زبان کے کردار سے کوئی انکار نہیں کرسکتا ہے۔ ہندی ادب تلسی رامائن اور بالمیکی رامائن پر بجا طور پر فخر کرسکتا ہے لیکن اردو ادب اس فخر سے عاری اور خالی ہو ایسا ہرگز نہیں، اردو کے لاتعداد ادیبوں وشاعروں نے ہر عہد میں رام اور رام کتھاؤں کے موضوع کو نہایت عقیدت واحترام سے شامل کیا ہے۔ ان کے مثالی اوصاف و کردار سے اپنے ادبی شہ پاروں کو مزین کیا ہے۔ زمانۂ قدیم سے لے کر تاحال رام جی اردو زبان و ادب میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں جس سے ہر فرد انسانیت، سچائی، ایمانداری، وفاداری اور نیکی کی راہ پر چلنے کا درس لے سکتا ہے۔ اس لیے رام کو محض ایک فرقہ یا طبقے تک محدود نہیں کیا جاسکتا کیونکہ کسی بھی زبان کا اعلیٰ ادب انفرادی نہیں ہوتا۔ اس کے اندر ان عناصر کی تلاش کی جاسکتی ہے جنھیں قومی کہا جاتا ہے۔ ہندوستان کے قومیت کے تصور میں رام ہیں اور وہ بھی 'چراغ ہدایت' کی شکل میں۔ ان کے مذکورہ اوصاف سے کسی کو انکار نہیں۔ رام اور رام کتھائیں نفرت کا نہیں، بلکہ آپسی میل محبت کا درس دیتی ہیں۔ محبت، سچائی اور ایمانداری کی راہ پر گامزن رہنے کی تلقین کرتی ہیں، وہ لوگ جو زمین پر فساد، جھگڑے، انسانیت پر ظلم اور نفرت پھیلاتے ہیں ایسے لوگوں کے خلاف لڑنے کا درس یہ رام کتھائیں بھی دیتی ہیں۔ اس لیے رام کے اس آفاقی پیغام کو ایک فرقہ یا طبقے تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔

زمانۂ قدیم سے لے کر تاحال رام جی اردو زبان و ادب میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں جس سے ہر فرد انسانیت، سچائی، ایمانداری، وفاداری اور نیکی کی راہ پر چلنے کا درس لے سکتا ہے۔ اس لیے رام کو محض ایک فرقہ یا طبقے تک محدود نہیں کیا جاسکتا کیونکہ کسی بھی زبان کا اعلیٰ ادب انفرادی نہیں ہوتا۔ اس کے اندر ان عناصر کی تلاش کی جاسکتی ہے جنھیں قومی کہا جاتا ہے۔ ہندوستان کے قومیت کے تصور میں رام ہیں اور وہ بھی 'چراغ ہدایت' کی شکل میں۔ ان کے مذکورہ اوصاف سے کسی کو انکار نہیں۔ رام اور رام کتھائیں نفرت کا نہیں، بلکہ آپسی میل محبت کا درس دیتی ہیں۔ محبت، سچائی اور ایمانداری کی راہ پر گامزن رہنے کی تلقین کرتی ہیں، وہ لوگ جو زمین پر فساد، جھگڑے، انسانیت پر ظلم اور نفرت پھیلاتے ہیں ایسے لوگوں کے خلاف لڑنے کا درس یہ رام کتھائیں بھی دیتی ہیں۔ اس لیے رام کے اس آفاقی پیغام کو ایک فرقہ یا طبقے تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔

■

Dr. Qasim Ansari
Asst Prof. Dept of Urdu, BHU
Ajagara, Varanasi221005 (UP)

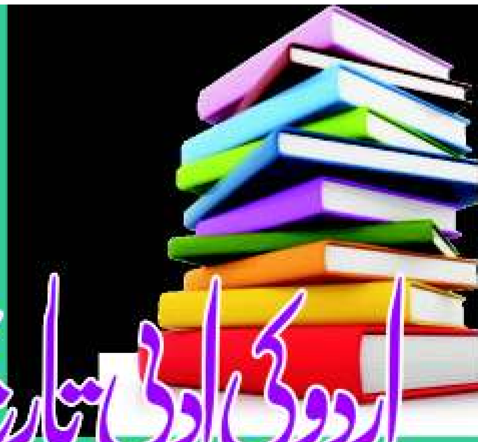

نکولن کے وی

اردو کی ادبی تاریخ نگاری میں غیر مسلم ادبا کا حصہ

اردو میں ادبی تاریخ نگاری کی داستان زیادہ طویل نہیں۔ اردو میں ادبی تاریخ نگاری کا سہرا رام بابو سکسینہ کے سر باندھا جاسکتا ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اس سے پہلے اردو میں لسانیات اور ادبی تاریخ نگاری کا رواج نہ تھا۔ لسانیات اور ادبی تاریخ نگاری کا آپس میں کوئی واسطہ نہیں ہے مگر اردو کی حد تک ان دونوں میدانوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے یعنی تذکرے۔ اردو میں تنقید نگاری کے ابتدائی نقوش تذکروں میں ملتے ہیں۔ تذکرہ ایک خاص ادبی صنف ہے جس میں شعرا کی زندگی کے مختصر حالات، منتخب اشعار نیز کلام پر سرسری رائے زنی ملتی ہے۔ تذکروں میں زمانے کے معیار کے پیش نظر اصلاح سخن کا عمل بھی جاری رکھا جاتا ہے مگر سوائے سیر المصنفین تذکرے کے باقی تمام تر سرمائے شاعری پر مرکوز ہیں۔

آب حیات میں اردو کے لسانی نکات و مسائل پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ آزاد نے اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا اور اس کے مختلف ادوار کی تاریخ زمانہ حال کی روش کے معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے پہلی مرتبہ قلم بندی کی۔ میر کے تذکرہ میں ریختے کی تاریخ اور اس کے اقسام۔ دکن میں ریختے کا چلن، اصلاح اشعار اور تنقید زبان کا بیان ہے۔ آب حیات (محمد حسین آزاد)، گل رعنا (مولوی عبدالحی)، شعرالہند (مولوی عبدالسلام) جیسے تذکروں نے ادبی تاریخ کی پیش رفت کے لیے مواد فراہم کیے ہیں۔ الغرض تذکروں کو اردو ادب میں لسانیات، تنقید، اور تاریخ تینوں کا مشترکہ نخوگ قرار دیا گیا ہے۔

اردو میں باقاعدہ ادبی تاریخ نگاری کی ابتدا ایک ہندو کائستھ خاندان سے تعلق رکھنے والی ادبی شخصیت رام بابو سکسینہ کے قلم سے ہوئی ہے۔ سکسینہ کی تصنیف 'تاریخ ادب اردو' اردو کی پہلی باقاعدہ اور زبردست ادبی تاریخ مانی جاتی ہے۔ یہ کتاب اس زمرے کی سب سے پہلی کاوش ہے جس میں اردو ادب کے ابتدائی زمانے سے لے کر تصنیف کے زمانے تک کی ادبی تاریخ بہت ہی فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ درج کی گئی ہے۔ تاریخ ادب اردو 1927 میں پہلی مرتبہ چھپ کر منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب کی تصنیف کی وجہ مصنف کی زبانی ہی سن لیجیے:

''اس کتاب کی تصنیف کی اصلی غرض یہ ہے کہ ادب اردو کی تدریجی ترقی کا خاکہ، زمانہ قدیم سے لے کر زمانہ حال تک کا مع مشہور شعرا اور ناثروں کے مختصر حالاتِ زندگی اور ان کے کلام اور تصانیف پر ایک مختصر تنقید، کھینچا جائے۔'' (تمہید، تاریخ ادب اردو، ص 19)

اس سلسلے میں ایک طبقہ کے تعلقات کو دوسرے طبقہ کے تعلقات کے ساتھ اور ایک فرد کے تعلقات فرد کے تعلقات کے ساتھ وضاحتاً جوڑتے ہوئے مصنف نے متن کی ترتیب دینے کی کوشش کی ہے۔ رام بابو سکسینہ کی اس سعی جمیلہ کا یہ خوش گوار نتیجہ نکلا کہ اردو کے لیے ادبی تاریخ نگاری کا ایک باضابطہ معیار قائم ہوتا گیا۔ اپنی اس کتاب میں مختلف تحریکات اور طرز ہائے ادا کی ابتدا، بتدریج ترقی اور ان کے انحطاط و زوال کے اسباب کی نشاندہی کی گئی ہے اور اس دور کے تاریخی حالات و واقعات کا خاص لحاظ بھی رکھا گیا ہے۔ ادبی تخلیقات اور تحریکات کی پرکھ کے دوران مصنف کے سامنے اس زمانے کے تنقیدی اصول بھی رہنما رہے ہیں۔ ادبی تخلیق کاروں اور دبستانوں کے ساتھ غیر جانب دارانہ رویہ برتنا ادبی تاریخ نگار کا فرض اولین تو ہے۔ رام بابو سکسینہ اس تاریخ نگاری کے ذمے دارانہ کام سے عہدہ برآ ہونے میں ایسے کامیاب نکلے ہیں کہ شاید ان کا غیر جانبدارانہ رویہ دیکھ کر مصنف آب حیات شرمندہ ہو جائیں۔

رام بابو سکسینہ کی اس مہم میں پروفیسر سینٹس بیری (Saintsberry) کی کتاب 'مختصر تاریخ انگریزی علم و ادب' رہنما ثابت ہوئی۔ سکسینہ خود فرماتے ہیں کہ ''مختصر تاریخ انگریزی علم و ادب' کے طرز پر میں نے یہ کتاب ترتیب دی ہے۔'' (تمہید، ص 19)

ناول، افسانہ جیسی دیگر اصناف نثر کی طرح تاریخ نگاری کی یہ صنف بھی انگریزی ادب کی رہین منت ہے۔ ایک عظیم مقصد کے تحت سکسینہ نے اپنی یہ کتاب انگریزی میں لکھی تھی۔ انگریزی میں لکھنے سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اردو سے نابلد جماعت بھی اردو ادب سے کما حقہ واقف ہو جائے۔ مصنف یہ بھی چاہتے تھے کہ لوگوں کے دلوں

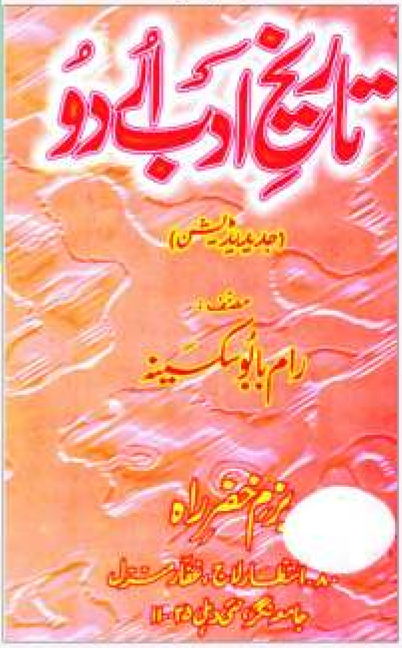

میں ادب اردو کے مطالعے کا صحیح ذوق پیدا ہو جائے جو ان کی رائے میں ہندو مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہوگا۔ سکسینہ یہ بھی چاہتے تھے کہ غیر مسلم اور غیر اہل زبان لوگوں کو شوق دلایا جائے کہ وہ اس قصر عالی کو جس کی اس نے صرف بنیاد ڈالی ہے تکمیل تک پہنچا دیں۔ سکسینہ کی انگریزی کتاب 1927 میں منظر عام پر آئی اور 1929 میں اس کا اردو ترجمہ مرزا محمد عسکری صاحب بی اے سابق ہیڈ ٹرانسلیٹر، گورنمنٹ آف انڈیا نے کیا۔ تاریخ ادب اردو پر تقریظ لکھتے ہوئے سر تیج بہادر سپرو صاحب، ایم۔ اے۔ ایل ایل ڈی، کے سی ایس آئی نے جن اہم باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ بھی یہاں توجہ طلب ہے۔ سپرو صاحب رقم طراز ہیں:

''افسوس ہے مگر صفائی سے کہنا پڑتا ہے کہ شمالی ہند کی دیسی زبانوں کو جس قدر ہمارے نام نہاد نیشنلزم (قوم پرستی) کے غلط مفہوم نے جو دراصل کمیونلزم (فرقہ بندی) کا مرادف ہے، نقصان پہنچایا اتنا اور کسی چیز نے نہیں

پہنچایا۔ ہمارے صوبے کے اکثر مقامات پر ایسے ہندو گریجویٹوں اور انڈر گریجویٹوں کو دیکھ کر سخت افسوس آتا ہے جن کا یہ خیال ہے کہ ہندی کی ترقی کے لازمی طور پر یہ معنی ہیں کہ یہ دلوں سے اس زبان اور ادب کی محبت اور خیال بالکل نکال دیا جائے جس میں خود ان کے بزرگ ابھی دو ہی ایک نسل کا زمانہ گزرا کہ کمال رکھتے تھے۔ اسی طرح ایسے مسلمانوں سے مل کر بھی نہایت صدمہ پہنچتا ہے جو ہندوؤں کی زبان اردو سے بے توجہی اور بے پروائی کی شکایت سے تو لبریز ہیں لیکن اپنا کوئی قابل تعریف کارنامہ اس میدانِ ادب میں نہیں پیش کر سکتے جس کا محافظ خاص وہ اپنے تئیں سمجھتے ہیں تعلیم و تربیت اور علمی مذاقوں کے اختلاف نے جو گذشتہ بیس پچیس سال کے عرصے میں بہت بڑھ گیا ہے، فرقہ بندی کے مضر اثرات کو اور قوی کر دیا ہے جس سے سرچشمۂ اتحاد مسموم اور ایک دوسرے کے خیالات کو صحیح طور پر سمجھنا معدوم ہوتا جاتا ہے۔''

(تقریظ،ص 22-21)

سکینہ جس ہندو مسلم اتحاد کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی تاریخی کتاب کی تصنیف کا بیڑا اٹھایا تھا اس کی اہمیت، اولیت اور ناگزیریت سے سپرو صاحب اور دیگر دور اندیش لوگ متفق تھے۔ آج کل ہندوستان میں اردو کی بدحالی کی خاص وجہ مذکورہ بالا اقتباس میں مندرجہ حقیقت سے چشم پوشی ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

مورخین ادب کے لیے ایک شرط یہ ہے کہ ان کا ذخیرہ علم وسیع ہو اور تنقیدی شعور تیز ہو۔ سکینہ ان دونوں امور میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اسی تنقیدی شعور اور بصیرت کا نتیجہ ہے کہ ہنوز نظر انداز شدہ شاعر نظیر اکبرآبادی کو پردۂ خفا سے باہر نکال کر روشناس عام کیا۔ آج کل اس پر جو توجہ مبذول کی جا رہی ہے اس کا ڈانڈا سکینہ کی کاوش سے ملایا جا سکتا ہے۔ نظیر اکبرآبادی کی عوامی شاعری کو اس زمانے کے معیار کے مطابق خواص پسند لوگ شاعری میں شمار کرنے کو بھی تیار نہیں تھی۔

سکینہ صاحب نے نظیر اکبرآبادی کو حقیقی شاعر، جدید رنگ کے پیش رو اور اردو کا شیکسپیئر قرار دے کر اس کی پہچان کا بیج بو دیا جو آگے چل کر ایک بڑے تناور درخت کا روپ اختیار کرتا چلا گیا۔ نظیر اکبرآبادی کی اردو خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے سکینہ صاحب رقم طراز ہیں:

''نظیر نے ایسے الفاظ سے بہت فائدہ اٹھایا جن کو شعرا ادنیٰ اور بازاری سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ چونکہ ایسے الفاظ مروجہ مضامین شعر سے میل نہیں کھاتے۔ اس وجہ سے عام شعرا ان کو معمولی اور سوقیانہ سمجھ کے ترک کرتے ہیں اور شعر میں ان کو داخل کرنا خلاف شان سمجھتے ہیں۔ نظیر نے کمال کیا کہ ایسے الفاظ کو اپنے اشعار میں جگہ دی اور دنیا کو دکھلا دیا کہ ان میں وہ خوبیاں چھپی ہوئی ہیں جن کو ظاہر بین نگاہیں نہیں دیکھ سکتیں۔'' (تاریخ ادب اردو، ص 261)

تاریخی وقوعات کے بیان میں چند غلطیاں سکینہ کے ہاتھوں بھی سرزد ہوئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعری کی تاریخ لکھتے وقت انھوں نے ثانوی ماخذات پر تکیہ کیا۔ شعرا کے حالات زندگی، سنین اور منظوم تخلیقات سے متعلق تذکروں کے بیان کے پیش نظر انھوں نے اپنی کتاب کے لیے مواد فراہم کیا اور دکنی ادبیات کو کما حقہ اہمیت نہ دی گئی۔ البتہ اس کی کتاب کو اس جانب سے پہلی کوشش ہونے کے باعث یہ کمزوریاں صرفِ نظر کی جا سکتی ہیں۔

سکینہ کی کتاب کے پانچ سال بعد 1932 میں ایک اور ادبی تاریخ کی کتاب منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کا مصنف بیلی ٹی گراہم (Bailey T Grahame) ہے۔ 120 صفحات پر مشتمل یہ انگریزی کتاب بہ عنوان 'A History of Urdu Literature' لندن میں چھاپی گئی۔ A History of Urdu Literature بہت جامع و مانع تصنیف ہے۔ اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف کتاب اردو زبان و ادب پر مہارتِ کاملہ رکھنے والا ایک شخص ہے اور ان کا مطالعہ کافی وسیع ہے۔ اس کتاب میں تاریخ کا بیان 105 صفحات تک محدود ہے بقیہ 15 صفحات کتابیات (Bibliography)، ضمیمہ (Appendix)، اور اشاریہ (Index) پر مشتمل ہے۔ اردو بحور، اصناف سخن، اردو ادب کے ابتدائی زمانہ یعنی دکنی دور، دلی لکھنؤ کے شعرا کی خدمات کے جائزے کے بعد مصنف نے نثر کی جانب رجوع کیا ہے۔ نثری حصے میں فورٹ ولیم کالج اور انیسویں صدی کے نثر نگار پر ایک نظر ڈالنے کے بعد نئے عہد کے نثر نگار یعنی حالی، آزاد، محمد اسماعیل، اکبر، سرور، وغیرہ کے ادبی کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب میں کل 241 نمبرات کے تحت مختلف ادبی اشخاص اور ان کی تخلیقات پر رائے زنی کی گئی ہے۔ آخری نمبر سکینہ کی کتاب کی طرح اقبال پر جا کے ختم ہوتا ہے۔

'A History of Urdu Literature' اپنے اختصار و ایجاز کے باوجود اردو ادب کے ابتدائی زمانے سے لے کر علامہ اقبال تک کے عہد کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اس سے پہلے کے مورخین عبداللطیف اور سکینہ کے کام کو Bailey نے جدید تاریخ نگاری کے پیش نظر آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ سکینہ کے علی الرغم اس میں دکنیات کے آئینے میں اردو ادب کو پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بیلی (Bailey) نے اپنی کتاب میں برملا اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ''فارسی آمیز اردو سے کئی گناہ بہتر دیسی اردو (Urdu Indegenous) ہے۔'' بیلی کی تاریخ کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ وہ غیر معروف شعرا کے کارناموں کو بھی زیر بحث لائے ہیں اور یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ادب کے عام ڈھانچے کی تعمیر میں کمتر شعرا کا رول بھی رہا ہے۔ بیلی کی کتاب اصل میں ایک مقالے کی تلخیص کی طرح مختصر اور جدا جدا Titles اور اجتہادانہ اور سائنسی نکتہ نظر کی حامل ہے۔

ان دونوں مورخوں میں اردو کی ادبی تاریخ نگاری سکینہ کے کارنامے سے زیادہ ثروت مند ہوئی۔ دونوں کی تصانیف کو سامنے رکھ کر ہم بلاشبہ کہہ سکتے ہیں کہ سکینہ کا مقرر کردہ معیار ہی باقی رہ گیا ہے۔ بعد میں جتنی ادبی تاریخی کتابیں اردو میں لکھی گئیں سب کی سب سکینہ کی کتاب کا چربہ ہیں۔ یہاں تک کہ جمیل جالبی کی کتاب میں بھی اس کے اثرات نمایاں ہیں۔ سکینہ کے بعد جتنی تاریخی کتابیں لکھی گئیں پوری کی پوری مختصر تاریخ ادب ہیں۔ جمیل جالبی اور ایک دو مصنفین کی کتابیں اس سے استثنا ہیں۔

محترمہ سیدہ جعفر اور گیان چند جین دونوں نے مل کر ایک اور ادبی تاریخ لکھی ہے مگر اس کتاب میں گیان چند جین یوں رقمطراز ہیں کہ اس کتاب کا معتد بہ حصہ سیدہ جعفر صاحبہ کی دین ہے۔ ایک طویل عرصہ گزرنے پر بھی ادبی تاریخ نگاری کے میدان میں کوئی دوسرے غیر مسلم ادبا نظر نہیں آ رہے ہیں۔ تخصیص کے اس زمانے میں شاید یہ تصور ہو چلا ہے کہ مکمل تاریخ لکھنے کے بجائے الگ الگ اصناف پر قلم اٹھانا بہتر ہوگا۔

یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ تاریخ نگاری میں مصنف کے مذہب یا منصب یا عقیدے کو کوئی دخل نہیں ہے کیونکہ مورخ ہمیشہ مورخ رہتا ہے حالانکہ چند تاریخی کتابیں مسخ کی گئی ہیں۔ چند تاریخی باتیں توڑ مروڑ کر لکھی گئی ہیں۔ مورخ کو ہر حال میں غیر جانبدار ہونا چاہیے۔ زبان کو مذہبی عینک سے دیکھنا بھی غلط ہے کیونکہ دنیا کی کسی بھی زبان پر نظر ڈالی جائے تو یہ پتہ چلے گا کہ زبان کا وظیفہ خیالات کا اظہار ہے۔ اس سے بڑھ کر کچھ نہیں۔

■

Dr. Nakulan K.V
Associate Prof of Urdu
Sree Sankaracharya University of Sanskrit
Regional Centre, Naduvathur. P.O: Koyilandy,
Kerala, Kozhikode - 673620 (Kerala)

اسما

نظیر اکبرآبادی اور ہندوستانی تیوہار

پوری اردو شاعری میں زبان و بیان پر بھرپور دسترس، الفاظ کے استعمال پر قدرت اور تہذیبی عناصر کی پیشکش کی جادوگری میں نظیر اکبر آبادی، میر، سودا، ذوق، غالب، آتش، ناسخ، انیس اور جوش ملیح آبادی کی صف میں شامل ہیں۔ معمولی موضوعات کو غیر معمولی انداز میں پیش کرنے کا ہنر ان کی انفرادیت کی روشن مثال ہے۔ انہوں نے اپنی خداداد صلاحیت اور فکری وفنی امتیازات کی بنا پر شہرت دوام حاصل کی اور اپنے آپ میں ایک نابغہ روزگار کہلانے میں حق بجانب ٹھہرے۔

نظیر اکبرآبادی کی بنیادی حیثیت ایک شاعر کی ہے۔ انھوں نے انسانی زندگی کے تمام شعبۂ حیات کا نہ صرف گہرائی وگیرائی اور باریک بینی سے مطالعہ ومشاہدہ کیا بلکہ انسان کو کامیاب اور خوشگوار زندگی جینے کا سلیقہ و ہنر بھی سکھایا۔ ان کی شاعری گل وبلبل، عشق ومحبت کے فسانے سے بہت آگے انسانی زندگی کی مکمل تصویر کشی سے عبارت ہے۔ جس میں ہر مکتبۂ فکر، طبقے اور مذہب کے ادنیٰ واعلیٰ، امیر وغریب سبھی لوگ اپنے خدوخال کو بآسانی دیکھ سکتے ہیں۔

نظیر نے غزلیں بھی لکھیں اور نظمیں بھی، لیکن جس چیز نے نظیر کو لافانی اور بے نظیر گردانا وہ ان کی نظمیں ہیں۔ جس کا اعتراف مختلف نقادوں اور دانشوروں نے بھی کیا۔ اس سلسلے میں پروفیسر مجنوں گورکھپوری نظیر کو ان کی نظموں کے بل پر زندہ تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سب سے پہلی بات جو پہلی ہی نظر میں معلوم ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر قصائد ومثنویات کو نظم میں شمار نہ کیا جائے اور نظم کی اصطلاح کو جدید معنوں میں استعمال کیا جائے تو نظیر اکبرآبادی اردو کے پہلے نظم نگار ہیں۔''

درج بالا اقتباس اس بات کا غماز ہے کہ نظیر کی نظمیں انھیں اردو شاعری میں ایک مستقل دور کا بانی قرار دینے میں معاون ومددگار ہیں۔ نظیر کو اپنے وطن سے والہانہ لگاؤ اور اس کی مٹی سے بے لوث محبت تھی۔ جس کی بنا پر اگر انھیں خالص ہندوستانی شاعر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ہندوستان کی زندگی، تہذیب وثقافت، رسم و رواج، تیوہار اور مقامی رنگ و آہنگ وغیرہ ان کی شاعری کے لازمی جز ہیں۔

نظیر اردو کے پہلے ایسے شاعر ہیں جن کا کلام پڑھ کر ہندوستان کے حالات، طرز زندگی، رسم و رواج اور تیوہار کے متعلق تمام معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ ہندوستان مختلف تہذیبوں کا گہوارہ کہا جاتا ہے۔ جہاں مخصوص کرداروں پر مشتمل مختلف طبقات اور جماعتیں ہیں جن کے مابین اتحاد واتفاق، بھائی چارگی، آپسی رواداری اور قومی یکجہتی کی بہترین مثال تیوہاروں، تقریبوں جلسوں اور میلوں ٹھیلوں کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ جو عوام کی تفریح طبع اور مسرت کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی آئینہ دار بھی ہے۔ جس کے ذریعہ انسانی جذبات واحساسات، رسم ورواج، رہن سہن اور طرز معاشرت سے مکمل آگاہی ہو جاتی ہے۔ اردو شعرا نے کثرت سے ان موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے مگر اکثریت ایسے شاعروں کی ہے جن کے یہاں یہ عناصر کلی طور پر ناپید ہیں۔ اس معنی میں نظیر اکبرآبادی کی شاعری کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ان کے یہاں ہندوستانیت کے اجزا صرف ملے جلے ہی نہیں بلکہ پوری طرح رچے بسے نظر آتے ہیں۔

جس دور میں نظیر نے شاعری کی ابتدا کی وہ عہد ہندو مسلم اتحاد کی بہترین تصویر پیش کرتا ہے۔ ہندو، مسلمان اور دیگر مذاہب کے لوگ ایک دوسرے کے تیوہاروں، رسم و رواج اور میلوں ٹھیلوں میں شریک ہوتے، ایسے ہی ماحول میں نظیر کی شاعری پھلی پھولی اور پروان چڑھی جس کا رنگ وآہنگ تا عمر نظیر کی شاعری پر چھایا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم نظیر کی شاعری کا غائر مطالعہ کرتے ہیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کی شاعری یک رخی نہیں بلکہ کثیر الجہات اور ہمہ گیر ہے۔

تیوہار خواہ کسی بھی مذہب وملت سے متعلق ہو ہر شخص بلا امتیاز مذہب وملت نہ صرف اس میں شریک ہو سکتا ہے بلکہ اپنی خوشی کا اظہار بھی کر سکتا ہے۔ یہ تیوہار انسانی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ نظیر کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی نظموں کے ذریعہ عوام کو مذہبی کٹرپن کے محدود دائرے سے نکال کر انسانیت کے بلند مرتبے پر گامزن کیا۔ نتیجتاً ہندوستانی نہ صرف سماجی نوعیت کے میلوں ٹھیلوں، صوفیوں کی عام محفلوں، عرسوں اور مزاروں کی زیارت میں شرکت کرنے لگے۔ بلکہ بلا امتیاز و مذہب و ملت ایک دوسرے کے مذہبی تیوہاروں میں شریک ہو کر باہمی اتحاد اور رواداری کا ثبوت دینے لگے۔ اسی جذبے کے تحت اردو کے مسلمان شعرا نے ہولی، دیوالی، راکھی، جنماشٹمی، شیوراتری جیسے تیوہاروں اور شری رام چندر اور گرونانک جیسی شخصیات کی شان میں نظمیں لکھیں۔

نظیر کی سب سے اہم خوبی ان کی بے تعصبی، رواداری اور وسیع المشربی ہے۔ جس نے تفریق کی تمام

دیواریں ڈھا دیں۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب ان کی نظر میں یکساں ہیں۔ انہوں نے جہاں عید، شب برات، بقر عید، حضرت سلیم چشتی پر جوش و ولولہ خیز نظمیں لکھیں وہیں ہولی، دیوالی، بسنت، نانک، اور کنھیا جی وغیرہ کی توصیف میں بھی ایسی ایسی نظمیں لکھیں جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی مذہبی ہندو کے دل سے نکلے ہوئے وہ نغمے ہیں جو بے پناہ عقیدت و ارادت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جن تیوہاروں، میلوں ٹھیلوں، عرسوں اور تقریبوں پر نظمیں کہی ہیں وہ پر اثر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ میں بے مثال ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے یہاں عید، بقر عید، شب برات پر لکھی گئی نظموں سے کہیں زیادہ ہولی، دیوالی، بسنت، مہادیو جی، اور شری کرشن پر لکھی نظمیں ان کے جذبہ عقیدت کی مظہر ہیں۔

'عید' سے متعلق نظیر اکبر آبادی نے تقریباً 4 نظمیں لکھیں جس میں اس تیوہار کی مذہبی حیثیت پر تو کوئی خاص توجہ نہیں ملتی البتہ اس پہلو سے قطع نظر صرف امید و رجا، وصل و ملاقات اور میل ملاپ کا پہلو نظر آتا ہے۔ نظیر نے تیوہاروں پر نظم لکھتے وقت انسانی نفسیات کا بھی گہرا مطالعہ و مشاہدہ کیا ہے اور جس نقطہ نظر کی عکاسی کی اس میں سب برابر کے شریک رہے۔ یعنی ہر شخص اپنے مقام و مرتبے اور اپنی ذہنی سطح سے اس تیوہار کو اپنے مقصد کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ کسی کو تیوہار کے بہانے شراب و کباب وافر مقدار میں میسر ہوتی ہے تو کسی کو محبوب سے وصال، وہیں زاہد و عابد کے لیے یہ دن بھی ریاضت و عبادت کا دن ہے۔ اس بات کو نظیر نے بڑے حسین انداز میں پیش کیا ہے۔

ہے عابدوں کو طاعت و تجرید کی خوشی
اور زاہدوں کو زہد کی تمہید کی خوشی
رند عاشقوں کو ہے کئی امید کی خوشی
کچھ دلبروں کو وصل کی کچھ دید کی خوشی
ایسی ہے شب برات نہ بقر عید کی خوشی
جیسی ہر ایک دل میں ہے اس عید کی خوشی

نظیر چونکہ ایک عاشق مزاج اور خوش طبع شاعر بھی ہیں لہٰذا ان کی پوری توجہ محبوب سے ملاقات اور اس کے حسن کی خوبصورتی بیان کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ عید پر لکھی گئی نظموں میں ایک نظم محبوب سے کیے گئے شکوے شکایت سے پر ہے۔ یعنی عید کے دن بھی نظیر محبوب کے دیدار سے محروم ہیں۔ اس موقع پر ایک عاشق کے دل میں جو خیالات اس محرومی کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں اس کی پوری عکاسی 'نظم عید' میں ابتدا تا آخر بیان کی گئی ہے۔ ایک بند دیکھیے:

یوں لب سے اپنے نکلے ہے اب بار بار آہ
کرتا ہے جس طرح کہ دل بے قرار، آہ
عالم نے کیا ہی عیش کی لوٹی بہار آہ
ہم سے تو آج بھی نہ ملا وہ نگار آہ
ہم عید کے دن بھی رہے امید وار، آہ

اس طرح پوری نظم شکایتوں کا پلندہ ہے۔ یہ نظم تیوہاروں سے متعلق نظیر کے نقطہ نظر کی وضاحت کے حوالے سے بے حد اہم ہے۔ نظیر نے نظمیں لکھتے وقت اس کو مزید دلچسپ بنانے کے لیے جہاں نادر تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال کیا ہے وہیں جگہ جگہ مزاح و ظرافت کا بھی سہارا لیا ہے۔ جس سے قاری کی دلچسپی برابر قائم رہتی ہے اور بعض اشعار اور بند تو ایسے دلچسپ ہیں کہ ان کو پڑھ کر نہ صرف بے ساختہ لب مسکرا اٹھتے ہیں بلکہ شاعر کی خوش مزاجی پر داد دینے کو جی چاہتا ہے:

کوئی مست پھرتا ہے جام شراب سے
کوئی پکارتا ہے کہ چھوٹے عذاب سے
کلا کسی کا پھولا ہے لڈو کی چاٹ سے
چکاریں جی میں بھرتے ہیں نان و کباب سے
ایسی نہ شب برات نہ بقر عید کی خوشی
جیسی ہر ایک دل میں ہے اس عید کی خوشی

'عید' کی طرح 'شب برات' بھی مسلمانوں کا ایک اہم تیوہار ہے۔ جس پر نظیر نے 4 نظمیں قلم بند کیں۔ جو عقیدت کے جذبات سے سرشار ہیں۔ اس کے مختلف پہلوؤں پر نظیر نے اپنے منفرد اور دلکش انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ وہ اپنے مقصد اور نقطہ نظر کی وضاحت نہایت سیدھے سادے مگر پر زور اور ناقابل تردید دلائل و براہین کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ نظیر نے شب برات کو 'مردوں کے روح کی مددگاری' کا سبب قرار دیا ہے۔ مردوں کے ساتھ ساتھ زندہ لوگوں کے لیے بھی یہ تیوہار سود مند ہے۔ کیونکہ انھیں بھی مختلف قسم کے عمدہ و لذیذ حلوے کھانے کو مل جاتے ہیں۔ نظم شب برات کے پہلے بند میں اس تیوہار کی مقصدیت پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے:

کیوں کر کرے نہ اپنی نموداری شب برات
چلپک، چپاتی، حلوے سے ہے بھاری شب برات
زندوں کی ہے زباں کی مزے داری شب برات
مردوں کی روح کی ہے مددگاری شب برات
لگتی ہے سب کے دل کو غرض پیاری شب برات

نظیر الہ آبادی نے اپنی نظموں میں امیر و غریب کی تفریق کو بھی موضوع گفتگو بنایا ہے۔ دونوں کی تصویریں نظم 'شب برات' میں اس موثر انداز میں پیش کی ہیں کہ ایک حساس دل تڑپ اٹھتا ہے اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ آخر سماج میں یہ طبقاتی کشمکش کیوں ہے؟ آج کے دن بھی ان کو غربت و افلاس سے نجات نہیں مل پاتی۔ اس حقیقت کو نظیر نے یوں عیاں کیا ہے:

اور مفلسوں کی ہے یہ تمنا کی فاتحہ
دریا پہ جا کے دیتے ہیں بابا کی فاتحہ
بھٹیاری کے تنور پہ نانا کی فاتحہ
حلوائی کی دکان پہ دادا کی فاتحہ
یاں تک تو ان پہ لاتی ہے ناچاری شب برات

اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ نظیر نے اپنی نظموں میں امیر و غریب، ادنیٰ و اعلیٰ اور مفلس و کنگال سب ہی کی حقیقت پر مبنی مرقعے پیش کیے۔ یہاں یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ اس موقع پر انہوں نے اس تفریق کو ختم کرنے کے لیے کوئی حل نہیں دیا بلکہ انسانیت کے دونوں پہلوؤں کو اس طور پر پیش کیا کہ قاری خود نتیجہ نکالنے پر مجبور ہو جائے۔ تلقین و تنبیہ کا یہ رویہ پر اثر بھی ہے اور لائق داد بھی۔

نظیر نے تیوہاروں کے باب میں جہاں مختلف رنگ رلیوں کا ذکر کیا ساتھ ہی اس سے ہونے والے نقصانات کی بھی نشاندہی کی۔ یعنی تیوہاروں کے مثبت پہلوؤں کے ساتھ ساتھ منفی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی۔ ساتھ ہی اس موقع پر ایک دوسرے کو ایذا پہنچانے اور دشمنی نکالنے کے مسئلے کی طرف بھی توجہ دلائی۔ اس طرح کی نظموں میں انسانی ہمدردی کا بھرپور جذبہ نظر آتا ہے۔

نظیر نے اپنی نظموں کا دائرہ کسی خاص طبقے یا فرد تک محدود نہیں رکھا۔ بلکہ تمام مذاہب کو یکساں اہمیت دی اور مسلمان ہوتے ہوئے بھی ہندوؤں کے رسم و رواج کی طرف زیادہ توجہ صرف کی۔ حمد و نعت، معجزہ، حضرت علی، عباس، عید اور شب برات کے ساتھ ساتھ ہولی، دیوالی، راکھی، بسنت، کنھیا جی کے جنم اور مہادیو جی وغیرہ عنوانات پر مبنی عقیدت سے پر نظمیں قلم بند کیں۔ انھوں نے ہندوں کی عوامی تقریبات پر بہت کچھ لکھا جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نظیر ان تقریبات میں پورے وجود کے ساتھ شریک کار رہے۔ اس سلسلے میں محمد محمود رضوی مخمور اکبر آبادی نظیر کی شخصیت اور ان کی شاعری کے حوالے سے بڑی اہم بات لکھتے ہیں کہ: "وہ (نظیر) ہندوؤں کی معاشرت کے بھی اتنے ہی بڑے ماہر ہیں جتنے مسلمانوں کے، بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ ہندو شعراء میں ایسے بہت کم نکلیں گے جو ہندو معاشرت دانی میں نظیر کا مقابلہ کر سکیں۔ ان کی نگاہ کی وسعت انھیں ہر طبقے کی حالت سے بخوبی واقف رکھتی ہے کچھ ہندو مسلمانوں ہی پر منحصر نہیں ہندوستان کی ہر قوم کی معاشرت کا ان کو یکساں علم و تجربہ ہے۔" (روح نظیر، مخمور اکبر آبادی، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، دوسرا ایڈیشن 2003، ص 17)

ہولی کا تیوہار خاص ہندوستانی سرزمین اور آب و ہوا

سے وابستہ ہے۔ جس پر نظیر کی 13 نظمیں ملتی ہیں۔ یہ نظمیں عید وشب برات پر لکھی گئی نظموں سے کہیں زیادہ فنکاری کی آئنہ دار اور حیات کے جوش وخروش سے مملو ہیں۔ ان نظموں میں عوامی زندگی کے ولولے اور جذبات اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ ایسی ہولی جہاں رنگ و پچکاری بھی ہے اور رقص وموسیقی بھی، راگ راگنیوں کا اہتمام بھی ہے اور بھانگ کھیلنے والوں کا ازدہام بھی۔

ہوا جو آکے نشہ آشکار ہولی کا
بخار بابِ سے مل کر ستار ہولی کا
سرور رقص ہوا بے شمار ہولی کا
ہنسی خوشی میں بڑھا کاروبار ہولی کا
زباں پہ نام ہوا بار بار ہولی کا

دراصل جن تیوہاروں میں امید و آرزووں کے پورے ہونے کے امکان زیادہ ہین ان کا ذکر کثرت سے ملتا ہے یہی وجہ ہے کہ دوسرے تیوہاروں کے مقابلے ہولی پر کئی گنا نظمیں اور غزلیں دستیاب ہیں۔ ہولی کی ہر نظم میں جزئیات کا عمیق مطالعہ ومشاہدہ کارفرما ہے۔ یہ نظمیں رجائیت سے پر نظیر کے شاعرانہ مزاج اور افتادِ طبع پر دال ہیں۔

نظیر کی دیوالی پر لکھی گئی نظموں میں دیوالی کے مختلف پہلوؤں مثلاً دیوی لکشمی کی پوجا، گھروں کی سجاوٹ، میلوں ٹھیلوں، جواڑوں کی جوئے کا

اور اس کے نتیجہ میں درپیش ہونے والے واقعات وحالات کا نقشہ اس خوبی سے اتارا ہے کہ تمام جزئیات سے آگاہی ہو جاتی ہے اور اس دور کی تصویریں ہو بہو آنکھوں کے سامنے رقص کرتی نظر آتی ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

ہر اک مکاں میں جلا پھر دیا دوالی کا
ہر اک طرف کو اجالا ہوا دوالی کا
سبھی کے جی کو سماں بھا گیا دوالی کا
کسی کے دل کو مزا خوش لگا دوالی کا
عجب بہار کا ہے دن بنا دوالی کا

دیوالی کے حوالے سے نظیر کی تقریباً تمام نظمیں رجائیت سے پر ہیں۔ جس میں معاشرتی پہلو کی جانب توجہ زیادہ ہے۔

نظیر کا تعلق چونکہ ہر مذہب اور ہر طبقے سے یکساں طور پر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ محض قدرت بیان یا پرگوئی کے سبب انھوں نے مذہب کے مختلف پیشواؤں، تیوہاروں، رسموں اور کھیلوں کا تذکرہ نہیں کیا بلکہ ان میں عقیدت و محبت کا سبب کا بیان کیا اور خود بھی اس میں عملی طور پر شریک رہے۔ ان کے یہاں اگر ایک طرف الٰہی نامہ اور مختلف اولیا اکرام پر نظمیں ملتی ہیں تو دوسری جانب بلد یوجی کا میلہ، جنم کنھیا جی اور گرونانک کا بیان بھی ملتا ہے۔ انھوں نے بلد یوجی کے میلے پر ایک طویل نظم لکھی جس کا ہر بند ان کے قلندرانہ مسلک ومشرب کا بیش بہا نمونہ ہے۔ یہ نظم ان کی بیانیہ نظموں میں ایک شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ جس میں نظیر کی شاعرانہ صلاحیت اپنی پوری قوت، سادگی اور تنوع کے ساتھ نمایاں ہے۔ اس نظم میں بچی بے رنگ تصویریں بھی واقعاتی صحت اور شاعرانہ نزاکت و لطافت کے پس منظر میں رنگی نظر آتی ہیں:

''اتنے لوگوں کے ٹھٹھ لگے ہیں آہ
جو کہ تل دھرنے کی نہیں ہے جگہ
لے کے مندر سے دو دو کوس لگا۔
باغ و بن بھر رہے ہیں سب ہر جا
بھیڑ، انبوہ اور دھرم دھکا
جس طرف دیکھیے! ہا ہا ہا
رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
اور بلدیوجی کا میلا ہے۔

نظم 'بلدیوجی کا میلا' حیات و مشاغل حیات سے نظیر کی الفت ومحبت کو عیاں کرتی ہے۔ جہاں زندگی کے شباب کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ نقطہ نظر کی بھی وضاحت ہے۔ ساتھ ہی ہندو مذہب کی تلمیحات کا ذکر بھی کثرت سے ملتا ہے۔ اور الفاظ بھی اسی مناسبت سے در آئے ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت سلیم چشتی کے مزار پر ہونے والے عرس کے موقع پر بعنوان ''عرس حضرت سلیم چشتی''، لکھی۔ جس کا ایک ایک لفظ شاعر کی عقیدت ومحبت کا گواہ ہے۔

''ہیں دو جہاں کے سلطان حضرت سلیم چشتی
عالم کے دین وایمان حضرت سلیم چشتی
سر دفتر مسلمان حضرت سلیم چشتی۔
مقبول خاص یزداں حضرت سلیم چشتی
سردار ملک عرفاں حضرت سلیم چشتی

غرض یہ کہ تیوہاروں پر لکھی گئی جتنی بھی نظمیں ہماری نگاہوں سے گزرتی ہیں ان کے مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مسلم تیوہاروں پر لکھی گئی نظمیں فکروفن، واقعہ نگاری اور منظرکشی کے اعتبار سے نہایت ولولہ خیز اور زندگی سے پر ہیں۔ البتہ یہ بات بھی اپنی جگہ قابل تسلیم ہے کہ نظیرؔ کے زور بیان اور جذبات نگاری کا پرزور مظاہرہ ہندو مذہب پر لکھی گئی نظموں میں زیادہ عیاں ہے۔ بالخصوص ہولی پر لکھی گئی نظموں میں بعض تو محاکاتی رنگ لیے ہوئے نظر آتی ہیں۔ اس سلسلے میں سید طلعت حسین نقوی کا قول بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

''نظیر کی نظمیں جو ہندوؤں کے تیوہاروں یا غیر مسلم عظیم کرداروں کے موضوع پر ہیں۔ ان میں نظیر کا فن انتہائی نقطۂ عروج پر پہنچ گیا ہے۔ ان کے کلام میں مذہبی بے تعصبی کا انداز پایا جاتا ہے وہ قابل تعریف ہے۔''

تمام نظمیں انسانی دوستی، دردمندی، حقیقت کی آگہی اور غائر بینی کی عمدہ مثالیں ہیں یہ نظمیں موضوع ومواد کی ہم آہنگی سے منظر کشی کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہیں۔ جس میں جزئیات نگاری بھی ہے اور جذبات نگاری بھی ہے، مثنوی کا رنگ بھی ہے اور ڈرامائی کیفیت بھی، واقعہ نگاری بھی ہے اور رسوم و رواج کی حقیقی ومعاشرتی تصویر یں بھی۔ یہ تمام نظمیں پر اثر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ میں بے نظیر بھی ہیں۔ جس میں ہندوستانی زندگی اور معاشرہ سانس لے رہا ہے۔ نظیر کی نظموں کی یہی وہ خوبیاں ہیں جس کی وجہ سے دوسرے شعرا بھی ان سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اور ان کی لیاقت وصلاحیت کے اور معترف بھی ہیں۔ ان کی شاعری انسانی مساوات کا بہترین مرقع ہے۔ جس میں زندگی، شاعری، مذہب اور اخلاق غرض ہر شعبہ حیات کو بآسانی دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بقول رام بابو سکسینہ ''ان کے مزاج میں چونکہ مذہبی تعصب اور نارواداری نہ تھی بلکہ کٹر پن کو نہایت نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اسی وجہ سے وہ ہندوں سے بہت خلط ملط رہتے تھے اور ان کے رسم و رواج ان کی زبان، ان کے خیالات، ان کے تیوہار اور معتقدات تک کو ایسے دلچسپ طریقے سے اس قدر صحت کے ساتھ بیان کر گئے کہ ہم کو ان کی ہمہ دانی پر تعجب ہوتا ہے'' (ہسٹری آف اردو لٹریچر۔ رام بابو سکسینہ، مطبع منشی نول کشور لکھنو ص 343)

بحیثیت مجموعی نظیر نے اپنی شاعری اور نظموں کے ذریعے عملی طور پر قومی یکجہتی کی تعمیر وتشکیل کا جو نمونہ پیش کیا ہے اس کی مثال اردو شاعری میں ناپید ہے۔ نظیر کی نظموں کے تاریخ وار جائزے سے یہ بھی آگاہی ہوتی ہے کہ ان کے زمانے نے تو انہیں قابل اعتنا نہیں گردانا لیکن مابعد کے انصاف پسند ذہنوں نے جب ان کا مطالعہ کیا تو انہیں ان کا صحیح مقام بھی دلوایا۔

زبان و بیان کے سلسلے میں نظیر کی انفرادیت اس طرح قائم ہے کہ انھوں نے کسی قسم کے اصول وضوابط کا پاس ولحاظ نہیں رکھا بلکہ اپنی زبان خود وضع کی۔ لفظ ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے نظر آتے ہیں۔ نظیر جس طرح چاہتے ہیں لفظوں کو استعمال کرتے ہیں۔ نظیر کا کمال ہی یہ ہے کہ لفظوں کے لیے انہیں کنوئیں جھانکنے کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ انھوں نے اپنے لیے ایک نیا طرز ایجاد کیا۔

■

Asma
R-49 A, Frist Floor, Sir Syed Road
Jogabai Extn. Batla House, Jamia Nagar
New Delhi - 110025

پروفیسر عبدالستار دلوی سے ایک ملاقات

سوال نامہ برائے انٹرویو

ماہنامہ'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے۔ یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کردی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہوسکیں۔

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

س: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟

س: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جاسکتی ہیں؟

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟

س: سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں:

➢ editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in

محمد طیب شمس

مدارس سے اردو کا مستقبل روشن ہے

محمد طیب شمس

اردو رسائل میں اردو زبان کے تعلق سے جو بھی گفتگو ہوتی ہے ان سے حقیقی صورت حال کا ادراک نہیں ہوپاتا۔ زبان کی زمینی صورت حال کیا ہے اس سے آگہی کے لیے ضروری ہے کہ تحریکات و رجحانات کے بجائے ان بنیادی مسائل پر توجہ دی جائے جن کا زبان کے فروغ اور تحفظ سے تعلق ہے۔ عموماً اردو کے حقیقی مسائل سے اجتناب کیا جاتا ہے اور یہ جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ کن کن علاقوں میں اردو کی حقیقی صورت حال کیا ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں سوال نامے کے ذریعے دراصل اردو زبان کے بنیادی مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ ملک کے مختلف علاقوں میں تعلیم، تدریس اور دیگر سطحوں پر اردو زبان کی صورت حال کیا ہے اور وہاں کس طرح کی دشواریاں اور مشکلات پیش آرہی ہیں۔ جب تک اردو زبان کے بنیادی مسائل پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا جائے گا تب تک اردو زبان کے تحفظ اور بقا کے لیے مربوط لائحہ عمل تیار کرنا مشکل ہوگا۔

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

جواب: زندہ زبان ہمیشہ تروتازہ اور لطف وانبساط سے بھرپور ترقی کی راہ پر گامزن ہوتی ہے وہ وقت اور حالات کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اور نئے زمانے اور نئے طور طریقے سے ہم آہنگ ہوتی چلی جاتی ہے جبکہ مردہ زبان کی کیفیت جامد ہوتی ہے۔

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقۂ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

جواب: زندہ زبان میں عموماً جذب وانجذاب اور تعمیر اور تخلیق کا عمل صدیوں سے متواتر جاری ہے اس سے نئے الفاظ زبان پر چڑھتے ہیں، نئے محاورات اور روز مرہ استعمال میں آتے ہیں۔ اردو زبان ایک زندہ اور لچیلی زبان ہے یہ زبان نئی نسل کی مکمل رہنمائی اور ترجمانی کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ آج اردو صرف اردو کی بستیوں تک محدود نہیں رہ گئی ہے بلکہ یہ بے آب وگیاہ میدانوں میں بھی گل کھلا رہی ہے۔

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیا رشتہ ہے؟

جواب: زبانوں کو زندہ اور تابندہ رکھنے کے لیے تہذیب وثقافت کو بھی زندہ رکھنا ضروری ہے کیونکہ زبان کا معاملہ نہ صرف تبادلۂ خیال، افہام وتفہیم اور مواصلاتی نظام سے جڑا ہوتا ہے بلکہ ملک وقوم کا تاریخی، سائنسی، سماجی اور مذہبی ورثے سے بھی مربوط ہوتا ہے گویا ہر زبان کی اپنی ایک مخصوص تہذیب وثقافت ہوتی ہے جس سے وہ زبان پہچانی جاتی ہے کسی بھی زبان کو اس کی تہذیب وثقافت سے الگ کرکے دیکھیے تو اس کی شناخت ختم ہوجائے گی، اس کا معنی ومفہوم اور حقیقی پس منظر سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اردو زبان کی اگر بات کریں تو یہ زبان ہندوستان کی مشترکہ تہذیب وثقافت کے اختلاط سے عالم وجود میں آئی ہے اور اردو نہ صرف اپنی مذہبی وراثت کی امین ہے بلکہ اردو نے اپنے دامن میں مشترکہ کلچر وتہذیب کی نہ صرف حفاظت کی ہے بلکہ نئے اور صحت بخش زبان وادب کا قافلہ اسی پر رواں دواں ہے۔

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

جواب: ظاہر ہے جب زبان کا تعلق تہذیب وثقافت سے جڑا ہوا ہے تو زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کو خطرہ ضرور لاحق ہوگا۔ یہ چیز انسانوں کے علاوہ دوسری مخلوق میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ کسی نسل کا کوئی جاندار صفحۂ ہستی سے نیست ونابود ہوچکا ہو تو اس کی نیابت کوئی دوسرا نہیں کرسکتا ہے اور اس کا خلا پورا نہیں ہوتا ہے۔

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

جواب: زبان ادراک کا سب سے بہترین ذریعہ ہے اور یہ زندگی کے ہر گوشہ اور ہر لمحہ کی وکالت کرتی ہے اور اس کی تعبیر وتشریح بھی کرتی ہے اس لیے زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر مثبت نہیں بلکہ منفی اثرات ہی پڑتے ہیں۔

س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

جواب: میرے خیال میں موجودہ حالات میں اردو زبان کو باہر سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے البتہ اردو کو خطرہ اپنوں سے ہے یعنی اردو سے وابستہ حضرات سے، اردو سے منفعت حاصل کرنے والوں سے اور اردو کے قارئین کرام سے کیونکہ اردو سے وہ انصاف نہیں کر پاتے اور عموماً اردو سے وابستہ اعلیٰ طبقہ اردو کی پرواہ نہیں کرتا۔

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

جواب: اردو ایک ایسی زبان ہے جو سکون وراحت اور دل کی زبان ہے جو بلا تکلف زبان پر آجاتی ہے اور اظہار کا ذریعہ بن جاتی ہے، اردو زبان اپنی خصوصیت، تلفظ اور بانکپن سے عوام وخواص میں کافی مقبول ہے اور یہ رابطے کی زبان ہے، دور حاضر میں اردو زبان کی شہرت میں فلمی صنعت نے چار چاند لگایا ہے تو اسی طرح اردو زبان کی نشو ونما اور فروغ وارتقا میں مدارس، مکاتب، مساجد کا اہم رول رہا ہے، مدارس میں تدریس کا ذریعہ بھی اردو زبان ہے اور ترسیل کا ذریعہ بھی اردو زبان ہے بعض مدارس میں اردو زبان وادب باقاعدہ نصاب تعلیم کا حصہ ہے، مدارس سے وابستہ یہ کمزور افراد اردو زبان وادب کا روشن اور تابندہ ستارے ہیں ان کے وجود سے اردو کا مستقبل روشن ہے۔

س: کیا کلاسیکیت جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

جواب: کہا جاتا ہے کہ ہر عہد کے اپنے مخصوص ادبی رجحانات ہوا کرتے ہیں اور بقول احتشام حسین ''انہی رجحانات کے تحت اس عہد کی ادبی اور استعاراتی کائنات بھی مرتب ہوا کرتی ہے'' کلاسیکی ادب ہو یا جدید ادب، ترقی پسند ادب ہو یا مابعد جدید ادب یہ ادب کے مخصوص فکری رجحانات ہیں اور ان سے اردو زبان کا دامن وسیع ہوا ہے کیونکہ ادبی نقطہ نظر اپنے فکری رجحان کی ترجمانی کرتا ہے اور اس سے قاری کو فائدہ پہنچتا ہے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

جواب: میرا تعلق صاحب گنج جھارکھنڈ سے ہے جو تعلیمی لحاظ سے غیر ذی زرع اور پسماندہ علاقہ ہے جھارکھنڈ میں صاحب گنج ضلع کی تعلیمی شرح 53.73 فیصد ہے مرد تعلیم یافتہ کی شرح 62.65 فیصد جبکہ عورت تعلیم یافتہ کی شرح 44.90 فیصد ہے۔

میرے علاقے میں اردو میڈیم اسکول کی تعداد 38 ہے اس میں اردو ٹیچر کی تعداد 22 ہے ہائی اسکول کی تعداد 78 ہے اس میں دو ہائی اسکول اردو میڈیم ہیں۔ اس میں کل اردو اساتذہ کی تعداد 36 ہے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

جواب: مدارس، اسکولس اور کالجز کی لائبریریوں کے علاوہ مقامی سطح پر کئی لائبریریاں ہیں اس میں جنرل لائبریری ضلعی جمعیت اہل حدیث صاحب گنج سر فہرست ہے، جس میں اردو کتابیں کثیر تعداد میں ہیں ان لائبریریوں میں اردو اخبار مثلاً روز نامہ انقلاب، راشٹریہ سہارا، قومی تنظیم، فاروقی تنظیم اسی طرح اردو کے رسائل مثلاً اردو دنیا، تہذیب الاخلاق، آجکل، ایوان اردو، پیش رفت، وغیرہ مسلسل آتے ہیں اسی طرح دینی اردو رسائل مثلاً جریدہ ترجمان، محدث، البلاغ وغیرہ موصول ہوتے ہیں۔ میرے علاقے میں دینی رسالہ مثلاً سالانہ المصلح، سہ ماہی السلام، سالانہ تہذیب، شائع ہو رہے ہیں جس سے اردو زبان عوامی اور رابطہ کی زبان بننے میں معاون بن رہی ہے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟

جواب : انجمن ترقی اردو، انجمن فروغ اردو، آل انڈیا اردو ٹیچرس یونین اردو کے تئیں اپنی ذمہ داری نبھا رہے ہیں، سرکار سے اردو کے حقوق دلانے کی کوشش کر رہے ہیں اور جمہوری انداز سے اپنے جائز مطالبے پیش کر رہے ہیں وہیں خاموشی سے غیر سرکاری امداد یافتہ مدارس اردو کی خدمت کر رہے ہیں ضلع میں ملحقہ مدارس کی تعداد 43 ہے اس میں عالم (B.A.) کے مساوی ایک مدرسہ مدرسہ دار العلوم پیار پور صاحب گنج جبکہ فاضل (M.A) کے مساوی ایک مدرسہ مدرسہ اسلامیہ عبداللہ پور ہے اس میں عالم اور فاضل میں تقریباً دو ہزار طلبہ وطالبات عالم آرٹس اردو اور فاضل اردو میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اسی طرح نظامیہ مدرسے بھی اردو کے فروغ میں اہم کارنامے انجام دے رہے ہیں ضلع میں فضیلت کے معیار کے پندرہ مدارس ہیں جن میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے الگ الگ شعبے قائم ہیں، مثلاً جامعہ شمس الہدیٰ السلفیہ دلا پور، صاحب گنج للبنین والبنات، جامعہ اسلامیہ سلفیہ عبداللہ

اردو ایک ایسی زبان ہے جو سکون وراحت اور دل کی زبان ہے جو بلا تکلف زبان پر آجاتی ہے اور اظہار کا ذریعہ بن جاتی ہے، ار دو زبان اپنی خصوصیت، تلفظ اور بانکپن سے عوام وخواص میں کافی مقبول ہے اور یہ رابطے کی زبان ہے، دور حاضر میں اردو زبان کی شہرت میں فلمی صنعت نے چار چاند لگایا ہے تو اسی طرح اردو زبان کی نشو ونما اور فروغ وارتقا میں مدارس، مکاتب، مساجد کا اہم رول رہا ہے، مدارس میں تدریس کا ذریعہ بھی اردو زبان ہے اور ترسیل کا ذریعہ بھی اردو زبان ہے بعض مدارس میں اردو زبان وادب باقاعدہ نصاب تعلیم کا حصہ ہے، مدارس سے وابستہ یہ کمزور افراد اردو زبان وادب کا روشن اور تابندہ ستارے ہیں ان کے وجود سے اردو کا مستقبل روشن ہے۔

پور، صاحب گنج للبنین والبنات، جامعہ اصلاح المومنین برہیٹ صاحب گنج للبنین والبنات، مرکز السلام التعلیمی، شریکنڈ صاحب گنج، کلیہ عائشہ صدیقہ للبنات، الفلاح ایجوکیشن سینٹر کوٹال پوکھر، صاحب گنج، جامعہ انصار العلوم السلفیہ بڑا سونا کوڑ، کوٹال پوکھر صاحب گنج، جامعہ غوثیہ راج محل، صاحب گنج، مدرسہ یوسفیہ ادھوا، صاحب گنج، مدرسہ حسینیہ حبیب پور، صاحب گنج، مدرسہ احیاء السنہ کدمہ، صاحب گنج، وغیرہ سر فہرست ہیں۔ قومی اردو کونسل کا شعبہ کمپوٹر اور ایک سالہ اردو ڈپلومہ کورس برہروا، صاحب گنج، میں موجود ہے جس سے غیر اردو داں طبقہ اردو سیکھنے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ عالم وفاضل کا امتحان جھارکھنڈ اکیڈمک کونسل رانچی منعقد کر رہی ہے اگلے سیشن سے ونوبا بھاوے یونیورسٹی ہزاری باغ امتحان لینے جا رہی ہے جو اردو کے لیے اچھی خبر ہے۔

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

جواب: اردو سے میری وابستگی بچپن سے رہی ہے مجھے یاد ہے جب مجھے اچھی طرح سے لکھنا پڑھنا بھی نہیں آتا تھا اسی زمانے میں میرے والد محترم میرے لیے بچوں کا ماہنامہ رسالہ 'الہلال' خریدا کرتے تھے مجھے اس زمانے میں کارٹون کہانی پڑھنا بہت مزہ آتا تھا۔ گھر میں اردو کا ماحول تھا اس لیے اردو میڈیم سے ہی لکھنا پڑھنا شروع کیا گاؤں میں ہی اردو میڈیم پرائمری اسکول تھا وہیں

پانچویں کلاس امتیازی نمبرات سے پاس کیا چونکہ قریب میں اردو ہائی اسکول نہیں تھا اس لیے میرے والد محترم نے مجھے سرکاری مدرسہ میں داخل کر دیا اور یہیں سے عالم اردو، فاضل اردو اچھے نمبرات سے پاس کیا۔ پھر چونکہ نظامیہ مدرسہ میں درس وتدریس کی خدمت انجام دینا میرے لیے مشکل کا باعث بنی۔ میرا دل بہت بے قرار تھا کہ میں اردو لے کر یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں چونکہ بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کی سند عالم اور فاضل یونیورسٹی سے الحاق تھا اس لیے میں نے رانچی یونیورسٹی سے ایم، اے، بی ایڈ، پی ایچ، ڈی کی ڈگریوں سے فیضیاب ہوا۔ پھر میری تقرری مدرسہ اسلامیہ میں فاضل کے عہدہ پر بحیثیت مدرس ہوگئی۔ میں نے وہاں دو سال تک خدمت انجام دی۔ مدرسہ کے بچوں کو اردو پڑھنے کی ترغیب دلائی۔ چونکہ مدرسہ غیر سرکاری امداد یافتہ تھا اس لیے میں جھارکھنڈ کرم چاری آیوگ کے توسط سے سرکاری ہائی اسکول میں بحال ہوا میں اپنے ضلع میں اردو کا ٹاپر تھا۔ اس تمہید سے اپنی انانیت اور خودسری کی تکمیل نہیں چاہتا بلکہ ہوسکتا ہے کہ اس سے بہتوں کو منزل مقصود پانے کا ذریعہ بن جائے شروع سے ہی میرے دل میں یہ بے قراری سی ہے کہ میں مدرسہ کے بچوں کو ان کے اپنے روشن کیریئر کی رہنمائی کرسکوں، انھیں بتا سکوں کہ اردو زبان وادب کو پڑھ کر آپ ایک اچھا کیریئر بنا سکتے ہیں مجھے یقین ہے کہ مدارس کے بعض طلبا وطالبات ہونہار ہوتے ہیں محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں انھیں اچھی رہنمائی ملنے سے وہ اردو زبان وادب میں ایک اچھا مقام حاصل کرسکتے ہیں۔

س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

جواب: اردو کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ ہم اردو کو جدید علوم ومضامین سے جوڑیں، زیادہ سے زیادہ اردو زبان کو روزگار سے منسلک کریں کیونکہ جب تک کوئی زبان پیشہ سے وابستہ نہیں ہوتی ہے اس کا فروغ بڑی سطح پر ممکن نہیں ہے۔

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟

جواب: اردو رسم الخط اردو کی پہچان ہے، رسم الخط کا تعلق صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ پوری تہذیب وثقافت سے ہے اس لیے اردو رسم الخط کو زندہ رکھنا ہر فرد بالخصوص نسل اردو کی ذمہ داری ہے اور اس کی بقا اور تحفظ کے لیے اردو زبان کو اردو رسم الخط میں لکھنا ضروری ہے اردو کو کسی دوسرے رسم الخط میں لکھ کر ہم اردو کو آگے بہت دور تک نہیں لے جاسکتے ہیں۔

س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں، آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

جواب: اس کو خوش قسمتی ہی کہہ لیجیے کہ میرے اہل خانہ کے تمام افراد اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں، دادا جی مرحوم جامعہ اسلامیہ سلفیہ عبداللہ پور اور مدرسہ اسلامیہ عبداللہ پور کے تاحیات سکریٹری رہے اردو سے انھیں اچھا لگاؤ تو تھا ہی وہ اردو میڈیم سے مدرسہ میں دینی اور جمہوری خیال کو فروغ دینا چاہتے تھے ان کا ایک مختصر تعلیمی وتربیتی رجحان کا اقتباس نقل کر رہا ہوں جس سے ان کی فکر پر روشنی پڑتی ہوئی نظر آتی ہے کہ ''سب سے اہم اور ضروری بات یہ ہے کہ آپ ذمہ داری کو سمجھیں پھر اس پر پابند ہو جائیں، یہ کام اللہ، قوم اور سرکار کی طرف سے آپ پر امانت ہے۔'' والد محترم ابھی حال میں مدرسہ اسلامیہ عبداللہ سے پرنسپل کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ میرے گھرانے میں نسل در نسل اردو زبان وادب کی آبیاری ہوتی چلی آرہی ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ سلسلہ ہمیشہ چلتا رہے گا۔

س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

جواب: غیر اردو حلقے میں اردو کے تئیں احساس کمتری اور احساس برتری دونوں کو دور کرنا ہوگا۔ احساس کمتری یہ ہے کہ اردو پڑھ لکھ کر کیا ہوگا؟ حالانکہ یہ بالکل من گھڑت ہے کیونکہ اکثر مشاہدے کی بات ہے جیسا کہ میرے علاقے میں اردو تعلیم یافتہ افراد دوسری زبان کی بہ نسبت زیادہ برسر روزگار ہیں۔ احساس برتری یہ ہے کہ اردو زبان سے وابستہ حضرات کی کوئی قدر نہیں ہوتی ہے حالانکہ ایسے افراد اردو زبان کے تلفظ اردو کے رسم الخط سے اچھی طرح واقف نہیں ہوتے اس لیے ان افراد کی کوئی قدر نہیں ہوتی ہے سچائی یہی ہے کہ اردو زبان کے جانکار کی ایک عظمت ہوتی ہے اور ان کا ایک خاص تشخص ہوتا ہے۔ اور ایک الگ شناخت ہوتی ہے۔

ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے لیے مالی امداد کے ساتھ اردو زبان میں پمفلٹ شائع کرانے کا مشورہ دیاجاسکتا ہے اس طرح اردو مشاعرہ، سمینار، ورکشاپ منعقد کرایا جاسکتا ہے جس سے اردو زبان کو عوام کے قریب لایاجاسکتا ہے، غیر اردو داں لوگ اردو شاعری سے خوب متاثر ہوتے ہیں اس لیے اس کی عوامی مقبولیت سے فائدہ اٹھاکر عوام کو اردو سے جوڑا جاسکتا ہے۔ اردو مادر وطن ہندوستان کی زبان ہے اس لیے اس زبان کی ترقی سرکاری وغیر سرکاری سبھی تنظیموں پر مشترکہ ذمہ داری بنتی ہے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

جواب: میرے علاقے میں پوسٹ گریجویشن (PG.) سطح کا ایک ہی کالج ہے وہ صاحب گنج کالج ہے اس میں اردو کی تعلیم ایم اے تک ہوتی ہے طلبا وطالبات کی تعداد 42 ہے۔ جبکہ انڈر گریجویشن (U.G.) سطح کے کل سرکاری اور امداد یافتہ چار کالج میں اس میں بے ایس کے کالج برہروا، صاحب گنج سرفہرست ہے اس میں اردو کی تعلیم بی۔ اے تک ہوتی ہے اردو پڑھنے والوں کی تعداد 56 ہے۔

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟

جواب: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے لیے مالی امداد کے ساتھ اردو زبان میں پمفلٹ شائع کرانے کا مشورہ دیا جاسکتا ہے اس طرح اردو مشاعرہ، سمینار، ورکشاپ منعقد کرایا جاسکتا ہے جس سے اردو زبان کو عوام کے قریب لایا جاسکتا ہے، غیر اردو داں لوگ اردو شاعری سے خوب متاثر ہوتے ہیں اس لیے اس کی عوامی مقبولیت سے فائدہ اٹھا کر عوام کو اردو سے جوڑا جاسکتا ہے۔ اردو مادر وطن ہندوستان کی زبان ہے اس لیے اس زبان کی ترقی سرکاری وغیر سرکاری سبھی تنظیموں پر مشترکہ ذمہ داری بنتی ہے۔

س: سنٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

جواب: سینٹرل اسکول میرے علاقے میں نہیں ہے البتہ نوودے اسکول ہے اور اس میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے جس میں ایک مستقل اردو ٹیچر یا کنٹریکٹ اردو ٹیچر کا انتظام ہے۔

■

Dr, Md. Taiyab shams
Asst. Teacher U.H.S.
Juhibona, Barharwa, Sahibganj. Jharkhand.
Mob:7763961064

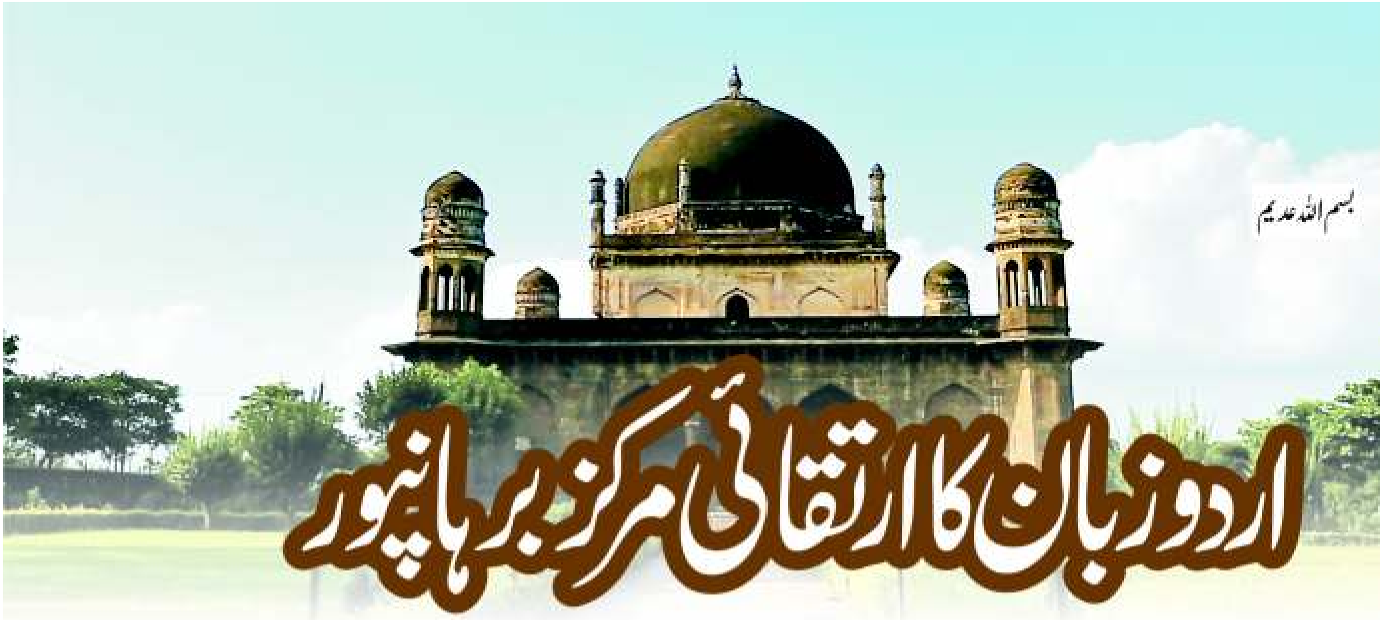

اردو زبان کا ارتقائی مرکز برہانپور

بسم اللہ عدیم

مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے وسیلے سے عربی، فارسی زبان نے اپنے رموزِ سرّیت سے وہ گلکاری کی ہے کہ زبان اردو میں نکھار و جاذبیت کی خوبی سے یہ زبان فرشِ زمیں سے بامِ فلک پر جا کر ایک سرمدی آہنگ بن گئی۔

اس سرمدی آہنگ یعنی اردو زبان (ریختہ) کے سرخیل شہر برہان پور میں سعدی دکنی اور شاہ بہاؤالدین باجن ہیں۔ یہ دونوں بزرگ ہستیاں اردو کے قطار اور نبیل کہلائے جانے کی مستحق ہیں۔ اس حقیقت کے انکشاف کے لیے اختصار کے ساتھ اس مضمون کی ابتدا ان ہی ہستیوں کے نام سے کی جارہی ہے۔

سعدی دکنی

دریائے تاپتی کے کنارے آج سے قریب چھ سو سال پہلے شہر برہان پور کی بنیاد 1407 میں رکھی گئی۔ خاندیش کے حکمراں ملک نصیر خاں فاروقی کی فتح یابی اسیر گڑھ کے موقع پر اپنے پیرومرشد شیخ برہان الدین غریب خلدآبادی کی آمد پر ان ہی کے نام سے اس کا نام برہان پور رکھا گیا ہے۔ سعدی دکنی کی اسی شہر برہان پور کے قصبے شیر پور میں ولادت ہوئی اور مستقل سکونت بھی رہی حتیٰ کہ 691ھ میں رحلت کر گئے۔ مختلف روایتوں اور تذکروں سے یہ معلوم ہوا کہ آپ کے والد شیخ محمد سے ہی آپ کو خلافت ملی تھی۔ لیکن آپ کی تاریخ پیدائش اور اجداد کے بابت مصدقہ معلومات ہنوز دستیاب نہ ہوسکی۔ آپ کے متعلق کچھ تحقیقی مغالطے اور مباحثی اُلجھنیں سننے پڑھنے کو ملیں جو کہ درست نہیں ہیں۔ مثلاً سعدی شیرازی کے تتبع میں سعدی نام یا تخلص کا اختیار کیا جانا یا ان سے اکتساب وغیرہ کرنا۔ القصہ یہ کہ سعدی شیرازی کے زمانے اور آپ کے دور میں ایک صدی سے بھی زیادہ کا فاصلہ ہے۔ دوسری یہ کہ آپ کی ملاقات امیر خسرو سے ہوئی ہے۔ اس بارے میں عرض یہ ہے کہ ایسی اور بہت سی باتیں تحقیقی اعتبار سے اپنی صفائی کا مطالبہ کرتی ہیں۔ مگر اس امر پر بھی تذکرہ نگاروں اور محققین کا اتفاق ہے کہ سعدی دکنی ایک صوفی باصفا فریدالعصر ریختہ گو تھے۔ آپ کی آخری آرام گاہ اسی شہر برہان پور میں قصبہ شیر پور میں چھوٹی اتاوَلی ندی کے کنارے دیدۂ حیرت نگاہ ہے۔

تواریخ میں ہے کہ زمانۂ قدیم سے شہر برہان پور کو یہ امتیاز حاصل رہا کہ یہ زمین اولیاء خیز اور صوفیوں کا مسکن و مدفن ہے۔ یہاں دہلی اور لکھنؤ کی طرح سے یگانہ فن مشاہیر اور اہلِ فن و اہلِ قلم ہوئے ہیں۔ جن میں عالم، محدث، مفسر، مترجم، تاریخ نگار، اطبا نابغۂ روزگار شعرائے کرام اور اردو کے ہمنوا ہوئے ہیں۔ جو اپنے اپنے فن میں ماہر و طاق تھے۔ اپنی بیش بہا خدمات دے کر آسودۂ خاک ہوئے ہیں۔ قدیم تذکروں کے اوراقِ پارینہ، کتابیں، گلدستے اور مخطوطوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں زبانِ اردو کی آبیاری پندرھویں صدی کے اوائل 1407 سے ہوچکی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب رگ ویدی بھاشا سنسکرت، لاہوری پنج آبی اور مسلم صوفیائے کرام، بزرگ ولی اللہ کی رہنما زبان عربی فارسی نیز مقامی بزرگانِ دین کے افہام و تفہیم کے اختلاط سے اُبھی ایک یگانہ زبان وجود میں آئی جو آج اردو سے منسوب ہے۔

بابِ دکن برہان پور میں جن اہلِ قلم بزرگ اشخاص نے اس زبان کی تحریر میں طرزِ نگارش کو اپنا کر اردو کے ارتقا میں خدمات انجام دی ہیں ان میں سعدی دکنی، بہاؤالدین باجن اور سعداللہ گلشن سرِفہرست ہیں۔ آج کے دور میں اردو ادب کا تقاضا ہے کہ ان بزرگوں کی خدمات کا احاطہ کرکے خاطر خواہ تحقیقی کام کیا جائے تاکہ نئی نسل اپنے اسلاف کے روشن کارناموں سے اپنی اردو ادبی تہذیب کی جہتیں متعین کرسکیں۔

سعدی دکنی نے برہان پور اور اس کے اطراف و اکناف میں ریختہ کی ابتدا کی اور اس گنگا جمنی زبان کی بنیاد رکھ کر پروان چڑھایا۔ اس طرزِ سخن گوئی کو اور ادبی خزانے کو صوفی شاعر باجن نے مالا مال کیا ہے۔ یہ ارتقائی منازل کی تحریک آزادی تک محیط ہے۔ اردو کے ارتقا اور عروج کے اس دور میں انیس اور دبیر سے بھی بہت پہلے شہر برہان پور میں مرثیے، قصائد، مثنوی، نعت و سلام، منقبت، دوہے، خمسہ، کلاسیکی غزلیں لکھی گئی ہیں۔ آج ان کے مخطوطے نہ اس شہر میں ہیں نہ ہی ہندوستان میں بلکہ انڈیا آفس لائبریری لندن، نیشنل لائبریری پیرس اور اڈنبرا کی لائبریری میں دیکھی جاسکتی ہیں جو کہ محفوظ ہیں۔

تاریخ اولیائے برہان پور کے مؤلف بشیرالدین ایڈووکیٹ نے بحوالہ یہ لکھا ہے کہ سید نجیب اشرف ندوی کے ذاتی کتب خانہ میں ایک بیاض یادگار کے طور پر ہے اس میں سعدی دکنی کے کچھ اشعار کثیر تعداد میں ہیں وہ اگر منظرِ عام پر آجائیں تو اس دور کی شاعری کی خوبیاں مشتہر کرنے میں اہمیت کی حامل ہوں گی۔ تاریخ اردو میں قدامت کے لحاظ سے مرورِ ایام دہلی میں جو مقام امیر خسرو کا ہے وہی مقام دکن میں سعدی دکنی کا ہے۔ مگر افسوس! دکن میں ریختہ گوئی کا یہ ابتدائی شاعر اور زبان کا بنیاد گزار آج تک کن وجوہات کی بنا پر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے محققین کے لیے تشویش کا باعث ہے۔

اردو تہذیب کا یہ شرف مند بنیاد گزار شاعر روحانی ملکیت کا مالک شہر برہان پور میں موضع شیر پور میں محوِ خواب ہے۔

شاہ بہاؤالدین باجن

سلسلۂ نسب کے اعتبار سے خلیفہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے تعلق تھا۔ آپ گجرات (احمد آباد) میں حاجی معزالدین کے یہاں 790ھ بمطابق 912ھ میں ولادت پائی۔ آپ کے خاندان میں کون کون اور کتنے بھائی بہن تھے معلوم نہ ہوسکا۔ جب آپ 4 رسال کی عمر کو پہنچے والد کا سایہ سر سے اُٹھ چکا تھا۔ ایسے عالم میں آپ کے چچا نے غالباً آپ کی نگہداشت اور تعلیم کی ذمے داری کو انجام

دیا۔ آپ شاہ عزیز متوکل کے بعد اُن کے فرزند سے دینی علوم کے ظاہر و باطن و دنیاوی علم سے بہرور ہوئے۔ دوران تعلیم ذوق عبادت، مجاہدہ اور ریاضت سے خصوصی لگاؤ تھا۔ برہان پور میں اس وقت فاروقی سلطان عادل شاہ ہمایوں گدّی نشین حکمراں تھا۔ عادل شاہ متقی اور پرہیزگار بزرگانِ دین کا احترام خلوص دل سے کیا کرتا تھا۔ آپ کی درویشانہ بزرگی کا جب اسے علم ہوا تو آپ غالباً دولت آباد یا بیدر میں تھے۔ اس برار شاہی حکمراں نے مؤدبانہ درخواست کے ساتھ برہان پور آنے کی اطلاع دی تا کہ حکومت میں آپ کی آمد خیر و برکت کا مؤجب ہوسکے۔ اس غرض سے ہمایوں شاہ نے شہر برہان پور کے مغربی حصے کے وسط میں شاہ بازار میں آپ کے قیام کے لیے خانقاہ اور خاص طور پر مسجد تعمیر کرائی۔ شاہ بہاؤالدین باجن راسخ العقیدہ سچے عاشق رسولؐ، پُرخلوص دردمند اور قوم کے خیر خواہ تھے اس لیے یہاں آنا پسند فرمایا مذہبی عقیدے کے مطابق صوفیانہ رنگ میں وحدانیت کے رموز، عشقِ رسولؐ کو مدحیہ کلام کی صورت میں بیان کرنے کو اپنا وطیرہ بنایا اور ثابت قدمی سے اس عمل کے لیے ہندی گجری آمیز اردو کو وسیلۂ اظہار بنالیا۔ علاوہ عمیق مطالعے کا بقدر ذوق شغف تھا۔ موسیقی کے اس قدر دلدادہ تھے کہ زبانِ اردو میں اپنی شعری پہچان کے لیے باجن تخلص کو اپنایا۔ باجن کہلائے جانے پر بیحد مسرور ہوا کرتے تھے۔

آپ کی تخلیقی کاوشوں کا اسلوب قدیم اردو کا غماز ہے جو نویں صدی کی زبان ہے اس میں ہنداسلامی لب و لہجے کے اثرات مل جل کر ایک ایسی صورت اختیار کرتے ہیں جو گجری اردو کے ساتھ مخصوص ہے۔ تصوف کے اسرار و رموز کو آپ نے ہندی رمز کنائے اور ہندوی محاورات سے منسلک کیا جس میں خفتہ جذبۂ احساس کا پَرتو سادہ سلیس لفظوں کی ترکیب کے استعمال سے ظاہر ہے۔ اس کا تاثر غنائی کیفیت لیے ایک خاص لے کے ساتھ دلکشی پیدا کرتا ہے۔ خزائن رحمت اللہ آپ کی اس تعلق سے ایک یادگار تصنیف ہے۔ اس کے ایک باب کو خزائن ہفتم کہا گیا ہے۔ اس میں اشعار، جکریاں، دوہے، جیسی صنعت سخن میں تحریر کیے ہیں۔ گلستانِ ہزار رنگ نامی کتاب کے قلمی نسخہ میں بہ یک وقت برج بھاشا دہلی اور اس کے اطراف میں بولی جانے والی کھڑی بولی، پنجابی، سرائیکی، گجراتی، راجستھانی زبان کے ملے جلے لہجے کا عکس نمایاں ہے۔

آپ کے قلمی نسخے خزائن رحمت اللہ میں صوفیائے سلف کے شعری کلمات کے علاوہ اپنے پیر و مرشد کے ملفوظات و اقوال اور اپنا مدحیہ کلام جمع کیے ہیں۔ اس مخطوطہ کا نسخہ انجمن ترقی اردو پاکستان میں ہے۔ اس کا عکسی نسخہ مرحوم احکام اللہ بخاری پیش امام فاروقی شاہی جامع مسجد برہان پور کے نجی کتب خانے میں محفوظ ہے۔

شاعری ترنم کی محتاج نہیں لیکن کائنات کی ہر شے میں ایک نغمہ ریزی ہے جو وحدہ لاشریک کی حمد و ثناء میں رطب اللسان ہے۔ بہاؤالدین باجن صوفی مسلک کے ولی اللہ ہیں۔ انھوں نے نغمہ ریزی کی پاک طینت کو روحانی انبساط کا جز محسوس کرتے ہوئے اسے اپنایا اس لیے ہمیں ان کے یہاں سخن گوئی کی دو طرز ملتی ہیں۔ ایک توری اور دوسری بیہروی یہ دونوں طرز کے صوفیانہ آہنگ ہیں اور اسلوب گجراتی گجری کا ہے۔ اس میں مروجہ مقامی زبان کے الفاظ کی آمیزش صوفیانہ سرور و وجد کی کیفیت طاری کرنے میں معاونت کی حامل ہے یہی وہ رمز ہے جو غنائیت کے ساتھ عشق حقیقی کے افکار کی گیرائی عوامی ذہنوں کو متاثر کرتی ہے اسی لیے شاہ باجن نے یہ طریقہ اپنایا ہے۔

مذکورہ باتوں کے پیش نظر اپنے پیر و مرشد کے لیے شاہ باجن نے ایک سہرہ کی تخلیق کی ہے وہ معلوماتی دلچسپی کی خاطر یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

کیوں نا لاؤں چندنا اتِ جاہریا لابنا
شہ جولایا چندنا چووا چولا مہکے
بولی جو آئی نوشہ کے میرا جیورا ہوکے
جاہی جوہی موگرا چن چن لایا مالی
کچھ کندری کچھ کھولے شہ تیرے تائیں تہالے
مائیں بہنیں مل کر دیویں آسیس
یہ بنا بنی جیوری کورلک پرے سیا
باجن تیرا باولا تج کارن تپے دھکے
نبی محمد مصطفیٰ سیں نور جگ میں جھکے

ترجمہ: شاہ باجن فرماتے ہیں کہ اے نوشا (پیر رحمت اللہ) تونے جب سے صندل لگایا (قرب حقیقی کی راکھ) تو اس کی خوشبو سے چولہ (تن بدن) مہکنے لگا۔ اے میرے نوشہ یہ خوشبو (قرب حقیقی) جب محمد مصطفیٰؐ تک پہنچی تو میرے دل سے ہوک (آہ) اٹھ کر وصل کی آگ میں (لذّتِ قرب) تبدیل ہوگئی۔ مالی (مالک) نے سہرہ (آرائش) کی خاطر موگرے، چنبلی، جوہی (تقویٰ، توکل، مجاہدہ) کے پھول چن چن کر بطور خاص لائے جو ادھ کھلے کچھ گدرائے (عیاں و نہاں) اور شگفتہ کلی کے طور پر عیاں ہیں۔ انھیں بہت چاہت کے ساتھ تیرے سہرے میں ٹانکا گیا ہے۔ جب تونے یہ سہرہ (صوف) زیب تن کیا تو تیری مائیں بہنیں اور اقارب (مریدین، شناسا عقیدت مند، مرد و خواتین) نے مل جل کر تجھے اور تیری دلہن (ریاضت) کو خوب دعاؤں سے نوازا (اظہار مسرت سے)۔ اے نوشہ باجن تیرا باولا (عقیدت مند) ہے اور تیری چاہت کی روشنی میں اس کا رُواں رُواں چمکتا دمکتا ہے جس طرح کہ محمدؐ کی وجہ سے یہ پوری کائنات نور سے جگمگا رہی ہے۔

اس مضمون کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے اردو سے دلچسپی اور ذوق مطالعہ کی تشنگی محقق و مبصر حضرات سے یہ گلہ کرتی ہے کہ زمانۂ قدیم سے آج تک کسی بھی دانش گاہ کے عالم نے دکن و برار کے مشرقی خطّے میں ادبی لحاظ سے خاطر خواہ جھانکنے کی اور (ہندی اردو) گنگا جمنی شاعری کے ابتدائی نقوش تلاشنے کی خاطر خواہ جہد کبھی نہیں کی۔

آیئے ہم ایک اور ایسی بزرگ ہستی سے متارف ہونے کا شرف حاصل کریں جو مجدد الف ثانی کے پوتے ہیں اور شاہ گل بہ تخلص وحدت کے مرید رہے ہیں۔ سعداللہ گلشن نسبی سلسلہ میں صحابی رسول حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

مولوی معین الدین ندوی نے اپنی تصنیف 'گہوارۂ علم دارالسرور مرکز روحانیت' میں ان بزرگ کی بابت تحریری معلومات اس طرح درج کی ہے۔

''مغل شہنشاہ اکبر کا گجرات پر جب تصرف ہوا اس زمانے میں آپ کے اجداد گجرات میں ممتاز عہدوں پر فائز تھے۔ حالات کی ستم ظریفی کے سبب خاندان برہان پور آکر بس گیا۔ یہیں پر آپ کی ولادت اور تعلیم و تربیت شیخ عبدالاحد کی خانقاہ میں ہوئی۔ آپ کی عبادت و ریاضت کے عوض خلافت تفویض ہوئی۔ سعداللہ گلشن برہان پور کے متوطن تھے۔ اس بات پر بھی محققین متفق ہیں۔

سعداللہ گلشن دین اسلام کے پابند متقی پرہیزگار باوصف ولی اللہ ہیں۔ آپ نے شرعی معاملات کو اپنے عقائد کے مطابق اس وقت کی قدیم اردو زبان سے مملو کرکے مشتہر کیا۔ کیونکہ آپ کا واعظانہ بیان اور شعری کلیات کی تاثیر ایسی پُراثر تھی جو دل سے گزر کے انسانی ذہنوں کو مسخر کرلیا کرتی تھی۔ آپ کے ایک مرید ولی گجراتی سے برہان پور اور اس کے اطراف میں ریختہ اردو گجری رواج پانے میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ لسانی جہد کی یہ تحیر خیزی ریختہ گوئی آپ کی شفقت کی محتاج رہی کیونکہ آپ دہلی چلے گئے اور اس دیار میں ایسے بسے کے دہلوی کہلائے جانے لگے۔ اس دیار یعنی دہلی میں آپ کے ایک مرید و شاگرد خواجہ عندلیب سے ہوتے ہوئے سعداللہ گلشن کے فیض سخن کا سلسلہ در سلسلہ خواجہ ناصر دہلوی کے توسط سے پھلتا پھولتا ہوا پنجاب تک جا پہنچا۔ اس آبیاری کے تسلسل سے خواجہ میر درد، داغ، شاہ نصیر، ذوق، مومن خاں مومن، بہادر شاہ ظفر، حسن آزاد، علامہ اقبال، نوح ناروی جیسے نامور شاداب و فیضیاب ہوئے۔ یہ ایک لڑی ہے جو شعری لحاظ سے سعداللہ گلشن سے جڑی ہوئی ہے۔ 'زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو' کے مصداق خواجہ

عندلیب دہلوی نے اپنے مرشدِ معنوی استاد سعداللہ گلشن برہان پوری کو کچھ اس طرح سے یاد کیا ہے۔

قدر ایں ناچیز را داند جناب عندلیب
گرچہ جزکا ہے نیم اتا گیاہ گلشنم

مطلب اس شعر کا لفظی طور پر یوں ہوا کہ جس طرح کسی بے آب و گیا میں ایک گھنے سایہ دار پیڑ کی حیثیت ہوتی ہے ٹھیک اسی طرح یہاں گلشنم یعنی سعداللہ گلشن کی ہے۔ یہ ناچیز جناب عندلیب جانتا ہے اور ان کی قدر کرتا ہے۔

تذکرہ نگاروں نے سعداللہ گلشن کو ایک ضخیم صاحب دیوان گردانتے ہوئے اشعار کی تعداد 2/لاکھ تحریر کی ہے یہ امر لائق تحقیق ہے۔ مزید یہ کہ انھیں موسیقی میں سازِ فطرت کا نباض مانتے ہوئے دوسرا امیر خسرو لکھا ہے۔ مختلف تذکرہ نگاروں سے حاصل منتخب اشعار بطور نمونہ پیش ہیں۔

حیرت بہار گلشن نظارۂ خودیم
آئینہ خانہ دل صد پارۂ خودیم
بچشم خویش نگر سحر سامری ایں است
نظر بہ آئینہ کن شیشہ پری ایں است
کشتم شہید تیغ تغافل کشیدنت
جانم زدست برد غزالہ نہ دیدنت
ماہ سالم بے تو در روز سیہ مستور بود
چوں نگاہ کور عمر من شب دیجور بود
سربہ دیوانگی سلامت باش
رازما راچہ پردہ پوشی کرد

1272 میں یہ طوطی سخن چہچہاتے ہوئے ابدی نیند سو گیا۔

صوبۂ مدھیہ پردیش کی مشرقی جنوبی سرحد پر دریائے تاپتی کے کنارے ست پڑا پہاڑ کے نشیبی دامن میں شہر برہان پور واقع ہے۔ اس خطے کی آبادی اپنے اولین زمانے میں پہاڑوں پر منڈا، سنتھالی اور جنگلوں میں بسیرا کرنے والے مختلف قبائلی جتھے گونڈ، بھیل، کورکوؤں پر مشتمل تھی۔ ان کا طرزِ حیات ٹھیک وضع کا نہ تھا حتیٰ کہ یہ پوری طرح سے ناخواندہ تھے۔ یہاں کے مناظر قدرت، وسائلِ فطرت، شاداب فضا دیگر مقامات سے آنے والوں کے لیے روحانی مسرت کا سبب ہوئی تو ان لوگوں نے مثلاً سلاطین، مذہبی مبلغین اور مختلف صنعت و حرفت کے پیشہ ور سیاحوں نے اس مقام کو اہمیت دی۔ ان میں سے کچھ اشخاص نے اس سرزمین کو اس قدر پسند کیا کہ اسے اپنا وطن ثانی بنالیا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے عوامل ہیں۔ یہاں کے قدیم مقامی لوگوں کے درمیان ان اشخاص نے اپنے روزمرہ کے معاملات کو استوار رکھنے کے لیے افہام و تفہیم کی خاطر لسانی مجاہدہ کیا۔ اس مجاہدے کے اثرات سے ان ناخواندہ لوگوں میں خوبصورت تبدیلی کے عناصر چھلکنے لگے۔ اس حیرت خیز پس منظر میں ہمیں فکر و عمل کا شعور احساس دلاتا ہے کہ ہمارے اسلاف کو لسانی مجاہدے کی خاطر کس قدر محنتِ شاقہ سے واسطہ رہا ہوگا۔ بہر حال ان تمام ہی لوگوں نے اپنی گوناگوں کارگزاریوں سے قبائلیوں کی طرزِ حیات یکسر بدل کر رکھ دیا اور ایسا رُخ دیا کہ یہ دیار گہوارۂ ادب، دارالادب، دارالعیار، دبستانِ ادب جیسے القاب سے تاریخ میں مرقوم ہوگیا۔

الغرض اس مضمون کو اور زیادہ وسعت نہ دیتے ہوئے اب آخر میں مختلف النوع ہمہ صفات معرکۃ الآرا تصنیفات کا گوشوارہ بطور اشاریہ لکھ کر اپنا فریضہ انجام دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔

1۔ شاہ عیسیٰ جنداللہ: روضۃ الحسنٰی، عین المعانی، رسالہ قبلۃ المذاہب، حاشیہ شرح ضیائیہ، فتح محمدی، تیمم شرح مائۃ العامل، رسالہ عقود، شرح رباعیات (اسرار الوحی)، مجمع البحرین، رسالۂ وقیقہ (قلمی نسخہ) کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے۔

2۔ شیخ علی متقی: تصنیفات کنزالعمال آٹھ ضخیم جلدوں پر مشتمل احادیث کی کتابیں ہیں جو کہ پورے برصغیر میں معروف ہیں۔

3۔ حافظ شجاع الدین: علم فقہ پر جامع کتاب کشف الخلاصہ میں تمام دینی مسائل منظوم کر کے تحریر کیا ہے۔

4۔ عزت اللہ (نبیرہ شاہ باجن): فقہ حنفی سے متعلق کتاب مرأۃ المسائل تصنیف کی ہے۔ اس کا فارسی قلمی نسخہ ادارہ اردو لائبریری حیدرآباد میں دیکھا جاسکتا ہے۔

5۔ شیخ فضل اللہ المعروف نائب رسول اللہ: تصنیف التحفۃ المرسلہ الی النبی، اس کتاب کی خصوصی اہمیت یہ ہے کہ بطور درس مصر میں عربوں کو پڑھائی جاتی ہے۔ اس کتاب کی تشریحات اور کئی ترجمے ہوئے ہیں۔ ملایا کے ایک انڈونیشی اہل قلم نورالدین راندیری نے ملایا زبان میں بھی ترجمہ کیا ہے۔

6۔ خواجہ محمد ہاشم کشمی: عربی فارسی میں ان کی کئی تصنیفات ہیں جو برٹش میوزیم لندن میں ہیں۔ 1027ھ میں زبدۃ المقامات تالیف کی ہے جو نولکشور پریس لکھنؤ سے دوسری بار جلد سوم مکتوبات ربانی لاہور پاکستان سے طباعت کی گئی ہے۔ غزلیات، رباعی اور نظموں کا قلمی نسخہ، کلیات ہاشم کشمی، ممبئی میں ملا فیروز پارسی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ ایک تصنیف ملفوظات کی جواہرِ ہاشمیہ بھی تالیف کی ہے۔

7۔ ملا شیخ نظام: مصنف فتویٰ عالمگیر (عربی) یہ شاہکار کتاب پورے برصغیر میں اپنا منفرد مقام رکھتی ہے۔ انگلش ایڈیشن بنام محمڈن لا، شائع کی گئی ہے۔ اردو زبان کے علاوہ اور کئی زبانوں میں ترجمے ہو کر مقبول خاص و عام ہے۔

شہنشاہ اورنگ زیب کی فرمائش پر یہ شرعی احکام پر مبنی کتاب تصنیف کی گئی جو عربی زبان میں تھی۔ اس وقت کے علمائے کرام کا ایک بورڈ دینی کاموں کے لیے تشکیل کیا گیا جس کے صدرالصدور ملا نظام بنائے گئے اور بادشاہ کی جانب سے مقرب خاں کا لقب پا کر انعام و اکرام سے نوازے گئے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ قسط وار وعالمگیر پبلشرز دیوبند سے مشتہر ہوا کرتا تھا۔ اسے شاہ عبدالرحیم فرزند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی نظرِ ثانی کے بعد کتابی صورت میں شرعی احکام کے نفوذ کی پابندی کے لیے اردو میں شائع کیا گیا۔

8۔ مفتی خیرالدین صدیقی: آپ شیخ الشیوخ، ولی کامل شاہ محمد بن فضل اللہ کے پوتے ہیں۔ آپ کی ذات گرامی ایک متبحر عالم دین کی ہے۔ مختلف ریاستوں کے شہر میں منصب افتیٰ پر فائز رہے ہیں۔ شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ آپ نے ایک مثنوی فقہ کے مسائل پر نظم کر کے فقہ ہندی کے نام سے قلمبند کی۔ اس کا ایک نسخہ مولوی نورالحسن سارنگ پوری کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ یہ قلمی نسخہ 340/اشعار پر مشتمل 1728 کی تصنیف ہے۔ گیان چند جین نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میر تقی میر کی عمر جب کہ 16/سال کی تھی اس اردو کے ابتدائی زمانے میں برہان پور کا ایک شاعر جو ولی دکنی کا ہمعصر ہے 340/اشعار کی ایک مکمل مثنوی لکھ رہا ہے۔

9۔ حکیم محمد اکبر ارزانی:۔ 1082ھ میں علم الادویہ پر ایک مفصل کتاب 'طب اکبر' دو ضخیم جلدوں پر آپ نے شہنشاہ اورنگ زیب کی فرمائش پر لکھی اور اس کے عوض اعزاز و انعام سے نوازے گئے۔ معالجوں کے فن طبابت اور ان کی آسانی کے لیے ادویات کے نسخوں کی تیاری، علاج و معالجہ کے دوران مقدار خوراک، مرض اور اس کی نوعیت یعنی کہ تشخیص و علاج کے بابت کئی کتابیں لکھی ہیں۔ کیونکہ آپ کو خدمتِ خلق کے علاوہ فنِ طبابت سے گہرا لگاؤ تھا۔ آپ کی یہ تحریری کتابیں آج بھی طبیہ کالجوں میں بطور درس پڑھائی جاتی ہیں۔ شہر برہان پور میں عہد عالمگیری میں یہاں سکونت اختیار کرتے ہوئے عمر عزیز گزاری اور یہیں پر آسودۂ خاک ہوئے ہیں۔ راقم کے مشاہدہ کے مطابق یہاں کچھ باذوق محقق، مترجم، مبصر اور لیاقت مند ریسرچ گائیڈ حضرات ہیں لیکن سست گام ہے۔ اس شہر کی کم نصیبی ہے کہ 1947 کے بعد سے تاحال حوصلہ مند نثاروں کی قلت یہاں رہی ہے۔ ورنہ شہر برہان پور میں اتنے جواہر پارے بکھرے پڑے ہیں کہ انھیں سمیٹ کر گراں مایہ انبار لگا سکتے ہیں۔

■

Bismillah Adeem Burhanpuri
Sant Kabeer Marg, Juwaihari Wara
Mahajna Pet,
Burhanpur-450331
Mob:9630174593

ریڈیو کی دنیا کا گوہر تابدار
شفاعت علی صدیقی

شاہد حبیب

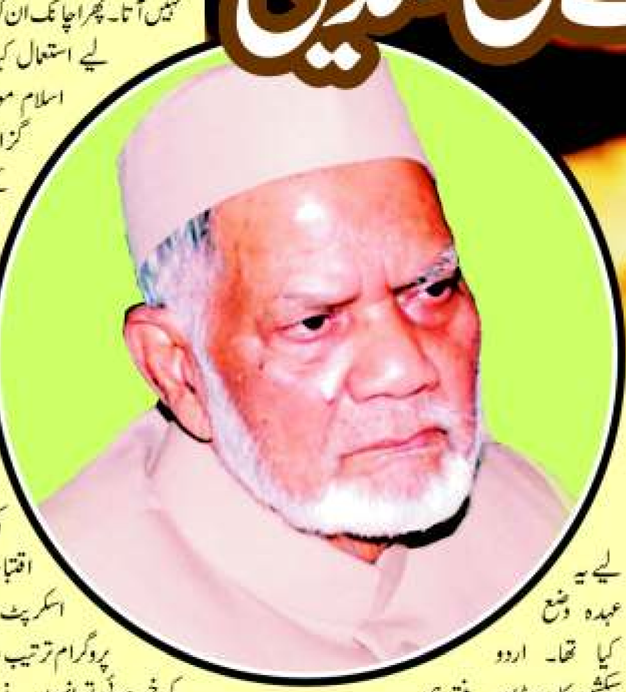

پلاننگ کمیشن نے اپنے بارہویں پنج سالہ منصوبے (2012-2017) میں جن تین چیزوں پر اپنی توجہات مرکوز کی تھیں، ان میں ایک سماجی شمولیت (Social Inclusion) بھی تھا۔ کیونکہ پلاننگ کمیشن کا احساس تھا کہ ہندوستان ترقی تو کر رہا ہے لیکن سماج کے سبھی طبقے یکساں طور پر ترقی نہیں کر رہے ہیں۔ شفاعت علی صدیقی (1929-2018) نے بطور براڈ کاسٹر جن موضوعات کو چھوا تھا، اس کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جس چیز کو پلاننگ کمیشن نے اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں محسوس کیا، اسے شفاعت علی صدیقی بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں ہی پوری آگہی کے ساتھ محسوس کرنے لگے تھے۔ شفاعت صاحب ہمارے درمیان نہیں ہیں، لیکن آل انڈیا ریڈیو کی گیلریوں میں محفوظ اپنی توانا آواز کے ساتھ وہ ہمیشہ ہمارے ساتھ موجود رہیں گے۔

ہندوستان میں آل انڈیا ریڈیو کی نشریات کا آغاز یکم جنوری 1936 کو بمبئی کے علی پور روڈ سے ہوا تھا اور شفاعت علی صدیقی 1945 میں جب وہ سولہ سال کی عمر کے تھے اور نویں جماعت کے طالب علم تھے، بطور اسٹاف آرٹسٹ آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہو گئے تھے۔ پھر محکمہ جاتی امتحانات کے ذریعے ترقی پاتے ہوئے پروگرام سکریٹری، اناؤنسر، پروڈکشن اسسٹنٹ، اسکرپٹ رائٹر سے ہوتے ہوئے اردو سیکشن کے پہلے پروگرام پروڈیوسر بنائے گئے۔ ان کی قابلیت اور آواز پر گرفت کو دیکھتے ہوئے ارباب مجاز نے 1971 میں بطور خاص ان کے لیے یہ عہدہ وضع کیا تھا۔ اردو سیکشن کا پروڈیوسر بنتے ہی ان کے خلاقانہ ذہن کو اڑنے کے لیے ایک کھلا آسمان مل گیا تھا۔ پھر کیا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے آکاشوانی کا لکھنؤ کیندر ہندوستان بھر کا سب سے زیادہ کریٹیو مرکز بن گیا۔ ان کے نئے نئے تجربات کو عوام نے بے پناہ پیار تو دیا ہی، محکمہ جاتی سطح پر بھی ان کے تخلیقی جہان کی نیرنگیوں کو سراہا گیا۔ 1974، 1977 اور 1981 میں تین بار آکاشوانی کے نیشنل ایوارڈ سے سرفراز کیے گئے۔ 31 جولائی 1987 کو ریٹائر تو ہو گئے اور پروڈیوسر ایمرٹس بھی بنائے گئے، لیکن اپنی مدت کار کے دوران ریڈیو کے کلیدی عہدوں پر نہ رہتے ہوئے بھی اپنے محدود دائرہ کار کو جس طرح وسعت انھوں نے دی، اسے براڈ کاسٹنگ کی دنیا کے قوت تخیل کے پنکھ لگنے سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

فرزانہ اعجاز کو دیے ایک انٹرویو میں شفاعت علی صدیقی نے اس طرح کے کئی پروگراموں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے چند کا ذکر اختصار کے ساتھ یہاں پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

بارہ ربیع الاول کے موقعے پر لکھنؤ میں جس طرح کی گہما گہمی ہوتی ہے اور جذباتیت کا مظاہرہ ہوتا ہے، اس سے بچنے کی تدبیر ہمارے دانشور بارہا کرتے رہے ہیں۔ شفاعت علی صدیقی نہ تو دانشور تھے اور نہ ہی کوئی مذہبی یا سیاسی قائد۔ لیکن اس طرح کے ماحول سے ہر دردمند دل رکھنے والے کی طرح ان کو بھی تکلیف ہوتی تھی۔ کچھ کرنا چاہتے۔ وہ کسی ایسے منصب پر فائز نہ تھے کہ کچھ کہیں اور لوگ سن لیں۔ پھر بھی کچھ کرنا تو تھا، لیکن کیا کریں سمجھ میں نہیں آتا۔ پھر اچانک ان کو خیال آیا کہ ریڈیو کو اس کے لیے استعمال کیا جائے۔ انھوں نے مفکر اسلام مولانا علی میاں ندوی سے گزارش کی کہ بارہ ربیع الاول کے موقع کے لیے آپ کچھ تحریر فرما دیں۔ مگر مولانا کسر نفسی کی وجہ سے اس پیشکش کو قبول نہ کرنے کا عذر پیش کرتے رہے۔ آخر جب وقت آ گیا تو شفاعت صاحب نے دوستوں کی مدد سے مولانا کی مختلف کتابوں کے اقتباسات کو سامنے رکھ کر ایک اسکرپٹ تیار کر لیا اور ایک اچھا خاصا پروگرام ترتیب دے لیا۔ جب مولانا کو اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے اس پریزینٹیشن کو ایک بار ملاحظہ کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ جب مولانا کے سامنے یہ پیش ہوا تو کافی خوش ہوئے۔ یہ پروگرام 1974 کو بارہ ربیع الاول کے موقع سے 'بارگاہِ رسالت مآب میں' کے عنوان سے نشر ہوا۔ اس پر شفاعت صاحب کو پہلی بار آکاشوانی کا نیشنل ایوارڈ دیا گیا۔ اسی طرح سے انھوں نے 1977 میں امیر خسرو پر اور 1981 میں 'قدم قدم لہو' کے نام سے گاندھی جی کی یوم شہادت کے موقعے پر خصوصی پروگرام پیش کر کے آکاشوانی کا نیشنل ایوارڈ حاصل کیا تھا۔

لکھنؤ میں مرثیے کی مجلسوں کی ایک پوری تاریخ رہی ہے اور یہ روایت اب بھی مستحکم ہے۔ لیکن اس کی مقبولیت کو دور دور تک متعارف کرایا شفاعت صاحب کے ریڈیو پروگرام 'شام غریباں' نے۔ اندھیری راتوں میں مرثیے کی مجلسوں کو جب براہ راست (Live) ریڈیو سے نشر کیا جاتا تو بتانے والے بتاتے ہیں کہ بھوکے پیاسے مجاہدین کے قافلے کو لوگ اپنی آنکھوں کے سامنے چلتا ہوا محسوس کرنے لگتے۔

لکھنؤ کے آس پاس بسے بہت سے ایسے قصبات

ہیں جو اودھ کی تابناک تاریخ کے اہم باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان کی اہمیت اور ان کے مسائل سبھی کچھ اہل نظر، نئی نسل اور ارباب اقتدار سے مخفی ہوتے جا رہے تھے، شفاعت صاحب نے اس کو محسوس کیا اور 'بستیاں ہماریاں' کے عنوان سے ایک پوری سیریز شروع کر دی۔ پروگرام کی مقبولیت اتنی بڑھی کہ اس کے کل 37 ایپی سوڈ براڈ کاسٹ ہوئے۔

کلاسیکی ادبیات کے مطالعے کے بغیر کوئی بھی شخص زبان پر عبور کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ لیکن مسئلہ تب بھی تھا اور اب بھی ہے کہ نئی نسل تو چھوڑیے ہمارے صاحبان علم وفن بھی اس سے گریز ہی کرتے رہتے ہیں۔ شفاعت صاحب نے اس چیز کو محسوس کیا اور 'بولتی تحریریں' کے عنوان سے ایک فیچر پروگرام بطور خاص نشر کرنا شروع کر دیا۔ باغ و بہار، فسانۂ آزاد، زہر عشق اور امراؤ جان ادا جیسی اہم ترین کتابوں کو آواز دینا شروع کیا۔ آج جب میں آڈیو بک مہیا کرنے والی امیزون کی ماتحت کمپنی 'آڈیبل' کو دیکھتا ہوں تو شفاعت صاحب کا یہ پروگرام 'بولتی تحریریں' بےحد تڑپا جاتا ہے۔ کاش ہماری بقیہ کلاسیک اور جدید کتابوں کو بھی اسی طرح آواز دے دی گئی ہوتی تو ہمارے اسکالرس میں اور تھوڑی علمی گہرائی کی جھلک رہی ہوتی۔

اسی قبیل کا ایک اور پروگرام شفاعت صاحب نے شروع کیا تھا 'کتابیں جو زندہ ہیں' کے نام سے۔ اس میں وہ کتابیں جو آج بھی اپنی مسلمہ اہمیت رکھتی ہیں، اس پر تعارف وتبصرہ نشر کرتے۔ اس کے تحت شبلی نعمانی کی الفاروق وغیرہ پر انھوں نے ریڈیائی تبصرے براڈ کاسٹ کیے تھے۔

'اودھ میں اردو غزل کا سفر گزشتہ صدی میں' شفاعت صاحب کا ایک مقبول عام پروگرام تھا۔ نام سے ہی اس کی اہمیت واضح ہے۔ کل گیارہ ایپی سوڈ اس کے بھی نشر ہوئے تھے۔

آج ہندوستان میں بسی دو قوموں کے درمیان جس تیزی کے ساتھ فاصلے بڑھ رہے ہیں، اس پر ہم صرف افسوس کا ہی اظہار کر رہے ہیں لیکن شفاعت صاحب نے صرف افسوس کر کے اپنی ذمہ داریوں سے چشم پوشی کی راہ نہیں اپنائی۔ جبکہ اس زمانے میں شاید فاصلہ اتنا بڑھا نہیں تھا، اس کے باوجود انھوں نے اس پر منتھن کیا اور ریڈیو کی طاقت کو استعمال میں لانے کی ٹھانی۔ 'یکجہتی کے مرکز' کے نام سے انھوں نے ایسے تہذیبی شہروں پر پروگرام نشر کیے جہاں صدہا سال سے دونوں قومیں شانہ بشانہ اپنی زندگی کی گاڑی کو آگے بڑھاتی آ رہی ہیں۔ شفاعت صاحب نے بنارس اور الہ آباد (اب پریاگ) جیسے شہروں کی تہذیبی یکجہتی کے عناصر کو بنیاد بنا کر عوام الناس کو ایک ساتھ رہنے اور زندگی گزارنے پر ابھارا۔

اردو میں سائنسی مواد کی کمی اور سائنس سے جڑے اداروں کے بارے میں عدم واقفیت کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے شفاعت صاحب نے 'لکھنؤ کے سائنسی ادارے' نام سے ایک باضابطہ پروگرام نشر کیا۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ آئین ہند میں ایک شہری کے لیے سائنسی مزاج اپنانے کو بنیادی فرائض (Fundamental Duties) میں شمار کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ شفاعت صاحب نے ہی پہلی بار صدر جمہوریہ ہند اور وزیر اعظم کے اسفار کی ریڈیو کمنٹری پر مشتمل پروگرام نشر کرنا شروع کیا تھا۔ جسے سوشل میڈیا کے اس عہد میں بھی آکاشوانی نے برقرار رکھا ہے۔

ہمارا ملک اپنی وسعت کے لحاظ سے دنیا کا ساتواں بڑا ملک ہے اور اتر پردیش ملک کا چوتھا بڑا پردیش۔ دو لاکھ تینتالیس ہزار مربع کلومیٹر کے وسیع وعریض پردیش کی وسعت تقسیم سے قبل مزید 53 ہزار مربع کلومیٹر زیادہ تھی۔ ایسے میں دور دراز کے پہاڑی علاقوں کی ہمیشہ شکایت رہتی تھی کہ لکھنؤ والے ہمارے مسائل سنتے ہی نہیں ہیں۔ شکایتیں تو ہوتی رہتی ہیں، کیا فرق پڑتا ہے! لیکن نہیں، شفاعت علی صدیقی کو اس سے فرق پڑتا تھا۔ انہوں نے سماجی شمولیت (Social Inclusion) کی ایک اور عمدہ مثال پیش کی اور ایک بار پھر ریڈیو کی طاقت کو بروئے کار لائے۔ اس بار انھوں نے 'اترائن' کے نام سے پہاڑی علاقوں کے مسائل اور ان کی آواز کو لکھنؤ کے ارباب اقتدار تک پہنچانے کا بیڑا اٹھایا۔ یہ پروگرام موجودہ اتراکھنڈ کے 53 ہزار مربع کلومیٹر کے بیشتر گھروں میں سنا جاتا تھا۔ شفاعت صاحب کا کام ارباب اقتدار تک آواز پہنچانے کا تھا، وہ پہنچاتے رہے۔ مسائل کا تصفیہ ان کے دائرہ اختیار سے باہر تھا۔ جب تک وہ اپنی آواز ان تک پہنچا کر ان کو مرکز سے جوڑے رکھ سکتے تھے، رکھا۔ ان پہاڑی علاقوں میں بسے لوگوں نے زور وشور سے الگ ریاست کی مانگ کرنی شروع کر دی اور اپنے ساتھ ناانصافی کا الزام لگا کر خود کو 9 نومبر 2000 کو اتر پردیش سے الگ کر لیا۔ آخر 2012 میں پلاننگ کمیشن نے مان لیا کہ ہندوستان کا ہر علاقہ یکساں طور پر ترقی نہیں کر رہا ہے، اس لیے سماجی شمولیت پر دھیان دیا جائے اور سب کو یکساں ترقی کا موقع فراہم کرایا جائے۔ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ شفاعت علی صدیقی نے سماجی شمولیت کے معاملے میں بروقت دوراندیشی کا مظاہرہ کیا تھا......؟

لکھنؤ کی مشہور زمانہ 'چکن کاری' کو شہرت عام بخشنے کے لیے شفاعت صاحب نے ایک مخصوص پروگرام 'دھاگے کے پھول' کے عنوان سے براڈ کاسٹ کیا تھا، جس میں وہ اس ہنر سے جڑے باکمالوں سے انٹرویو کر کے اس کی باریکیوں کو پہلی بار منظر عام پر لانے کی کوشش کی تھی۔ چکن کاری کے علاوہ بھی لکھنؤ ایک زمانے میں مختلف صنعت وحرفت کا ایک مرکز سمجھا جاتا رہا ہے۔ یہاں کی صنعت وحرفت سے جڑے لوگوں کا تعارف، ان کے مسائل اور ان کے تاریخی پس منظر سے واقفیت بہم پہنچانے کے لیے شفاعت علی صدیقی نے ایک خاص پروگرام 'لکھنؤ کے محلے، گلی گلی آباد تھی جن سے' کے نام سے ترتیب دیا تھا۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ سماجی سطح پر اس کی فکرمندی شفاعت علی صدیقی جیسے باشعور افراد کا ہی کارنامہ ہو سکتا ہے۔

ریڈیو کے کسی کلیدی عہدے پر نہ رہتے ہوئے بھی شفاعت صاحب کے ان متنوع پروگراموں کے بعد آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ انہوں نے اپنی تخلیقی ذہانت اور باوقار آواز کی بدولت کس قدر عوامی مقبولیت کو بٹورا تھا۔ لیکن جیسا کہ ہوتا آیا ہے کہ اس طرح کے کاموں سے جڑے شخص سے ہر کوئی خوش نہیں ہوتا اور ہر ایک کو خوش بھی نہیں کیا جا سکتا۔ Nepotism یعنی اقربا پروری کا الزام لگ جاتا ہے، سیکڑوں شاعروں اور ادیبوں کو ریڈیو کے ذریعے متعارف کرانے کے باوجود شفاعت علی صدیقی بھی اس الزام سے نہ بچ سکے۔ کئی لوگوں کی شکایت تھی کہ شفاعت صاحب صرف اپنے ہم وطنوں کو یا پھر دوستوں کو ہی ریڈیو پر بلاتے ہیں۔ یہ الزام تو اس وقت اور بھی تیکھا ہو گیا جب شفاعت صاحب نے ڈاکٹر سلام سندیلوی کے نغموں اور گیتوں کو گلوکاروں کی آواز میں ریکارڈ کروا کر ریڈیو سے نشر کیا۔ کاش وہ اس طرح کے مزید دو چار بڑے شاعروں کو اسی طرح ریکارڈ کرواتے اور براڈ کاسٹ کرتے تو شاید اس طرح کے الزامات کے تشفی بخش جواب دیے جا سکتے۔ لیکن وہ بھی ایک انسان تھے اور کوئی انسان بشری لغزشوں سے کیوں کر مبرا ہو سکتا ہے!!

ان سب کے باوجود شفاعت علی صدیقی کے متعلق بہت کچھ پڑھنے اور سننے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ آکاشوانی کے ساڑھے چار سو ریڈیو اسٹیشنوں میں سے نصف میں بھی ایک ایک شفاعت علی صدیقی پیدا ہو جائیں تو نہ صرف ہندوستان میں سماجی شمولیت کی راہ آسان ہو جائے گی بلکہ آل انڈیا ریڈیو کا مارکیٹ شیئر ریڈیو مرچی اور ریڈیو سٹی کے مقابلے میں کئی گنا بڑھ جائے گا۔

■

Shahid Habib
Research Scholar, Maulana Azad National Urdu University, Lucknow Campus
Lucknow - (UP)
Email: shahidhabib.rs@manuu.edu.in

اقبال مجید کا فن

عشرت لطیف

اقبال مجید نے تقریباً پینتیس یا چالیس سال تک اپنی ادبی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے سے افسانہ نگاری شروع کردی تھی مگر اس زمانے میں جب ان کا ایک افسانہ رسالہ 'شاہراہ' میں ظ انصاری کے تعارفی کلمات کے ساتھ شائع ہوا تو لوگوں نے توجہ دینی شروع کی۔ ان کے انتقال تک ان کا ادبی سفر جاری رہا۔ جب ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'دو بھیگے ہوئے لوگ' چھپا تھا تو ان کے فن پر غور و خوض کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ اس مجموعے میں شامل افسانہ جس کے نام سے یہ مجموعہ بھی موسوم ہے ایک طرح سے تمثیلی اور علامتی افسانہ تھا۔ اس لیے ترقی پسندوں کے حلقے میں شامل ہونے کے باوجود اقبال مجید کو جدیدیت کے رجحان سے متاثر لوگوں نے بھی پسند کرنا شروع کردیا۔ اس افسانہ میں دو کرداروں پر مبنی جو تفصیلات لکھی گئی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال مجید کرداروں کی نفسیات اور اندرونی سوچ سے کتنی گہری واقفیت رکھتے تھے۔ اس کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفے سے ان کے کہیں کہیں افسانوی مجموعے شائع ہوئے جن میں خاص مجموعے یہ ہیں: دو بھیگے ہوئے لوگ (1970)، ایک حلفیہ بیان (1980)، تماشا گھر (2003)، شہر بدنصیب (1997)، خاموش مکالمہ (2007)

اقبال مجید نے یوں تو سماجی وابستگی کے افسانے زیادہ لکھے اور اسی لیے ان کو ترقی پسند افسانہ نگاروں میں شمار کیا جاتا رہا لیکن ان کے اسلوب بیان اور افسانوں میں علامتی اور استعاراتی رویے کی وجہ سے انھیں جدیدیت پسند مصنفین کی تعریف و توصیف بھی ملتی رہی۔ اقبال مجید کو اسی لیے ایک بڑا ادبی حلقہ ترقی پسندوں کے خانے میں رکھ کر نہیں دیکھتا اس لیے کہ جدیدیت کے زیر اثر نہیں بلکہ وہ اپنے انداز تحریر میں شروع سے ہی بیانیہ کے قائل تو ضرور رہے لیکن بیانیہ کے ساتھ تہہ داری کو برتنا ان کے مزاج میں شامل تھا۔ دو بھیگے ہوئے لوگ کو پڑھ کر کوئی بھی اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس میں افسانہ نگار کا رویہ سپاٹ اور اکہرے پن کے بجائے تہہ دار اور علامتی زیادہ ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت تو بہت سے لوگ ترقی پسند موضوعات پر افسانہ لکھ رہے تھے لیکن اقبال مجید کے موضوعات سماجی مسائل کے قریب ہونے کے باوجود ہمیشہ انسانی اور اخلاقی نوعیت کے رہے۔ انھوں نے افسانوں کے علاوہ تین ناول بھی لکھے جن میں 'نمک' نام کے ناول کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان افسانوں اور ناولوں کے علاوہ انھوں نے انگنت ریڈیائی ڈرامے بھی لکھے۔ ان کا پہلا ڈرامہ 'کتے' ہے دوسرا ڈرامہ 'چاندنی کا زہر' ہے جس میں سلطنتِ اودھ کے زوال کی داستان کا بیان ہے اس کے علاوہ 'سر پھنا' اور 'تکیہ' کا شمار بھی ان کے ڈراموں میں ہوتا ہے۔ ان کو ڈرامے لکھنے اور اسٹیج کرانے سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ انھوں نے اپنی ادبی تربیت کے بارے میں چند باتیں اس طرح سے لکھی ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ میری ادبی تربیت ترقی پسند تحریک کے زیر سایہ ہوئی لیکن میں وہ ڈرپوک ترقی پسند نہ تھا جس کے افسانے شب خون جیسے رسالے میں چھپنے سے ترقی پسندوں کا دھرم بھرشٹ ہو جایا کرتا تھا۔ کہانیاں لکھنے کے لیے آدمی کو شبلی یا حالی ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی کہانی لکھنے کے لیے کتابوں سے زیادہ انسان کا علم ہونا ضروری ہے۔''[1]

اقبال مجید نے ایک ترقی پسند ادیب کے طور پر اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا۔ شروع میں ان کے زیادہ تر افسانے ظلم و جبر کے خلاف احتجاج کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔ ایسے افسانوں میں ان کا انداز بیان پوری طرح غیر استعاراتی اور وضاحتی ہے۔ جب 1960 کے بعد اردو افسانوں میں علامتی اور تمثیلی انداز زیادہ رائج ہوا تو ان کو جدیدیت سے وابستہ اسلوب کو اپنانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انھوں نے انتظار حسین وغیرہ کے بھی کچھ اثرات قبول کیے۔ اسی زمانے کے افسانوں میں انھوں نے لوک کتھاؤں اور پنچ تنتر کی کہانیوں کے موضوعات کو بھی برتنے کی کوشش کی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اقبال مجید نے ہندوستان کی روایتی کہانیوں سے بھی کافی استفادہ کیا اور وہ اس بات پر قدرت رکھتے تھے کہ اگر چاہتے تو خاص بیانیہ انداز کے افسانے لکھتے اور اگر چاہتے تو تہہ دار اسلوب کو اپناتے۔ ظاہر ہے کہ تہہ دار اسلوب کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بعض پرانے اساطیر اور تسلیم شدہ حکایتوں کو اپنے افسانوں میں تمثیل کے طور پر استعمال کیا جائے اور اس طرح کی تمثیلوں اور استعاروں کو اپنے زمانے کی صورت حال اور سماج میں رائج ناپسندیدہ رویوں کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا جائے۔ ان کا ایک بہت مشہور افسانہ ہے 'حکایت ایک نیزے کی' یا اسی طرح سے ان کا دوسرا افسانہ ہے 'ایک حلفیہ بیان'۔ ان دونوں افسانوں میں اقبال مجید نے بڑی فنکاری اور چابک دستی سے استعاروں اور علامتوں میں اپنی بات کہنے کی کوشش کی ہے۔ 'ایک حلفیہ بیان' تمثیل نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں ایک کیڑے کے پلٹ جانے اور پھر پلٹا کھا کر سیدھا ہوجانے کے اضطراب کو بیان کیا گیا ہے اور اس اضطراب کی علامت میں انھوں نے جبر سے ستائے ہوئے لوگوں کے اضطراب کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اس افسانے میں ڈرامائی عناصر بھی کافی آ گئے ہیں۔ ان کے افسانوں کا ایک بڑا امتیاز یہ بھی ہے کہ ان کی نثر بڑی پُر قوت اور اثر انداز ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہر زمانے میں اپنے افسانوں کے سبب ایک اہم فنکار کے طور پر اپنا لوہا منوایا۔

جیسا کہ پروفیسر قمر رئیس اقبال مجید کے فن پر لکھتے ہیں:

''اقبال مجید کسی اور کے نہیں خود اپنے مقلد ہونے سے بھی منکر ہیں۔ اپنے شب و روز کے زبان دینے کی تڑپ انھیں خود اپنے فن کے حصاروں سے باہر کھینچ لاتی ہے یہی وجہ ہے کم و بیش ہر کہانی میں اظہار بیان کا کوئی نیا اسلوب ایسے امکانات تلاش کر لیتا ہے اور وہ اس لیے کہ اپنی کہانی میں خواہ وہ کوئی چونکا دینے والی بات نہ کہیں لیکن اپنے عہد کی انسانی صداقتوں کو کسی نئی جہت سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ افسانے کی روایت اور اس کی وحدت کے تصور سے کسی نو آموزانہ بغاوت کے بغیر وہ افسانہ کو ایک نئی جمالیاتی فضا سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔''[2]

اقبال مجید نے کبھی کوئی افسانہ ذاتی یا سماجی طور پر کسی خاص نقطۂ نظر کے بغیر نہیں لکھا۔ وہ جدید زندگی کے بعض غیر انسانی اور غیر اخلاقی رویوں کو بڑی شدت سے محسوس کرتے تھے۔ تعلیم کے نظام میں جس طرح کا

زوال آ گیا ہے۔ اس موضوع پر انھوں نے ایک سے زیادہ افسانے لکھے اسی طرح نئے کلچر اور جدید زندگی کی افراتفری پر بھی وہ گہری نگاہ رکھتے تھے۔ ان کے ناولوں میں اس موضوع پر کرداروں کے حوالے سے خاصی تنقید ملتی ہے۔ ان کے ممتاز افسانوں میں 'آگ کے پاس بیٹھی عوت'، 'زلزلہ'، 'شیر بدنصیب' کو اس لیے بھی زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ ان میں عصری حسیت کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ ان میں موجودہ تعلیمی نظام پر بھی تنقید ہے اور 'صارفی کلچر' سے ہونے والے زوال کا بھی گہرا احساس ملتا ہے۔ اقبال مجید نے جو ڈرامے لکھے ہیں ان میں نئی شہری زندگی کے مسائل اور اخلاقی اقدار کے زوال کو موضوع بنایا گیا۔ چونکہ وہ ریڈیو کی ملازمت سے وابستہ رہے اس لیے ریڈیائی ڈرامے لکھنے اور نشر کرنے کا ان کا خاصا لمبا تجربہ تھا۔

انھوں نے جو کہانیاں لوک کہانیوں سے متاثر ہو کر لکھی ہیں ان میں بھی انسان کی سفاکی، لالچ، ہوس اور فریب کاری کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اقبال مجید کی کہانیاں پڑھیں تو پتہ چلتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو کیسے دہراتی ہے اور ہمارے سماج میں رائج پرانی کہانیاں آج کی صورت حال پر کیسے صادق آجاتی ہیں۔ اس طرح کی کہانیوں میں 'حکایت ایک نیزے کی' جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے کو شمار کیا جا سکتا ہے۔ اقبال مجید کی لوک کہانیوں پر مبنی اور ایک کہانی جس کا عنوان 'ہم گریہ سر کریں گے' ہے جس میں ظلم و زیادتی کے خلاف احتجاج کرنے والے مظلوموں کے دردناک انجام کو دکھایا گیا ہے۔

ان کے بعض افسانوں کے سلسلے میں پنچ تنتر کی کہانیوں سے استفادے کی بات پہلے آ چکی ہے لیکن لوک کتھاؤں سے ان کے استفادے کی نوعیت بالکل مختلف تھی۔ وہ پرانی روایتی کہانیوں سے مرکزی خیال یا بنیادی فکر کو اپنی کہانیوں میں استعمال تو کرتے تھے۔ لیکن اس کا پس منظر پوری طرح تبدیل کر دیتے تھے۔ اسی لیے اکثر کہا جاتا ہے کہ ان کا ہر افسانہ ان کے زمانے اور صورت حال کا عکس پیش کرتا ہے۔ ان کو افسانے کے فن پر جو قدرت حاصل تھی اس کی نمائندگی ان کی تقریباً ہر تحریر میں ملتی ہے۔ ان کے بعض افسانے خصوصیت سے اس لیے بھی قابلِ ذکر ہیں کہ ان میں بحیثیت مصنف یا راوی کے وہ اپنی ذات کو کم سے کم داخل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور مختلف کرداروں کے حوالے سے افسانے کے مرکزی موضوع کو غیر جانبداری سے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے بعض افسانوں مثلاً 'جنگل کٹ رہے ہیں'، 'دیوار پر جڑی تختیاں' یا 'پھر مچھلیوں کا کھیل' کا حوالہ دینا زیادہ مناسب ہوگا۔ جس زمانے میں ہندوستان میں ایمرجنسی لگی تھی تو اس زمانے میں 'پوشاک' کے نام سے ایک زبردست اور اثر انگیز افسانہ انھوں نے لکھا تھا جس کو خاص مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی اس لیے کہ اس میں سیاسی نظام کے جبر اور احتجاج کو دبانے پر شدید طنز کیا گیا تھا۔

اقبال مجید کا ذہن معلومات کا خزانہ ہے جو ان کے مطالعے اور مشاہدے کا نتیجہ ہے۔ ان کی جھلک ہمیں ان کے افسانوں میں بخوبی ملتی ہے۔ اس سلسلے میں نکہت ریحانہ رقمطراز ہیں:

''اقبال مجید کا تاریخی شعور کافی نکھرا ہوا ہے ساتھ ہی وہ اپنے عہد کے ہر قسم کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات سے آگہی اور واقفیت رکھتے ہیں جن کے سبب ان کے موضوعات میں تنوع پیدا ہو گیا ہے اور موضوع جو بھی ہو اس کی پیشکش میں اقبال مجید کسی قسم کی لفاظی سے کام نہیں لیتے بلکہ مخصوص، نرم رواں، ملائم اور لطیف انداز سے ایسے پیش کر دیتے ہیں وہ کہانی کہنے کے فن سے بخوبی واقف ہیں اور کہانی کے موضوع اور تکنیک میں ہم آہنگی کی تلاش میں بڑی تگ و دو کرتے ہیں۔''[3]

اقبال مجید نے انتظار حسین سے جو اثرات قبول کیے ہیں اس سلسلے میں نمونے کے طور پر ان کے افسانے 'سوئیوں والی بیوی' کے حوالے سے ذکر کیا جا سکتا ہے جو انتظار حسین کے مشہور افسانے 'زرد کتا' سے ملتا جلتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ انتظار حسین نے اپنے افسانے میں بزرگوں کے اقوال اور ملفوظات کے حوالے دیے ہیں جبکہ اقبال مجید نے اپنے اس افسانے کا تھیم بابا فرید گنج شکر کے قول 'مجھے قینچی نہیں دھاگہ دے دو' سے لیا ہے۔ اس افسانے میں قینچی کو کاٹنے والی چیز اور دھاگے کو جوڑنے والی چیز کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانے میں قینچی کو نفس امارہ کی علامت بنایا ہے اور سوئی دھاگے کو خدمت خلق کی۔ اخیر میں ان کے ایک افسانے 'آگ کے پاس بیٹھی ہوئی عورت' کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جس میں حقیر اور اچھوت لوگوں کے مسائل پر ایک فلم ساز کمپنی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

''آگ کے پاس بیٹھی عورت صرف آنکھیں کھولے سہا دینے والی بجلیاں چمکا کر ہمیں دیکھ لیا کرتی تھی وہ آنکھیں اپنے مقابل کی نظریں جھکا دینے والی آنکھیں تھیں۔ لگتا تھا زندگی کے حوادث نے کوٹ کوٹ کر ان میں بصیرت بھر دی ہے۔ اس بصیرت میں ایک مقناطیسی زور اور کشش تھی۔ وہ آنکھیں اپنی دونوں بھوؤں کے زاویہ کو ایک پل میں ایسے بدل کر اور پھر ہمارے وجود کو مسترد کرتے ہوئے لپلپاتی تلوار کی طرح پورے منظر کو کاٹتی ہوئی گزر جاتی تھیں۔''[4]

اس افسانے میں ڈاکٹر بھائی چارے کی مثال قائم کرنے کے لیے ذات پات کے بھید بھاؤ کو ختم کرنے کی خاطر دلتوں کے گندے ٹوٹے ہوئے المونیم کے گلاس میں پانی پیتا ہے لیکن جب وہ اس بات سے باخبر ہوتا ہے کہ وہ عورت سؤر کے بیمار بچے کو اسی گلاس میں دودھ پلاتی ہے تو وہ دھک سے رہ جاتا ہے۔ مگر اس افسانے کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ اچھوت عورت نے پہلے شریف ڈاکٹر کے استعمال شدہ گلاس کو تپا کر پاک کیا اور پھر سؤر کے بچے کے لیے اس گلاس کو استعمال کرنا شروع کیا۔

اس کے بارے میں سلام بن رزّاق کا یہ بیان بہت ہی معنی خیز ہے اس کا حوالہ اس افسانے کی معنویت میں مزید اضافہ کرتا ہے:

''افسانے کی قرات سے پہلے افسانے کا عنوان، آگ کے پاس بیٹھی عورت، کچھ اٹ پٹا سا لگتا ہے لیکن افسانے کے اختتام پر محسوس ہوتا ہے کہ افسانے کا اس سے بہتر عنوان نہیں ہو سکتا تھا کیوں کہ آگ کے پاس بیٹھی عورت کے اندرون میں سلگتی نفرت کی آگ کی شدت کو جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اس کی وحدت اور تپش باہر سلگتی آگ سے کئی گنا زیادہ تھی۔ یہ افسانہ بھی موضوع، ٹریٹمینٹ اور رمزیہ حقیقت نگاری کے سبب اقبال مجید کے چند بہترین افسانوں میں شمار کیا جائے گا۔''[5]

مجموعی طور پر یہ ضرور عرض کیا جا سکتا ہے کہ اقبال مجید تقسیم ہند کے بعد کے ان ممتاز افسانہ نگاروں میں سے ایک تھے جن کو فنی اور فطری دونوں اعتبار سے غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے بغیر کسی فکری پس منظر کے کوئی تحریر نہیں لکھی اور اس کے ساتھ ہی فنی طور پر بھی انھوں نے ہمیشہ افسانے کے فن کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کی۔

حواشی

1. اخبار ہماری زبان، شمارہ نمبر 7، 2019
2. ترقی پسند ادب کے معمار، ص: 150، پروفیسر قمر رئیس، معلم اردو لکھنؤ، اپریل 1958
3. اردو مختصر افسانہ فنی و تکنیکی مطالعہ، ص: 53-252، نکہت ریحانہ،
4. آگ کے پاس بیٹھی ہوئی عورت از اقتباس
5. ماہنامہ رسالہ سبق اردو جلد: 61، شمارہ: 1 جنوری تا مارچ مضمون 'اقبال مجید رمزیہ حقیقت نگاری کا شہسوار' از سلام بن رزّاق
6. دو بھیگے ہوئے لوگ، اقبال مجید، 1970 لکھنؤ
7. ایک حلفیہ بیان، اقبال مجید، 1980 لکھنؤ
8. شہر بدنصیب، اقبال مجید، 1997
9. رسالہ امروز علی گڑھ، ایڈیٹر ابوالکلام قاسمی، شمارہ جنوری، مارچ 2019، مضمون اقبال مجید کا فکری و فنی امتیاز، از مقصود دانش

■

Ishrat Lateef
Research Scholar
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202001 (UP)
Mob.:9720518651

سعید رحمانی

اڈیشہ میں اردو صحافت

(آغاز سے اکیسویں صدی کے ابتدائی دور تک)

اردو زبان و ادب سے تعلق سے اڈیشہ کی قدیم راجدھانی کٹک کو ابتدا ہی سے مرکزیت حاصل رہی ہے۔ ابتدا سے آج تک نثری وشعری ادب کی تخلیق میں اس مردم خیز خطے سے ایسی نامور شخصیتیں ابھر کر سامنے آئیں جن کے ادبی کارناموں کو برصغیر ہند وپاک میں سند اعتبار ملی۔ ان کی تخلیقات کو دیکھ کر اردو مراکز کے نامور نقادوں کو اعتراف کرنا پڑا کہ اڈیشہ کی اردو کسی بھی دوسرے اردو علاقے کے معیار سے کم نہیں۔

کٹک کے علاوہ سمبلپور، راؤرکیلا، بالیسر اور بھدرک جیسے دور افتادہ مقامات بھی اردو زبان وادب کی خدمت میں نمایاں مقام رکھتے ہیں جہاں عاشقانِ اردو نے بادِمخالف کے تیز وتند جھونکوں میں بھی اردو کا چراغ روشن رکھا ہے۔

اڈیشہ میں اردو صحافت کا جہاں تک تعلق ہے اس کی ابتدا ماقبل آزادی ماہنامہ المنصور سے ہو چکی تھی۔ گو کہ اس کی اشاعت چند شماروں تک محدود رہی لیکن انھیں چند شماروں کی بدولت ہی 'المنصور' نے ترسیل وابلاغ کے باب میں بڑے گہرے نقوش مرتب کیے تھے۔ اس رسالے میں مذہبی وسیاسی نوعیت کے مضامین کے علاوہ مقامی خبریں، مشاعروں کی روداد اور مشاعروں میں پڑھے گئے کلام پیش کیے جاتے تھے۔ اس کے اڈیٹر تھے مولوی محمد عمر۔ اولین شمارہ 1930 میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد وقفہ وقفہ سے متعدد رسائل وجرائد منظر عام پر آتے رہے۔ جن میں خصوصیت سے ہفتہ وار 'مسلم گزٹ' 'ہفتہ وار 'دور جدید' اور ہفتہ وار 'بیداری' قابل ذکر ہیں۔ 'مسلم گزٹ' کا اولین شمارہ 17 جون 1937 کو منظر عام پر آیا۔ اس کے مدیر سید فضل الرحمن قاسمی تھے۔ بلنز سائز میں یہ رسالہ آٹھ صفحات پر مشتمل تھا جس میں حالات حاضرہ پر تبصروں کے علاوہ ادبی، ثقافتی، ملی وسماجی سرگرمیوں کی عکاسی ہوتی تھی۔ ہر شمارہ میں ادبی گوشہ بھی مخصوص تھا جس میں اڈیشہ کے معروف قلمکاروں کی نگارشات شامل ہوتی تھیں۔ ان قلمکاروں میں حضرت مولانا سید برکت اللہ برکت، عبدالحلیم نقیب، شیخ غلام غوث (مصنف نبی العربی) اور ان کے صاحب زادے انور حسین کا نام لیا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد مولوی عبدالرشید نقاد کی ادارت میں 'دور جدید' کا اجرا ہوا۔ مولوی رشید ایک بلند پایہ انشا پرداز ہونے کے علاوہ اپنے وقت کے ایک معتبر شاعر بھی تھے۔ اس اعتبار سے ان میں صحافتی بصیرت بھی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ چنانچہ اس رسالے کی معیاری صحافت کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری نے اپنے ایک مضمون میں اس کو 'عمدہ صحافت کا تر وتازہ گلدستہ' قرار دیا ہے۔ چونکہ اس کا کوئی شمارہ دستیاب نہیں ہوا اس لیے اس کی تاریخ اشاعت کا تعین نہیں کیا جا سکا ہے۔ البتہ یہ بات طے ہے کہ اس کی اشاعت آزادی سے پہلے اور 'مسلم گزٹ' کے بعد ہوئی ہوگی۔

پھر آزادی سے چند سال قبل یعنی 1941 میں ہفتہ وار 'بیداری' کا اجرا ہوا۔ اس کے مدیر محمد عبدالدیان تھے اور منیجر مرزا ہمایوں قدر بیگ۔ یہ ہفتہ وار دراصل اڈیشہ کے مسلم طلبہ کی انجمن کی مساعیٔ جمیلہ کا نتیجہ تھا۔ اس انجمن نے ادارتی ذمہ داری جن شخصیتوں کو سونپی تھی ان کی ادبی وعلمی حیثیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ دیان صاحب میں جہاں علمی بصیرت تھی ہمایوں صاحب ادب' سیاست اور ملی مسائل کی کافی جانکاری رکھتے تھے۔ اس کا صرف ایک رسالہ ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری صاحب کو دستیاب ہو سکا ہے جس کے اداریہ کی انھوں نے بہت تعریف کی ہے۔ اس اداریہ کا عنوان تھا 'اپنوں سے چند باتیں'۔ اس میں قومی مسائل پر مدلل بحث کی گئی ہے۔ یہاں ایک بات کہتا چلوں کہ اب تک جتنے رسائل کا ذکر آیا ہے وہ سب کٹک سے شائع ہوئے ہیں۔ اس کے بعد صحافتی میدان میں ایک طویل خاموشی طاری رہتی ہے۔ یہاں تک کہ ملک میں آزادی کا سورج طلوع ہوتا ہے۔ اس دوران اڈیشہ میں ادبی سرگرمیاں پہلے کی نسبت تیز ہوئی ہیں مگر صحافت کی جانب کسی کی توجہ مبذول نہیں ہوئی۔ سب اسے گھاٹے کا سودا سمجھ کر نظر انداز کرتے رہے۔ البتہ 1954 کے بعد جب ملازمت سے سبکدوش ہو کر نجم الشعرا حضرت امجد نجمی کٹک میں مستقل رہنے لگے تو ادبی سرگرمیاں تیز تر ہوئیں۔ انھیں کی تحریک سے دوماہی 'شاخسار' کا اجرا جون 1965 میں ہوا۔ اس کام میں ڈاکٹر کرامت علی کرامت ان کے شریک کار رہے۔ ادارت کی ذمہ داری حضرت نجمی نے سنبھالی جبکہ مجلس مشاورت سید حرمت الاکرام، مظہر امام، کرامت علی کرامت اور حفیظ اللہ نیولپوری پر مشتمل تھی۔ بہت ہی قلیل عرصہ میں 'شاخسار' نے برصغیر میں اپنا ایک منفرد مقام بنا لیا تھا اور ہر حلقہ میں اس کی پذیرائی ہوئی تھی۔ 9 سال کے عرصہ میں اس کے کل 40 شمارے منظر عام پر آئے اور آخر کار مئی 1973 میں مالی خسارے کے سبب اسے بند کر دینا پڑا۔

صحافت کے میدان میں 9 سال کے تعطل کے بعد ماہنامہ 'صدائے اڑیسہ' منظر عام پر آیا۔ اس کا پہلا شمارہ یکم جون 1982 میں شائع ہوا تھا اور اس وقت کے وزیر اعلیٰ شری جانکی ولبھ پٹنائک کی حکومت برسر اقتدار تھی۔ اس رسالے کی رسم اجرا انھیں کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئی۔ منیجنگ اڈیٹر شیخ قریش تھے جبکہ حلقۂ ادارت میں راقم الحروف کے علاوہ فرحت زیدی، پیر محمد نظر، ساجد اثر وغیرہ شامل تھے۔ اس رسالہ کا امجد نجمی نمبر دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ بہرحال اسے بھی مالی مشکلات کا شکار ہونا پڑا اور دو سال بعد یعنی مئی 1984 میں اس کا سلسلۂ اشاعت منقطع ہو گیا۔

اڈیشہ کی اردو صحافت میں ایک بار پھر خلا پیدا ہو گیا

مگر صرف ایک سال کے لیے۔ اس بار اڑیا کے ایک صحافی اور معروف سیاسی رہنما شری سومیہ رنجن پٹنائک نے اپنے اشاعتی ادارے ایسٹرن میڈیا کے تحت ہفتہ وار 'سہارا' کے نام سے اخبار نکالا۔ اس کے اولین شمارے کا سنہ اشاعت 26 اپریل 1985 ہے۔ تقریباً آٹھ شماروں تک اڑیسہ کے معروف شاعر ونقاد اطہر عزیز اس کے مدیر رہے۔ چند اختلافات کے سبب انھوں نے سہارا چھوڑ دیا۔ سومیہ رنجن اس کے مدیر اعلیٰ بنے اور حلقۂ ادارت میں راقم الحروف کے علاوہ ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری، حفظ الرحمن اور فرزان سیفی کو لیا گیا۔ ہاں اس تبدیلی سے پیشتر ڈاکٹر لیاقت علی (سابق سکریٹری، اڑیسہ اردو اکاڈمی) کی بیگم رضیہ سلطانہ بھی کچھ عرصہ کے لیے اس کی ادارت کو بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے چکی تھیں۔ سہارا اس معنی میں بھی ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کہ پہلی بار کٹک کی مرکزیت کے حصار سے نکل کر اس کی اشاعت اڑیسہ کی راجدھانی بھوبنیشور سے ہوئی تھی اور پہلی بار اس ہفتہ وار میں ایک مکمل اخبار کی بھی خصوصیات موجود تھیں۔ عصری سیاست اور بین الاقوامی حالات پر تبصروں کے علاوہ مقامی وبیرونی خبریں ہوتی تھیں اور ایسے موضوعات بھی شامل کیے جاتے تھے کہ سبھی ذوق کے قارئین مستفیض ہوں۔ اس کے باوجود بھی یہ ہفتہ وار زیادہ دنوں تک نہیں چل سکا جس کی سب سے بڑی ذمہ داری اردو قارئین کی سرد مہری تھی۔ ایک روپے دے کر آٹھ صفحات کے اس ہفتہ وار کو خریدنے کی انہیں توفیق نہیں ہوئی۔ سومیہ رنجن اگرچہ کافی خسارہ برداشت کر چکے تھے مگر انہوں نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ لیکن قارئین کی عدم دلچسپی دیکھتے ہوئے آخر 1988 میں اسے بند کر دیا۔

اس کے بعد اڑیسہ اردو اکادمی نے اپنے ترجمان 'فروغ ادب' کا اجرا جنوری تا مارچ 1989 کے شمارے سے کیا۔ اس کے اولین مدیر اکادمی کے سکریٹری پروفیسر سید منظور احمد قاسمی تھے۔ ان کے بعد معروف مزاحیہ شاعر اسماعیل آزر اس کے مدیر ہوئے۔ موصوف جب تک اکادمی کے سکریٹری رہے 'فروغ ادب' پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ ان کے بعد اردو اکادمی کی باگ ڈور جن لوگوں کے ہاتھ میں گئی ان کا اردو سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ چنانچہ اکادمی کو فعال رکھنے میں نہ تو انھوں نے دلچسپی لی اور نہ کچھ مثبت اقدامات کیے۔ اسماعیل آزر کے بعد سے برسوں یہی صورت حال برقرار رہی۔ البتہ داؤد الرحمن صاحب نے اپنے عہد میں اس رسالے کو پابندی سے شائع کیا اور سر دست اس کے سکریٹری ڈاکٹر سید مشیر عالم اس سلسلے کو جاری رکھے ہوئے ہیں اور فروغ ادب بڑی پابندی کے ساتھ نہایت شان وشوکت سے شائع ہو رہا ہے۔

1992 میں ایک اور رسالہ 'نئی شناخت' کا اجرا ہوا تھا جس کے مدیر ڈاکٹر کرامت علی کرامت کے صاحبزادے قطب کامران تھے۔ اس کے صرف تین ہی شمارے شائع ہوئے۔ تیسرا شمارہ عبدالمتین جامی پر ایک خصوصی گوشہ کی صورت میں خاص نمبر کے بطور شائع کیا گیا تھا۔ ان تینوں شماروں کے مشمولات بے حد گرانقدر اور قابل مطالعہ ہیں۔ ہندوپاک کے معتبر قلمکاروں کی شمولیت نے ان شماروں کو درجۂ اعتبار بخشا تھا۔ خصوصاً ان کا اداریہ 'نقش آغاز' اور ڈاکٹر کرامت علی کرامت کا مستقل کالم 'میرا صفحہ' انفرادی حیثیت کا حامل ہے۔

اس کے بعد کٹک کے ایک مردم خیز خطہ سوگڑہ سے مجلّہ 'ترویج' شائع ہونے لگا ہے۔ اس کا اولین شمارہ 5 نومبر 1995 میں منظر پر آیا تھا۔ اب تک پندرہ ہیں شمارے شائع ہو چکے ہیں، جن میں متعدد خاص نمبر بھی شامل ہیں۔ اس مجلّہ کے ترتیب کار خاور نقیب ہیں جن کو اپنی ادبی زندگی کے آغاز سے ہی صحافت سے دلچسپی رہی ہے۔ اس کا ثبوت ایک دیوار گیر رسالہ ہے جس کو وہ 'روح گلاب' کے نام سے ایک عرصہ تک نکالتے رہے۔ خوشخطی میں تحریر کر کے اسے وہ مدرسہ کی دیوار پر چسپاں کر دیا کرتے تھے۔

2005 میں کٹک سے پندرہ روزہ 'اخبار اڑیسہ' راقم الحروف کی ادارت میں شائع ہونے لگا اور دو سال کے اندر اتنا مقبول ہوا کہ بعض معروف ادیبوں نے اسے ادبی رسالہ میں تبدیل کرنے کا مشورہ دیا۔ ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اسے دوماہی 'سلسلہ' کی شکل دی گئی جس کا اولین شمارہ نومبر ودسمبر 2007 میں منظر عام پر آیا۔ اس میں پروفیسر سید منظر حسن دسنوی مرحوم کا خصوصی گوشہ بھی شامل تھا۔ دو سال کے اندر اس نے بھی مقبولیت حاصل کر لی۔ جب R.N.I نے اس کے لیے 'ادبی محاذ' کے ٹائٹل کی منظوری دی تو جنوری 2009 سے یہ سہ ماہی ادبی محاذ کے نام سے شائع ہونے لگا۔ اب اس کا شمار ہندوستان کے مقبول رسائل میں ہونے لگا ہے اور اس کی پیش رفت برابر جاری ہے۔ فی الحال اس کے مدیر سید نفیس دسنوی ہیں اور مدیر اعلیٰ سعید رحمانی۔

اگرچہ اڈیشہ میں اردو صحافت کی پیش رفت کو تشفی بخش کہا نہیں جا سکتا مگر آج تک اس سلسلے میں جتنی بھی کاوشیں ہوئی ہیں اڈیشہ جیسے دور افتادہ صوبہ کے لیے غنیمت ہے۔ آج انھیں رسائل وجرائد کے وسیلہ سے اردو دنیا کے نقشہ میں اڈیشہ کو ایک نمایاں مقام حاصل ہوا ہے۔ البتہ ابتدا ہی سے ایک روزنامہ اخبار کی کمی بری طرح کھٹکتی رہی ہے۔ مگر اس میدان میں آنے کی ہمت کسی کو نہیں ہوئی۔ اول تو اردو کشی کا یہ دور سوہان روح بنا ہوا ہے۔ دوسری جانب خود اردو والے ہی اردو سے بے اعتنائی برت رہے ہیں۔ تیسرا اور اہم مسئلہ مالی وسائل کی کمی کا ہے۔ ان دشواریوں کے باوجود چند برسوں قبل اڑیا کے معروف صحافی ایم رحمن صاحب نے بڑے حوصلوں کے ساتھ روزنامہ 'آج تک' کا اجرا کیا جس کا اولین شمارہ 24 جون 1998 کو منظر عام پر آیا تھا۔ اس کی مجلس ادارت میں راقم الحروف بھی شامل تھا۔ یہ اخبار کلکتہ سے شائع ہو کر آتا تھا۔ مگر اس کی مدت حیات بھی ایک سال سے زیادہ نہ رہی۔ اس خلا کو پر کرنے کے لیے اب بھوبنیشور سے چند مہینوں قبل ایک روزنامہ 'اخبار نامہ' کے نام سے شائع ہونے لگا ہے۔ خدا کرے کہ اسے استحکام حاصل ہو۔ اگر یہ اخبار چل نکلا تو اڑیسہ کے اردو والوں کی آواز کو دور دور تک پہنچانے میں معاون ہوگا۔

اڈیشہ کا ایک اور شہر بالیسر بھی اب صحافت کے نقشے میں ابھر چکا ہے جہاں سے ایک پندرہ روزہ 'اپنا ترجمان' کا اجرا ہوا۔ اس کے مدیر بالیسر کے ایک کہنہ مشق شاعر، ادیب وصحافی عنایت علی عنایت تھے۔ مشمولات اور گٹ اپ کے اعتبار سے یہ پندرہ روزہ صوری اور معنوی جمال سے آراستہ تھا۔ یہ ذولسانی اخبار تھا جس میں چھ صفحات اردو کے اور چھ صفحات اڑیا زبان کے ہوتے تھے۔ مگر افسوس کہ چند تکنیکی دشواری کے سبب اس کی اشاعت معرض التوا میں پڑی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی 'صدائے اڑیسہ' بھی کٹک سے دوبارہ شائع ہونے لگا ہے اور یہ بھی ذولسانی ہے جس میں اردو کے ساتھ اڑیا تخلیقات بھی شامل ہوتی ہیں۔ اس کے ایڈیٹر شیخ قریش ہیں اور مدیر اعلیٰ سعید رحمانی۔ آخر میں اتنا کہنا چاہوں گا کہ اردو کے مرکز ثقل سے دور اڈیشہ جیسے صوبے سے اردو صحافت کی نمائندگی جہاں خوشی کی بات ہے وہیں یہ اردو کی ہمہ گیریت کی روشن مثال بھی ہے۔

اکیسویں صدی کے آتے آتے اڈیشہ میں اردو صحافت کا شجر مزید برگ وبار لانے لگا ہے اور یہاں کے قلمکاروں کے علاوہ عوام بھی اس جانب متوجہ نظر آتے ہیں۔ چنانچہ امید کی جا سکتی ہے کہ اڈیشہ میں اردو صحافت کی پیش قدمی ایک روشن مستقبل کی سمت جاری وساری رہے گی اور اس طرح صوبۂ اڈیشہ اردو دنیا میں اپنی اہمیت کا احساس دلاتا رہے گا۔

■

Sayeed Rahmani
Editor 'Adabi Mahaz'
Deewan Bazar
Katak - 753001 (Odisha)

فاروق ارگلی

مقدس گنگا

ہندوستان کا مقدس دریا گنگا کوہ ہمالیہ سے نکل کر ملک کے وسیع میدانی علاقے میں 2,463 کلومیٹر بہہ کر خلیج بنگال میں گر جاتا ہے۔ اُتراکھنڈ میں سطح سمندر سے تقریباً چار ہزار میٹر کی بلندی پر برف کے گلیشیروں میں واقع گوکھ یا گنگوتری سے برآمد ہونے والی گنگا کا نام اس جگہ بھاگیرتھی ہے، ہندو دھرم کے عقیدے کے مطابق پراچین کال میں راجہ بھاگیرتھ کی تپسیا سے دیوی گنگا دھرتی پر آئی تھیں، مقدس گنگا کروڑوں ہندوؤں کی عقیدت اور پرستش کا مرکز ہے۔ گنگا کے ساحلوں پر کنکھل، ہردوار، گڑھ مکتیشور، پریاگ یعنی الہ آباد اور کاشی وغیرہ بڑے بڑے تیرتھ استھان ہیں۔ اسی طرح ہمالہ کے جمنوتری سے نکلنے والی دریائے جمنا کو بھی ہندو دھرم میں انتہائی اہم اور مقدس مانا جاتا ہے۔ جمنا، رشی کیش اور اندر پرستھ یعنی دلّی سے ہوتی ہوئی بھگوان کرشن کی جنم بھومی متھرا پہنچتی ہے جو ہندوؤں کا نہایت مقدس تیرتھ استھان ہے۔ پریاگ میں گنگا، جمنا اور سرسوتی کا سنگم ہوجاتا ہے۔ سنگم کا وہ مقام جہاں گنگا اور جمنا ملتے ہیں یہ بھی بھارت کے کروڑوں ہندوؤں کا عظیم الشان تیرتھ استھان ہے۔ گنگا میں جمنا کے علاوہ گومتی، گھاگھرا، گنڈک، کوسی، سون، دامودر، جانہوی، الکھ نندا اور کرنالی وغیرہ ندیاں ملتی جاتی ہیں۔ پریاگ سے آگے چل کر ہندوؤں کا سب سے عظیم تیرتھ استھان کاشی یا وارانسی واقع ہے۔ یہ قدیم ترین شہر بین الاقوامی شہرت کا حامل ہے۔ آگے بڑھ کر مقدس گنگا بھارت کے قدیم شہر پاٹلی پتر یعنی پٹنہ اور دوسرے تاریخی مقامات سے گزرتی ہوئی ایک اور اہم تیرتھ استھان گنگا ساگر پہنچتی ہے۔ گنگا ساگر کے بارے میں ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ یہاں ایک بار اشنان کرلینے سے کئی جنموں کے پاپ دھل جاتے ہیں۔ کہاوت ہے کہ سارے تیرتھ بار بار، گنگا ساگر ایک بار۔ دراصل یہ سمندر سے تقریباً پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر گنگا کا ڈیلٹا ہے جس کی مغربی شاخ کا نام ہگلی ہے۔ گنگا کی اصل دھارا پدما کے نام سے جب دریائے برہم پتر میں ملتی ہے تو اس کا پاٹ 48 کلومیٹر تک چوڑا ہوجاتا ہے۔ گنگا کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اپنے منبع سے صرف 320 کلومیٹر کے آگے بڑھتے ہی جب وہ میدانی علاقوں میں داخل ہوتی ہے تو اس کی گہرائی اور چوڑائی جہاز رانی کے قابل ہوجاتی ہے۔ گنگا سے نکلی نہریں پورے اترپردیش کی دھرتی کو سیراب کرتی ہیں۔ گنگا کی مہربانی سے ہی ملک کا یہ وسیع و عریض خطہ سرسبز و شاداب اور زرخیز ہے۔ ریاست بنگال میں داخل ہونے کے بعد فرکا کے مقام پر گنگا دو حصوں میں تقسیم ہوجاتی ہے۔ ایک دھارا جنوب کی طرف بڑھ جاتی ہے، یہ ہگلی ہے جس کے کنارے ملک کا بارونق شہر کولکاتا آباد ہے۔ یہی ہگلی کچھ آگے بڑھ کر خلیج بنگال میں گر جاتی ہے، گنگا کی مشرقی دھارا بنگلہ دیش میں داخل ہوکر برہم پتر سے مل جاتی ہے، یہاں اس کا نام جمنا ہوجاتا ہے، اس میں میگھنا اور دوسری ندیاں شامل ہوجاتی ہیں، یہ سب بھی خلیج بنگال میں مدغم ہوجاتی ہیں لیکن سمندر تک پہنچنے سے پہلے یہ سندربن کے وسیع و عریض دلدلی علاقے کو سیراب کرتی ہیں۔

لیکن یہ تو مقدس گنگا کا سرسری تعارف تھا۔ ہمارے ملک کے اس پاکیزہ اور قابل احترام دریا میں جو غیر معمولی خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے ہندوؤں نے اسے دیوی اور ماتا کا درجہ عطا کیا، بھارت میں ہزاروں سال سے گنگا کی پوجا ہورہی ہے۔ کروڑوں ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ گنگا میں ایک بار اشنان کرنے سے سارے پاپ دھل جاتے ہیں اور مرنے کے بعد خاک اور باقیات کا گنگا میں بہہ جانا موکش یعنی نجات کی ضمانت مانا جاتا ہے۔ گنگا کے تقدس اور عظمت کی لاتعداد کتھائیں ویدوں اور پرانوں میں مذکور ہیں۔ گنگا کے تئیں اس عقیدت اور دھارمک روایات سے الگ اس کی بے شمار خوبیوں نے اسے دنیا کا نہایت اہم دریا ثابت کیا ہے۔ سائنسی اور طبی تجربات میں گنگا کے شیریں پانی کو حیات بخش پایا گیا ہے۔ گنگا کا پانی صحت بخش معدنیات سے بھرپور متعدد بیماریوں سے شفا بخشنے کی خصوصیت کا حامل ہے۔

گنگا جل کے خواص چرک، پتنجلی وغیرہ قدیم رشیوں منیوں کی لکھی ہوئی آیوروید کی کتابوں میں درج ہیں۔ مغربی میڈیکل سائنس کے ماہرین نے گنگا پر طویل ریسرچ اور تجربات سے پایا ہے کہ یہ دریا ہمالہ کے جس خطے سے گزر کر میدانوں میں آتا ہے وہاں کی چٹانوں، مٹی اور جڑی بوٹیوں کا کرشمائی اثر گنگا کے پانی میں شامل ہوجاتا ہے۔ فرانس کے مشہور ڈاکٹر ہیریل نے گنگا کے پانی پر تحقیق اور سائنسی تجربہ کے بعد ثابت کیا ہے کہ گنگا کا پانی جراثیم کش ہے، انھوں نے ایسی لاشوں پر کافی ریسرچ کی جن کی موت ہیضہ وغیرہ متعدی بیماریوں سے ہوئی تھی اور وہ گنگا میں بہائی گئی تھیں، ڈاکٹر ہیریل کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ گنگا کا پانی ہر قسم کے منفی جرثوموں کو ختم کردیتا ہے، گنگا جل میں ایسے منرلس موجود ہیں جن کی وجہ سے سالہا سال تک بوتل میں بند کرکے رکھنے کے باوجود اس پانی میں بیکٹیریا پیدا نہیں ہوتے اور یہ خراب نہیں ہوتا۔

ساری دنیا کے پانیوں میں یہ خوبی صرف آبِ زمزم میں پائی گئی ہے۔ گنگا کے مذہبی تقدس اور اس کے پانی کے خواص سے ساری دُنیا واقف ہے۔ گنگا کو بین الاقوامی دریاؤں میں سب سے خاص اور سب سے زیادہ قابلِ احترام مانا جاتا ہے، لیکن گنگا ہمارے لیے صرف ایک دھار یک ندی نہیں، یہ سچ مچ برصغیر ہندوستان کی ماں ہے جس کی آغوش میں عالیشان تہذیبوں نے پرورش پائی ہے۔ گنگا کی قدامت کا اندازہ نہ لگاتے ہوئے اگر ہم صرف دو ہزار سال قبل مسیح یعنی چار ہزار سال کی درج شدہ تاریخ میں جھانکیں تو انہی میدانوں میں جہاں گنگا بہتی ہے آریوں کے قافلے اُترے، صدیوں کے دوران میں آریہ تمدن اسی گنگا کے دامن میں پھلا پھولا، اسی گنگا کے دامن میں سنسکرت بھاشا کا فروغ ہوا، ویدک کال کی تاریخ اسی گنگا کے پانی سے لکھی گئی۔ گنگا بھگوان رام اور کرشن جی کے جلوؤں کی گواہ بنی، اسی گنگا اور اس کی سہیلی جمنا کے دوآبوں نے رامائن اور مہابھارت کے کرداروں اور منظروں کو جیتا جاگتا دیکھا، گنگا کے سرسبز کناروں نے ان قافلوں کو بھی اُترتے دیکھا، جن کے لیے علامہ اقبال نے کہا ہے۔

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو

اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

مقدس گنگا کی محبت بھری آغوش سب کے لیے ہمیشہ سے وا رہی ہے۔ تاجر اور چرواہے بن کر آنے والے اس کی ٹھنڈی چھاؤں میں ہمیشہ کے لیے اپنا آپا بھول کر بھارت ماتا کے پتر بن گئے۔ ایک خدا اور ایک پیغمبر کو ماننے والے مسلمان آئے تو ہزاروں دیوی دیوتاؤں کے پوجنے والوں کے ساتھ گھل مل گئے۔ گنگا اور زمزم کے پانی پہلے ہی ایک جیسے تھے، ایک دوسرے میں مل کر یکجان ہو گئے۔ گنگا کے دامن میں نئی تہذیب نے جنم لیا جسے گنگا جمنی تہذیب کا نام ملا۔ بھارت کی بھاشاؤں، بولیوں اور عربی، فارسی، ترکی زبانوں کے اتصال سے ایک نئی میٹھی اور طاقتور بولی پیدا ہونے لگی جسے رشیوں، منیوں، کویوں، بھاٹوں، گویوں اور صوفی سنتوں نے اپنایا تو جیسے رنگ رنگ کے پھول کھلنے لگے۔ گنگا جمنا کا سنگم ایسا ہوا کہ جہاں دونوں پانی ایک ساتھ مل کر بہتے ہیں مگر اپنے رنگ سے الگ الگ پہچانے جاتے ہیں۔ یہی گنگا جمنی ملی جلی تہذیب کا رنگ ہے جسے ہم گنگا کا چمتکار بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس چمتکار نے پورے برصغیر کو روشن کر دیا۔ ہندو ہندو رہے، مسلمان مسلمان رہے، مگر گنگا جمنی سنسکرتی کے رنگ میں شرابور ہو کر ہندوستانی ہو گئے۔ امیر خسرو کی ہندوی مغلوں کے دور تک آتے آتے ریختہ اور اُردو بن گئی، دو دھارائیں ایک ساتھ بہیں تو دو سگی بہنیں اُردو اور ہندی کہلائیں، دونوں گنگا اور جمنا کے پانی کی طرح ایک مگر الگ سے پہچانی گئیں۔ بدیسی انگریز نے بھارت پر قبضہ جمایا، ہندوستانیوں کو آپس میں لڑایا مگر ڈیڑھ سو سال میں بھی اس مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کو مٹا نہیں سکے۔ اس تہذیب نے جو زبان خاص طور پر پیدا کی وہ کروڑوں ہندوستانیوں کی آواز اور پہچان بن چکی ہے۔ اُردو زبان جو آج دُنیا بھر میں گونج رہی ہے، جس میں گنگا جل اور آبِ زمزم کی مٹھاس اور ٹھنڈک ہے، یہ محبتوں کی بھاشا بن گئی ہے۔ سب بھارتیوں نے مل کر انقلاب زندہ باد کا نعرہ بلند کیا تو بدیسی انگریز دیس چھوڑ کر بھاگ گئے، آزاد ہندوستان کی فضاؤں میں آج یہ آواز ہر ہندوستانی کی آواز ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

مقدس گنگا کتنی عظیم ہے، کتنی پاکیزہ ہے، ہندو اسے پوجتے ہیں تو مسلمان بھی اس کا احترام کرتے ہیں۔ آج سے نہیں شروع سے ہی جب چودھویں صدی میں نامور سیاح ابن بطوطہ ہندوستان آیا تھا، اُس نے دیکھا تھا کہ سلطان محمد تغلق صرف آبِ گنگا ہی پینا پسند کرتا ہے۔ یہ بات ابن بطوطہ کے شہرۂ آفاق سفرنامے میں درج ہے۔ مغل دور کا عظیم مورخ اور دانشور ابوالفضل آئینِ اکبری میں لکھتا ہے:

''شہنشاہ اکبر کے باورچی خانے میں صرف گنگا کا پاک پانی ہی استعمال ہوتا تھا جو ہردوار سے آگرہ لایا جاتا تھا۔ اکبر گنگا کے پانی کو آبِ حیات کہتا تھا۔''

مشہور فرانسیسی سیاح برنیئر 1656 سے 1668 تک ہندوستان میں رہا، اس کا سفرنامہ اس عہد کا چشم دید گواہ ہے۔ برنیئر نے اپنے سفرنامے میں شریعت اسلامی پر سختی سے کاربند رہنے والے اورنگ زیب کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ہمیشہ گنگا کا پانی ہی استعمال کرتا تھا۔ برطانوی فوج کے ایک افسر کیپٹن میور نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ میسور کے سلطان ٹیپو کے لیے اونٹوں پر مشکیزے لاد کر گنگا کا پانی دور دراز دکن تک لایا جاتا تھا۔ بنگالہ کی مشہور تاریخ 'ریاض السلاطین' کے مصنف غلام حسین کا بیان ہے کہ گنگا جل کے ذائقے، شیرینی، لطافت اور صحت بخش خوبیوں کا مقابلہ ملک کے کسی اور پانی سے کیا ہی نہیں جاسکتا، یہ لاثانی ہے۔ ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر نہرو نے کہا تھا:

''گنگا بھارت کی ندی ہے، عوام کی محبوب ہے، جس میں لپٹی ہوئی ہیں بھارتی قوموں کی یادیں، اُمیدیں، اس کے خوف اور اس کی فتحیابی کے نغمے۔ گنگا بھارت کی قدیم تہذیبوں کی علامت رہی ہے، نشانی رہی ہے۔ ہمیشہ بہتی، بدلتی پھر بھی گنگا کی گنگا۔ میں نے صبح کے اُجالوں میں گنگا کو مسکراتے، اُچھلتے کودتے دیکھا ہے، شام کے سکوت میں اُداس، سیاہ چادر اوڑھے، پراسراری، سردیوں میں سمٹی سی، دھیمے دھیمے بہتی ہوئی اور برساتوں میں دوڑتی ہوئی، سمندر کی طرح چوڑا سینہ لیے ہوئے ساگر کو برباد کرنے کی قوت لیے ہوئے۔'' (ڈسکوری آف انڈیا)

آج ہمارا ملک تیز رفتاری سے دُنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کی ہمسری کر رہا ہے۔ صنعت، تجارت، تعلیم، سائنس اور ٹیکنالوجی ہر میدان میں ہم تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں، لیکن اس وقت پوری ہندوستانی قوم کی نگاہیں شرم سے جھک جاتی ہیں جب ہم اپنی ندیوں کو مرتا ہوئے دیکھتے ہیں۔ جن کے پانی کو امرت اور آبِ حیات کہتے تھے وہ اب غلیظ اور زہریلا ہو چکا ہے۔ کون ہے ان تمام دریاؤں کا دشمن؟ جمنا کا دشمن؟ گنگا کا دشمن؟ جی نہیں، کوئی اور نہیں، یہ دشمن ہم خود ہیں۔ ترقی کے زعم میں ہم نے عالیشان شہر بسا ڈالے، آسمان سے باتیں کرتی عمارتیں بنائیں، بڑے چھوٹے ہر طرح کے کارخانوں کا جال بچھا کر دیش کو صنعت و تجارت سے خوشحال بنانے کی زبردست اور کامیاب کوشش کی، لیکن اس کوشش میں اپنی اور آنے والی نسلوں کی زندگی بھی ہلاکت میں ڈال بیٹھے۔ اپنی پاکیزہ اور زندگی دینے والی ندیوں کو سیور کی غلاظت اور کارخانوں کے زہریلے کچرے بہا کر گندے نالوں میں بدل ڈالا۔ کھیتوں میں پیداوار بڑھانے کے لیے جراثیم کش دواؤں کا بے تحاشا استعمال کر کے ان کے حیات بخش پانیوں میں زہر گھول دیا ہے۔ بڑے بڑے ڈیم بنا کر ان کی روانی چھین لی۔ انگلینڈ کے اوورسیز ڈیولپمنٹ ایڈمنسٹریشن (ODA) اور ہندوستان کی وزارت ماحولیات کے مشترکہ سروے سے پتہ چلا ہے کہ گنگوتری سے لے کر خلیج بنگال تک گنگا کے ساحل پر بسے ہوئے سو شہروں کے علاوہ جن ہزار ہا دیہات کی زندگی گنگا کے پانی پر منحصر ہے، ان شہروں اور گاؤں کی ایک اعشاریہ تین ارب لیٹر سیور کی گندگی، چھبیس کروڑ لیٹر کارخانوں کا زہر آلود کچرا، ساٹھ لاکھ ٹن کیمیائی کھاد اور نو ہزار ٹن جراثیم کش دواؤں سے بہہ کر آنے والا زہریلا مادّہ روزانہ گنگا کے پانی میں شامل ہوتا ہے۔ ہزار ہا جانوروں اور انسانوں کی لاشیں اور شمشانوں کی راکھ اور ہڈیاں بھی گنگا کو برباد کر رہی ہیں۔

■

Farooque Argali
25, Ganesh Park
Rasheed Market
Delhi - 110051
Mob.:9212166170

مخدوم محی الدین کی غزلیہ شاعری

محمد حسنین رضا

مخدوم محی الدین کی پیدائش 4 رفروری 1908 کو ضلع میدک، تعلقہ اندول میں ہوئی۔ والد کا نام غوث محی الدین جو تحصیل میں معمولی کلرک کی حیثیت سے نوکری کرتے تھے۔ لیکن والد کا سایہ تادیر قائم نہ رہا جب مخدوم پانچ برس دو ماہ کے تھے کہ ان کے والد کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا۔ والد کے انتقال کے بعد ان کے چچا محمد بشیر الدین اپنے بھائی کی جائیداد کے مالک ہوگئے اور ان کا تقرر تحصیل اندول میں بحیثیت کلرک عمل میں آیا۔ اب مخدوم اپنے چچا کے زیر سایہ پرورش پانے لگے۔ ان کے چچا ایک متقی و پرہیزگار انسان تھے۔ مذہبی ماحول کے باعث مخدوم بچپن ہی سے نماز اور روزہ کے پابند ہوگئے۔ مسجد میں جاروب کشی، اذان دینا معمول بن گیا تھا۔ گھر پر ہی قرآن پاک ختم کیا اور مدرسوں میں دینیات کی تعلیم حاصل کی۔

مخدوم کی ابتدائی تعلیم کسی ایک جگہ پر نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مخدوم کے چچا اپنی ملازمت کے سلسلے میں مختلف مقامات پر منتقل ہوتے رہے۔ اندول، سنگاریڈی، میدک، پٹن چِروان جیسے مختلف مقامات پر مخدوم نے تعلیم حاصل کی۔ 1929 میں سنگاریڈی (ضلع میدک) ہائی اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے ساتھ ساتھ چیلہ پورہ کے مدرسۂ شبینہ سے منشی کے امتحان میں بھی امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد 1929 میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں داخلہ لیا، مگر جامعہ میں داخلہ کے بعد انھیں تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے میں کافی پریشانیاں جھیلنی پڑیں۔ ان کے حصول تعلیم کی صعوبتوں کو ڈاکٹر منصور عمر اپنی کتاب 'مخدوم محی الدین کی شاعری کا تنقیدی جائزہ' میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''جامعہ میں داخلہ کے بعد تعلیم جاری رکھنے کے لیے مخدوم کو سخت جدوجہد کرنی پڑی۔ کبھی اپنے دوست ڈاکٹر یوسف مرزا کے ساتھ برتن فروخت کرنے کی ایجنسی میں کام کیا تو کبھی دوسرے دوست نورالہدیٰ کے ساتھ شاہکار تصاویر اور پینٹنگز کے کاروبار بھی کیا۔ کبھی بالی ووڈ [ہالی ووڈ] کے فلمی ستاروں کی تصویریں فروخت کیں اور کبھی عاشقانہ خطوط لکھ کر اپنا پیٹ پالتے رہے۔''

(مخدوم محی الدین کی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ص 14)

اس طرح مخدوم آئی اے کا امتحان پاس کرتے ہیں اور پھر اس درمیان انھیں اخبار 'شیر دکن' میں ترجمہ نگاری کی حیثیت سے جز وقتی ملازمت مل جاتی ہے، کچھ آمدنی ٹیوشن سے بھی ہو جاتی ہے اور اس طرح وہ بی اے میں داخلہ لیتے ہیں۔ بی اے میں داخلہ کے بعد قدرت نے مخدوم کی تعلیم کے لیے راہیں ہموار کردیں۔ ہوا یوں کہ جس لڑکے کو مخدوم ٹیوشن پڑھاتے تھے اس کے چچا کا نام مخدوم حسین تھا، وہ لندن سے الیکٹریکل انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر کے آئے تھے، مخدوم کی تعلیم سے دلچسپی کو دیکھ کر یہ عہد کیا کہ اگر انھیں نوکری مل جاتی ہے تو مخدوم کی تعلیم کا پورا خرچ وہ اٹھائیں گے، المختصر جب انھیں نوکری مل گئی تو انھوں نے اپنے وعدے کو پورا کیا اور پورے تعلیمی اخراجات اپنے ذمہ لے لیا اور اس طرح مخدوم نے جامعہ عثمانیہ سے بی اے اور ایم اے تک کی تعلیم حاصل کی۔ اردو شاعری کا یہ انمول رتن 61 سالہ زندگی گذار کر 25 اگست 1969 کو اس دار فانی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کوچ کر گیا۔

مخدوم کی شخصیت کی تعمیر میں ان کے چچا کے خیالات اور برتاؤ کا بہت عمل دخل تھا، مخدوم نے مساوات، جمہوریت اور انسان دوستی کے اونچے تصورات اور قدروں کو اپنے چچا کی زندگی اور گھر کے ماحول سے حاصل کیا تھا۔ لہٰذا اعلیٰ تعلیم، اچھی صحبت، ارباب علم و دانش کے ماحول، عمیق اور مسلسل مطالعے کے ساتھ ان کی اپنی نظری صلاحیتوں نے ان نقوش کو اور بھی چمکا دیا تھا۔

مخدوم کی شخصیت میں بڑی جاذبیت تھی وہ صداقت پسندی اور خلوص کے پیکر تھے۔ بحیثیت انسان مخدوم بڑے غیر معمولی انسان تھے ان کی رفتار و گفتار میں غیر معمولی کشش تھی، جو بھی ان سے ملتا ان کی شخصیت کو محسوس کیے بغیر نہیں رہتا۔ اس لیے ان سے ملنے پر جو تاثرات پیدا ہوتے تھے وہ دیرپا ہوتے تھے۔

مخدوم نے انسانی فلاح و بہبود، عدل و انصاف اور امن و امان سے متعلق خیالات، مارکس، لینن اور دوسرے اشتراکی مفکروں سے لیے لیکن طرز اظہار کو حسین اور موثر

بنانے کے لیے انھوں نے اردو اور فارسی کے شعرا کے طرز بیان سے استفادہ کیا۔ مخدوم نے شاعری میں کسی سے اصلاح نہیں لی اور نہ ہی کسی کو اپنے سے اونچی سطح پر رکھ کر صلاح ومشورہ کیا اور نہ ہی انھوں نے شاعری میں کسی کو اپنا شاگرد بنایا۔ لیکن اگر کسی نوجوان میں صلاحیتیں دیکھیں تو اس کی ہمت افزائی ضرور کی۔

اردو شاعری میں جوش ان کا پسندیدہ شاعر ہے۔ مخدوم جوش کی شاعری میں حریت پسندی کے رجحان، جوش وخروش اور اس کی قادرالکلامی کے قائل ہیں۔ جوش کے علاوہ وہ اختر شیرانی کی رومانی شاعری، عظمت اللہ خان کے نئے پن اور حفیظ جالندھری کے گیت بہت پسند کرتے تھے۔ فارسی میں حافظ ان کا محبوب شاعر ہے۔ حافظ کے علاوہ خیام کو بھی بہت شوق اور دلچسپی سے پڑھتے تھے۔

مخدوم کی شاعری کو زندگی، توانائی اور حسن عطا کرنے میں جہاں ذاتی زندگی کے پیچ وخم، اتار چڑھاؤ اور مصائب وآلام کو دخل ہے وہیں اس میں عوامی زندگی کے دردوکرب کا بھی خاصا حصہ ہے۔ وہ ذاتی اور اجتماعی دونوں کے کرب سے گذرے ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو عوامی یا اجتماعی کرب احساس سے پہلے ان کی شاعری میں وہ بات نہیں پائی جاتی جو بعد کی شاعری میں نمایاں ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ہندوستان کے سماجی اور سیاسی حالات کے مطالعے سے ان کی دلچسپی بڑھتی گئی اور انھیں ہندوستانی عوام کے مسائل اپنے مسائل معلوم ہونے لگے۔ انھوں نے 'باغی'، 'جنگ مشرق'، 'موت کا گیت' اور 'دھواں'، 'سپاہی'، 'انقلاب'، 'مسیحا' جیسی معرکۃ الآرا انقلابی نظموں کی شکلوں میں اردو شاعری کو وہ گراں مایہ خزانہ عطا کیا جس کی چمک دمک، ماند نہ ہو سکے گی۔ مخدوم کئی شعری مجموعوں کے مصنف بھی تھے جن میں 'سرخ سویرا' (1944)، 'گل تر' (1961) اور 'بساط رقص' (1966) ہیں۔ ان کے علاوہ نثری تصانیف میں 'ٹیگور اور ان کی شاعری' (1935)، 'ہوش کے ناخن' (1934) وغیرہ ہیں۔

مخدوم دراصل نظم کے شاعر ہیں مگر انھوں نے صنف غزل میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے 1959 میں صنف غزل کی طرف توجہ کیا اور مختصر عرصے ہی میں کئی غزلیں لکھ کر غزلیہ شاعری میں بھی اپنے لہجے اور اپنی آواز کو شامل کردیا۔ مخدوم غزل گوئی اس وقت شروع کرتے ہیں جب غزل کی بے جا مخالفت ماضی کی بات بن چکی تھی اور بعض ممتاز ترقی پسند شعرا بھی نئی غزل میں نئے مزاج اور نئے آہنگ کے ساتھ اس صنف سخن کی اہمیت اور افادیت کو واضح کر چکے تھے۔

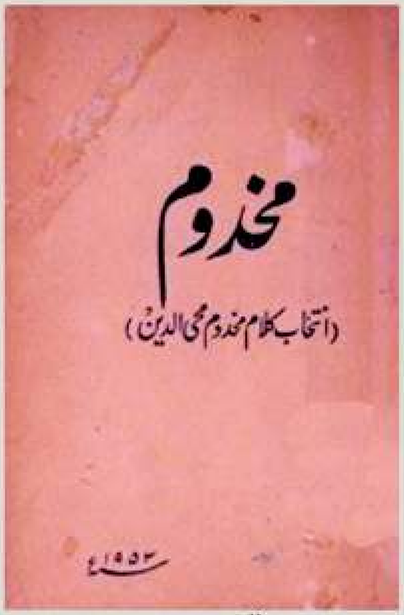

بنیادی طور پر نظم گو شاعر ہونے کے باوجود مخدوم نے غزل کے فارم کو بڑے سلیقے اور احتیاط سے برتا ہے۔ ان کی غزل میں اردو کی روایتی غزل کا لہجہ اور آہنگ ملتا ہے۔ مخدوم نے بلاشبہ غزل کے فن کا پورا اہتمام کیا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی غزل محض روایتی غزل نہیں۔ اس کی فضا عام غزل کی فضا سے مختلف ہے۔ مخدوم کی نظم میں اسلوب کا جو اچھوتا پن، زبان ولفظیات کی تازگی اور فکر کی جو ندرت ملتی ہے قریب قریب وہی خصوصیات ان کی غزل میں بھی موجود ہیں۔ غزل میں انھوں نے جو زبان استعمال کی ہے وہ اگرچہ روایتی غزل ہی سے اخذ کی گئی ہے لیکن فکر واسلوب کی تازگی اسے روایتی غزل کی فضا سے دور لے جاتی ہے۔ ان کی نظموں میں نئے الفاظ کا استعمال اور انداز بیان چونکا دینے والا ہوتا ہے لیکن غزل میں انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ غزل کے فن، زبان اور اسلوب تینوں پر انھوں نے توجہ دی ہے۔ اگر نظم نگار شاعر غزل کہتا ہے تو اس کی غزل پر خارجیت غالب ہوجاتی ہے اور داخلیت گھلاوٹ اور لطافت کی کمی رہتی ہے لیکن مخدوم کی غزل میں یہ بات نہیں ہے۔ مخدوم کی شبابیاتی شاعری میں ایک قسم کی لہک تھی لیکن ان کی غزل میں گداز بھی ملتا ہے۔ وہ غزل میں سیاسی افکار ومسائل کو بیان کرنے کے لیے پرانی علامتیں استعمال کرتے ہیں اور بڑے سلیقے کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔

مخدوم نے گردوپیش کے حالات ومسائل کو اپنے اشعار میں بڑے خلوص اور دلکش انداز میں پیش کیا۔ ماحول کی بے حسی، زندگی میں حرکت وعمل کی کمی اور جذبۂ ایثار وقربانی کے فقدان کو انھوں نے اپنے خوبصورت پیرایۂ اظہار میں بیان کیا ہے ؎

کوئی جلتا ہی نہیں کوئی پگھلتا ہی نہیں
موم بن جاؤ پگھل جاؤ کہ کچھ رات کٹے

نہ کسی آہ کی آواز نہ زنجیر کا شور
آج کیا ہوگیا زنداں میں کہ زنداں چپ ہے

گل ہے قندیل حرم گل ہیں کلیسا کے چراغ
سوئے پیمانہ بڑھے دست دعا آخر شب

ان اشعار میں شاعر کا غم یہ ہے کہ زندگی کی حرارت تو ختم ہوہی چکی ہے۔ آہ کی آواز یعنی صدائے احتجاج تک بلند نہیں ہوتی اور نہ ہی زنجیر کا شور یعنی بغاوت کے لیے جنبش ہوتی ہے۔ سارا ماحول احساس شکست کے بوجھ تلے چپ سادھے ہوئے ہے۔ آہ کی آواز تو کجا وہ اضطراب کے عالم میں کروٹ بدلتا ہوا بھی دکھائی نہیں دیتا۔ چنانچہ وہ دیکھتے ہیں کہ بے یقینی ہے۔ عقیدے کمزور ہو چکے ہیں۔ روشنی دکھائی نہیں دیتی۔ ہیجان اور انتشار ہے۔

جہاں انھوں نے سیاسی اور سماجی زندگی کے نئے مسائل اور نئے تجربات بیان کیے ہیں وہیں انھوں نے حسن وعشق کے تجربات کے اچھوتے پہلو کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اگر انھوں نے کہیں عام اور پرانے عشقیہ تجربات بیان کیے ہیں تو ان تجربات کو بھی ندرت احساس کے ساتھ اور نئے انداز میں پیش کیا ہے۔ ان اشعار میں غزل کا گھسا پٹا اسلوب نہیں ملتا۔ اسلوب کی تازگی نے ان میں نئی بات پیدا کردی ہے ؎

رات بھر درد کی شمع جلتی رہی
غم کی لو تھرتھراتی رہی رات بھر

ہجر میں ملنے شب ماہ کے غم آئے ہیں
چارہ سازوں کو بھی بلواؤ کہ کچھ رات کٹے

بڑھ گیا بادۂ گلگوں کا مزا آخر شب
اور بھی سرخ ہے رخسار حیا آخر شب

وا ہورہی ہے کدۂ نیم شب کی آنکھ
انگڑائی لے رہا ہے جہاں دیکھتے چلیں

وہ غزل میں جو ردیف استعمال کرتے ہیں وہ بولتی ہوئی ہوتی ہے۔ مثلاً آخر شب، دیکھتے چلیں، کچھ رات کٹے وغیرہ اچھی اور بولتی ہوئی ردیف کے استعمال سے غزل کے آہنگ ونغمہ میں اضافہ اور غزل کی معنویت میں قوت

اور توانائی پیدا ہو جاتی ہے۔ غزلوں کے کچھ اور خوبصورت کامیاب اشعار ملاحظہ کیجیے۔

اس شہر میں اک آہوئے خوش چشم سے ہم کو
کم کم ہی سہی نسبت پیمانہ رہی ہے

——

بزم سے دور وہ گاتا رہا تنہا تنہا
سو گیا ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے

——

اس اندھیرے میں اجالوں کا گماں تک بھی نہ تھا
شعلہ رو، شعلہ نوا، شعلہ نظر سے پہلے

مخدوم طبعاً نظم کے شاعر تھے۔ اس لیے ان کی غزلوں پر بھی نظموں کی چھاپ نظر آتی ہے۔ ان کی بیشتر غزلیں مسلسل اور مربوط ہیں جو کہ ترقی پسند شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے۔ لیکن ان کی غزلیں ہیئت و مواد اور تشبیہات واستعارات کے اعتبار سے قدیم اور روایتی انداز لیے ہوئے ہیں۔ شمس الرحمان فاروقی اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ:

''مخدوم کی غزلیں ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی اردو غزل کی سچی اور اصلی روایت کی توسیع ہے۔ جسے سودا نے شروع کیا تھا۔'' (فاروقی کے تبصرے، ص 45)

اسی طرح ڈاکٹر عطاء الرحمٰن، مخدوم کی غزل گوئی کے متعلق اپنی کتاب 'مخدوم محی الدین: حیات اور شاعری' میں رقم طراز ہیں:

''مخدوم کی غزل ان کی شخصیت کی طرح ہی منفرد لہجہ رکھتی ہے۔ ان کی شخصیت میں جو دل نوازی نظر آتی ہے، وہی دل نوازی ان کی غزل میں رچ بس گئی ہے، غزل کے لیے جیسی شگفتہ اور پر از ایما زبان کی ضرورت ہے وہ زبان ان کے پاس پہلے سے تھی اور جس کا استعمال وہ اپنی نظموں میں کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ جذبے کی شدت، احساس کی نزاکت، خیال کی لطافت اور موسیقیت کی آمیزش سے انھوں نے جو غزلیں کہیں وہ منفرد لہجہ رکھتی ہیں۔''

(مخدوم محی الدین: حیات اور شاعری، ص 120-119)

مخدوم کی غزل گوئی کی بنیادی خصوصیت اور اسلوب ونگارش کے متعلق محمد اسامہ فاروقی 'مخدوم محی الدین: الیکسی سوخاچیف' جس کا انھوں نے روسی زبان سے ترجمہ کیا ہے، لکھتے ہیں:

''غزل کی بنیادی خصوصیات کی سختی سے تعین کرنے والی شاعری کے مسلمہ اصولوں کی حدود میں رہتے ہوئے بھی مخدوم کے اسلوب پر انفرادیت اور جدت کی گہری چھاپ ہے۔ ان کی غزل میں نغمگی اور تازگی اظہار، نزاکت احساس اور شائستگی فکر کا مکمل امتزاج ملتا ہے۔''

(مخدوم محی الدین: الیکسی سوخاچیف، ص 119)

مخدوم کی امیجری میں ان کی سیاسی زندگی نے خاصا رنگ بھرا ہے۔ جس نے شاعر کی شخصیت کو سیف وقلم عطا کیا ہے۔ مخدوم کی عملی سیاست نے انھیں عوام میں ہیرو کا درجہ بخشا ہے۔ لیکن مخدوم کی غزل میں وہ سیاسی رنگ کم ملتا ہے جو ان کی نظموں کا طرۂ امتیاز ہے۔ دراصل غزل کی روایت نے بھی مخدوم کو ضبط وتوازن کا سبق پڑھایا ہے۔ چونکہ مخدوم بنیادی طور پر حسن پرست اور عاشقانہ مزاج رکھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے سیاسی اشعار میں بھی جمال کا پاس رکھا ہے۔ جس سے جلال کی تمتماہٹ پر بھی مسکراہٹ کا گمان ہوتا ہے۔ ذیل میں اشعار بطور نمونہ پیش ہیں۔

ہائے کس دھوم سے نکلا ہے شہیدوں کا جلوس
جرم چپ، سر بہ گریباں ہے خفا آخر شب

——

دیپ جلتے ہیں دلوں میں کہ چتا جلتی ہے
اب کی ہولی میں دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے

مخدوم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جب وہ کسی نازک خیالی کو شعر میں پرونا چاہتے ہیں تو وہ ویسے ہی نرم ونازک الفاظ وتراکیب، تشبیہات واستعارات کا استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

پھر چھڑی رات بات پھولوں کی
رات ہے یا برات پھولوں کی
کون دیتا ہے جان پھولوں پر
کون کرتا ہے بات پھولوں کی
وہ شرافت تو دل کے ساتھ گئی
لٹ گئی کائنات پھولوں کی
پھول کھلتے رہیں گے دنیا میں
روز نکلے گی بات پھولوں کی
یہ مہکتی ہوئی غزل مخدوم
جیسے صحرا میں رات پھولوں کی

غرض یہ ہے کہ مخدوم کا غزلیہ سرمایہ قلیل ہونے کے باوجود بیش قیمت ہے۔ جسے اردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ ان غزلوں میں احساس و جذبے کی شدت اور خلوص وصداقت ہر جگہ نمایاں ہے۔ مخدوم نے کم غزلیں کہی ہیں مگر ان کی اکثر وبیشتر غزلوں میں شب یعنی رات کا لفظ ملتا ہے۔ شاید مخدوم جس تاریک دور میں جی رہے تھے، اس کے کنایہ کے طور پر شب کا استعمال کیا ہے اور ایک اچھی صبح، خوشنما سحر کا انتظار کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لہٰذا مخدوم کی غزلوں میں نہ صرف حقیقت اور واقعیت پائی جاتی ہے بلکہ سوز وگداز کی کیفیت بھی واضح

مخدوم نے کم غزلیں کہی ہیں مگر ان کی اکثروبیشتر غزلوں میں شب یعنی رات کا لفظ ملتاہے. شاید مخدوم جس تاریک دور میں جی رہے تھے, اس کے کنایہ کے طور پر شب کا استعمال کیاہے اور ایک اچھی صبح, خوشنماسحر کا انتظار کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں.لہٰذا مخدوم کی غزلوں میں نہ صرف حقیقت اور واقعیت پائی جاتی ہے بلکہ سوزوگداز کی کیفیت بھی واضح طور پر ملتی ہے. اگر وہ اس صنف سخن پرمتواتر توجہ دیتے تو اردو ادب میں قابل قدر اضافہ ہوسکتا تھا. مگر اس کے باوجود بھی وہ بحیثیت غزل گو شاعر اپنے کسی ہم عصر شاعر سے پیچھے نہیں بلکہ غزل کے بنیادی مزاج و آہنگ کی پاسداری کرتے ہوئے اس روایت کو آگے بڑھانے کے معاملے میں وہ فیض سے بھی آگے نظر آتے ہیں.

طور پر ملتی ہے۔ اگر وہ اس صنف سخن پر متواتر توجہ دیتے تو اردو ادب میں قابل قدر اضافہ ہو سکتا تھا۔ مگر اس کے باوجود بھی وہ بحیثیت غزل گو شاعر اپنے کسی ہم عصر شاعر سے پیچھے نہیں بلکہ غزل کے بنیادی مزاج و آہنگ کی پاسداری کرتے ہوئے اس روایت کو آگے بڑھانے کے معاملے میں وہ فیض سے بھی آگے نظر آتے ہیں۔ اس بات کی تائید شمس الرحمان فاروقی کے اس قول سے بھی ہوتی ہے:

''مخدوم کی غزل میں احتیاط اور رکاؤ کے ساتھ وہ انوکھی .... Wistfulness اور نیم طربیہ رنجیدگی اور تفکر ہے جو ان کے ہم عصروں میں شاید مجروح کے علاوہ کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ ان کی غزلیں فیض کی غزلوں سے زیادہ صحیح قدم رکھنے والی اور سڈول ہیں۔''

(فاروقی کے تبصرے، ص 41)

غزل کے تمام ترفنی نکات وجہات اور فکری سنجیدگی کے ساتھ ساتھ شعریت کا خوبصورت امتزاج ان کی غزل میں صاف دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح انھوں نے غزل کا جو سرمایہ چھوڑا ہے، وہ اپنے حسن وتازگی اور کشش وگداز کے اعتبار سے اردو شاعری کا قیمتی، لازوال اور غیر معمولی اثاثہ مانا جاتا رہے گا۔

■

Mohd Hasnain Raza
D-4, 2nd Floor, Okhla Vihar
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025
Mob.:9891675442

ابوذر عبدالاحد فرقانی

نرالے میاں شمس

دبستان رام پور کا ایک درِّ ناسفتہ

اردو شعر و ادب اور اس کی تاریخ کا جب بھی ذکر ہوتا ہے تو عموماً شمالی ہندوستان میں قومی دار الخلافہ دہلی سے شمال مشرقی صوبہ اتر پردیش کے دار السلطنت لکھنؤ تک محیط رہتا ہے۔ ان دونوں مرکزی شہروں کے باہمی فاصلوں کے تقریباً درمیان میں چھوٹا سا لیکن اردو شاعری میں نہایت اہمیت کا حامل ایک شہر رام پور ہے جو برطانوی سامراج تک روہیلوں کی ایک مقتدر ریاست بھی تھا۔ حیدرآباد دکن کے بعد رام پور کا نام و شہرہ تھا۔ امام الشعرا غالب نے اس کو دارالسرور اور ادبی اعتبار سے روکش شیراز و اصفہان کہا تو کسی نے اس شہر کو بخارائے ہند کہا۔ یہ سب اس کی ادبی اہمیت و عظمت کی دلیل ہے۔ یہاں کے نوابین و امرا بنفس نفیس نہ صرف شاعری کرتے بلکہ ادب نواز و ادب پرور بھی تھے۔ لوح و قلم کی پرورش میں اپنی مثال آپ تھے۔ یہاں بیک وقت غالب و داغ اور امیر مینائی اور مصحفی وغیرہ دربار رام پور سے وابستہ رہے یہاں عوام الناس بھی بڑا اعلیٰ و لطیف ذوق رکھتے۔ شعر گوئی و شعر فہمی یہاں کی ایک امتیازی شان اور پورے ہندوستان میں ایک شناخت تھی۔ دہلی اور لکھنؤ اسکول سے استفادہ کے نتیجے میں یہاں ایک الگ اسلوب کا ظہور ہوا اور اسی لیے اردو شعر و ادب کا یہ تیسرا اسکول مان لیا گیا۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ادب کی تاریخ لکھنے والے قایم چاند پوری اور رام بابو سکسینہ وغیرہ کے علاوہ دیگر تاریخ نویسوں نے بھی رام پور اسکول کے انفرادی و امتیازی اسلوب کی تعریف و توصیف کی ہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا اور عصر حاضر کے دانشور، تبصرہ نگار اور صاحب نظر قلم کار بھی رام پور اسکول کو الگ ہی تسلیم کرتے ہیں۔

موجودہ دور کے ایک بہت بڑے ژرف نگاہ ناقد و مبصر پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب ''دبستان کی توجیہ و توضیح کو Analyse کرنے کے دو زاویے بیان کرتے ہیں۔ ایک زبان و بیان کی سلاست، روزمرہ محاورہ کی فصاحت، اور اسلوب و ادا، دوسرا مضامین کی تلاش، معنی بندی، نزاکت خیال، اور لب و لہجہ اور ان دونوں شرائط کے ساتھ فنی اصول کی رعایت اور پاس داری۔ مزید برآں شاعری کی روایت، اساتذۂ فن کی تعداد اور ان سے تلامذہ کا سلسلہ بھی فاروقی صاحب کے ہاں دبستان کے معیار اور کسوٹی کا اہم جز ہے۔ اس معیار پر رام پور کی شاعری کما حقہ پوری اترتی ہے اور اسی لیے یہاں کا فن اور معیار شاعری 'دبستان رام پور' کہلانے کا مستحق گردانا گیا۔ ہم نے اپنے محدود مطالعے سے جو نتیجہ اخذ کیا اس کے مطابق دبستانوں کا اختصاص اور تعین غالباً محض غزل گوئی کی بنیاد پر کیا جاتا رہا اور دیگر اصناف سخن خصوصاً نظم گوئی جس میں قصیدہ و مرثیہ بھی شامل ہیں کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ جبکہ نظم گوئی ایسی اہم ترین صنف سخن ہے جس سے شاعر کے علم کی وسعتوں اور مشاہدہ کی توانائی، مضمون پر مضبوط گرفت، ابتذال سے ماوراء محاسن و معائب کو وضاحت اور تسلسل سے بیان کرنے کا فن اور شعری اصول و ضوابط کی حدود میں رہ کر قادر الکلامی کا پتہ چلتا ہے۔ ایک ذی علم، چشم بینا اور قوت مشاہدہ رکھنے والا قادر الکلام شاعر اپنے عمیق مطالعہ اور تمام تجربات و مشاہدات کے ساتھ اپنے مافی الضمیر کو سپرد قلم کرنا چاہتا ہے تو اس کو غزل کا دامن تنگ لگتا ہے۔ بقول غالب

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

یہی وہ مقام ہے جہاں شاعر نظم گوئی کو ذریعہ اظہار بناتا ہے علامہ اقبال اور جوش ملیح آبادی کی نظم گوئی اس کی روشن مثال ہے۔ ان دونوں عظیم شعرا نے نظم گوئی کی بدولت شاعری کے اعلیٰ ترین معیار قائم کیے جو فن کی تکنیکی خوبیوں کے ساتھ دل کو چھو جانے اور دماغ کو روشن کر دینے میں عدیم المثال ہیں۔ لیکن یہ دونوں شعرا ہی کسی دبستان ادب سے وابستہ نہیں ہیں۔

دبستان رام پور کا غزل گوئی میں ایک ممتاز مقام ہے۔ رام پور اسکول کے تمام شعرا لیلائے غزل کے دام الفت میں گرفتار رہے اور اسی کے گیسو سنوارنے میں منہمک رہے۔ دیگر اصناف سخن سے یہاں بے التفاتی برتی گئی جیسا کہ پورے ہندوستان میں یہی چلن تھا۔ مگر ترقی پسند تحریک سے پہلے ہی پنجاب میں مولانا الطاف حسین حالی اور علامہ اقبال، فیض احمد فیض، ساحر لدھیانوی (اگر فلم سے وابستگی معیوب نہ سمجھی جائے) اور اودھ کے وسیع علاقہ میں انیس و دبیر کے بعد جوش ملیح آبادی نظم گو شعرا میں وہ عظیم خلاقان شعر و ادب ہیں جنہوں نے اردو شاعری کو معراج تک پہنچا کر دوام بخش دیا۔ اسی طرح رام پور میں بھی چند شعرا نے غزل گوئی کے ساتھ نظم گوئی

میں بھی طبع آزمائی کی اور وہ جوہر دکھائے کہ میدان سرکر لیا۔ انھیں نظم گوشعرا میں اہم ترین نام ہے نرالے میاں شمس کا جن کا مجموعۂ کلام 'نگارآتشیں' بعدازمرگ منظرعام پرآیا ہے۔ بالکل اس شعر کے مصداق۔

ہمارے بعد ہمیں ڈھونڈنے چلی دنیا
جلے چراغ مگر دیر سے چراغ جلے

اس مجموعے کے مرتب رام پور کے ہی عبداللہ خالد ہیں۔

یوں تو دبستان رام پور کے شعرا میں نظم گوئی، قصیدہ اور رباعی وغیرہ اصناف سخن میں کئی نامور شعرا ہوئے جن میں نظم و رباعی گو استاد الشعرا محشر عنایتی، قصیدہ گوئی میں خیال رام پوری اور ابھی حال ہی میں رخصت ہوئے شوق اثری صاحب کی تخلیقات قابل توجہ ہیں۔ بہرحال ایسے تمام شعرا میں ہمارے خیال سے نرالے میاں شمس کا نام سرفہرست آنا چاہیے۔ ہمیں علم وفن اور شعرگوئی بالخصوص نظم وقصیدہ میں نرالے میاں شمس رام پور کے شعرا میں کچھ زیادہ نمایاں اور دراز قد لگے۔ آپ کی منظومات کا ہرزاویہ سے علامہ اقبال اور جوش ملیح آبادی کے کلام سے موازنہ کیا جاسکتا ہے۔ اگر طبع شدہ مجموعہ ہائے کلام کی تعداد سے صرف نظر کیا جائے تو شمس شادانی کا جتنا بھی کلام دستیاب ہے ہمارے دعوے کے ثبوت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ 'نگارآتشیں' پورے دوسوصفحات پر بھی مشتمل نہیں سات کم ہیں۔ ان میں 19 صفحات اصحاب نظر کے نثری قصیدوں کے کام آگئے۔ باقی نگارشات میں تخلیق کار شمس شادانی مرحوم کا ایک ایک مصرعہ'از دل خیزد و بردل ریزد' کا ترجمان ہے۔ سب سے پہلے حسب ضابطہ و دستور حمد باری تعالی ہے جو برنگ ساقی نامہ ہے۔

مجھے کلید در میکدہ عطا کردے!
خودی کا راز بتادے حق آشنا کردے
تو بے نظیر ہے لا زوال ہے ساقی
ترا شریک ہو کوئی، محال ہے ساقی
کرے جو ہمسری تری، مجال ہے ساقی
تو بے نیاز ہے، تو ذوالجلال ہے ساقی
یہ طے ہے عالم امکاں سے ماورا تو ہے
تجھے بتائے کوئی کس طرح خدا تو ہے
مہیمن و متکبر، عزیز اور جبار
سمیع و باسط و قدوس، خالق و قہار
توئی رحیم ہے، رحمٰن ہے، توئی غفار
تیری صفات سے میخانہ ہوگیا گلزار
اک ادنی ذرہ مکمل ترا فسانہ ہے
ترے علاوہ بھی کچھ ہے یہ سب بہانا ہے

پورے 24 بند کی اس حمد ومناجات میں خالق کائنات کی کبریائی، عظمت وربوبیت اور اظہار عبدیت ایسے جذب وکیف اور خشوع وخضوع کے ساتھ چنیدہ الفاظ اور بے مثال انداز میں ہے کہ قاری پر وجد کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ اسمائے حسنہ کا علم، فہم وادراک اور برمحل استعمال عربی زبان پر ان کی دستگاہ کا ثبوت ہے۔ علامہ اقبال کے بال جبریل کے اشعار۔

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے
بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

اور یہ بھی۔

گرچہ ہے میری جستجو دیر وحرم کی نقش بند
میری فغاں سے رستخیز کعبہ وسومناتھ میں

الفاظ، لہجہ اور انداز بیان میں مماثلت نہیں بلکہ نمایاں فرق بھی ہے۔ جوش ملیح آبادی سخن وری کے ہرمیدان میں پرجوش رہتے ہیں تاہم بندگی کے انداز اظہار میں عاجزی، بےلاگ معصومیت اور بےطمع طلب ملاحظہ ہو۔

تجھ پہ روشن ہے اے مرے مولا
کہ مرے دل میں سوز وحدت ہے
تیرے انعام کی نہیں خواہش
بلکہ مجھ کو تری ضرورت ہے

ایسا ہی مضمون جو اگرچہ حمد ونعت یا مناجات تو نہیں کیوں کہ جوش کے بارے میں عام رائے ہے کہ دین سے عملا لاتعلق تھے تاہم رحمت الٰہی پر کچھ اس انداز سے یقین تھا۔

اوہام و یقیں میں فرق کردے ساقی
آ ذہن رسا کو برق کردے ساقی
اس وسوسہ ارض و سما کو اللہ!
اٹھ رطل گراں میں غرق کردے ساقی

رند بلانوش غالب نے بھی بندگی کے لیے جنت کو بھی دوزخ میں ڈال دینے کی بات کہی لیکن لفظوں کے انتخاب واستعمال سے اثرانگیزی کی بات ہی الگ ہے۔ اب ہم شمس صاحب کی طرف آتے ہیں۔

شمس صاحب کی مذکورہ حمد کے دو بند ملاحظہ ہو۔

یہی معمہ کہ جو حل طلب تھا مخفی تھا
یہیں سے راز کھلا کیا خودی ہے کیا ہے خدا
خبر تھی ساجد و مسجود سے ہے کیا ایما
یہیں سے مقصد ومقصود کا کھلا منشا
یہیں سے وحدت وکثرت کا پردہ چاک ہوا
یہیں سے شاہد ومشہود سے بنی دنیا

یہیں سے توبہ یہیں سے خطا وسود وزیاں
یہیں سے عصمت کروبیاں ہوئی لرزاں
یہیں سے نخوت ابلیس ہوگئی ترساں
یہیں سے ہوگیا افشائے باطن عصیاں
یہیں سے لغزش آدم سے کائنات بنی
یہیں سے ہوگیا سب کچھ عیاں جو تھا مخفی

باوقار وبلیغ الفاظ کی مسلسل آمد اور آبشار کی روانی کلام اقبال وکلام جوش کی سی کیفیت زائیدگی سے سرموکم نہیں ہے۔ اسی طرح نعت میں فصاحت وبلاغت، الفاظ کی روانی اور انداز بیان۔

اے کہ تو باعث تخلیق دو عالم سبھی
سیدی طیبی سردار رسولاں لقبی
اے کہ تو مہبط انوار الٰہی لاریب
"مرحبا سید مکی مدنی العربی"

لیکن اے عظمت کونین بایں اوج شعور
تیری توصیف میں لرزاں ہے مرا قلب وجگر
شاعر آں کس کہ کند مدحت ممدوح الہ
صنعت صانع اکمل ہے صورت میں بشر

نعت سرور کائنات میں ایک جگہ شیخ سعدی کے نعتیہ اشعار جس میں تین مصرے عربی کے اور آخری فارسی میں 'بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر' کی تضمین نہایت جذباتی اور وجدانی الفاظ میں کی ہے۔

فارسی وعربی الفاظ، اضافتیں، ترکیبیں، استعارے، اعلی فکر، عمیق جذبہ، وجدانی کیفیت اور انداز بیان سب کچھ علامہ اقبال اور جوش ملیح آبادی (شاعر آخرالزماں بقلم خود) کے کلام سے کسی طور کم نہیں۔ یہ انداز بیان محض حمد ونعت اور منقبت تک ہی محدود نہیں بلکہ غزل، رباعی و قطعہ ہرصنف میں موجود وآشکار ہے۔ قطعہ ملاحظہ ہو جو 'نحن اقرب الیہ من حبل الورید' کی تفسیر اور فلسفۂ وسیلہ یا پیری مریدی کی تنکیر ہے۔

خدا کو پانے میں غوث وولی کی کیسی تلاش
وسیلہ ڈھونڈنے والے خدا کو کیا جانیں
مقام مومن و معبود وہ بتائیں گے
کہ جو غلافوں میں لپٹا ہوا خدا رکھیں

کیا طنز ہے۔

علامہ اقبال ملا اور ہندوستانی اسلام اور خانقاہی فلسفہ پر تلمیحات کے ساتھ یوں نشتر لگاتے ہیں۔

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذر و دلق اویس و چادر زہرا

غزل شاعری کا اولین باب بلکہ ہر مبتدی شاعر کے لیے حرف ابجد ہے۔ بنظر غائر دیکھا جائے تو یہ بھی قصیدہ سرائی کی ایک قسم ہے۔ قصیدہ میں عموماً شاہ وقت یا ارباب اقتدار میں کوئی ایک ممدوح ہوتا ہے۔ غزل میں عموماً خیالی ورنہ حقیقی محبوب کے لب و رخسار، غنچہ دہنی، دست و بازو، سروقدی، جامہ زیبی اور گل پیرہنی اور حد ہے کہ کج کلاہی تک کی تعریف کی جاتی ہے۔

زفرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا ست

یہ الگ بات ہے کہ غزل کا کینوس اب کشادہ ہو گیا ہے محض ہجر و وصال کی حکایات خوں چکاں ہی نہیں غم دوراں اور آلام روزگار کا بیان بہ تقاضائے وقت اور وسعت نظر کے نتیجہ میں مدغم ہو کر مزہ دینے لگا ہے۔ مگر غزل کا لہجہ دلربا اور پیکر دلکش ہی رہا۔ غزل کی تعریف میں تاحال کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ یعنی وہی۔

یار سے پیار کی باتوں کو غزل کہتے ہیں

طوالت سے احتراز کرتے ہوئے ہم شمس شادانی، علامہ اقبال اور جوش ملیح آبادی کی غزلیات کے نمونے برائے ملاحظہ پیش کرتے ہیں۔

اقبال۔

آہ! دنیا دل سمجھتی ہے جسے وہ دل نہیں
پہلوئے انساں میں اک ہنگامۂ خاموش ہے

ابر نیساں یہ تنک بخشی شبنم کب تک
مرے کہسار کے لالے ہیں تہی جام ابھی

جوش ملیح آبادی۔

شکر ایزد کہ وہ سر خیل مسیحا نفساں
زلف بردوش پئے پرسش بیمار آیا

جام اٹھا جام کہ سرشاری و مستی کے بغیر
خندہ حور و تماشائے جہاں کچھ بھی نہیں

اور یہ ہیں جناب شمس شادانی۔

اٹھا دے قید ہست و بود اے دل بے نشاں ہو کر
تعین کی حدیں سب توڑ دے تو لامکاں ہو کر

اے نظر تجدید ذوق جلوہ کرنا ہے اگر
کیوں نہ دیکھیں پھر انھیں اک بار بے باکانہ ہم

پردہ ہے آخر کس لیے میرے تمہارے درمیاں
میں حامل قلب و نظر تم ذرّے ذرّے سے عیاں

اور کچھ ساتھ نبھا دے تجھے غم کی سوگند
پھر خدا جانے کہاں ہم شب ہجراں ہوں گے

مضمون میں تغزل، لہجہ میں نغمگی، ادائیگی الفاظ میں برجستگی، سلاست اور خاص طور پر ہندی کا بے تکلف اور برمحل استعمال غزل کو کیا تفہیم عام بخش رہا ہے۔ رباعیات بھی ملاحظہ ہوں۔

علامہ اقبال۔

خدائی اہتمام خشک و تر ہے
خداوندا خدائی درد سر ہے
ولیکن بندگی استغفر اللہ
یہ درد سر نہیں درد جگر ہے

جوش ملیح آبادی۔

کیا شیخ کی خشک زندگانی گزری
بے چارے کی ایک شب نہ سہانی گزری
دوزخ کے تخیل میں بڑھاپا گزرا
جنت کی دعاؤں میں جوانی گزری

اور حضرت نرالے میاں شمس شادانی کی رباعی بھی ملاحظہ فرمائیں۔

یہ طاعت وزہد یہ ایماں کیا ہے
یہ حشر، یہ قہاری یزداں کیا ہے
واعظ نہ ڈرا نار جہنم سے ہمیں
واقف نہیں تو حکمت عصیاں کیا ہے

شیخ و برہمن اور واعظ و ناصح سے اردو فارسی کے ہر شاعر کی یہ ازلی چپقلش اور دشمنی بھی کلام کے معیاری ہونے کا پیمانہ ہے بشرطیکہ لہجہ میں نفاست اور انداز بیان میں ندرت ہو۔

سید شمس الدین خاں نرالے میاں شمس شادانی رام پور کے ایک ایسے باعزت گھرانے کے چشم و چراغ تھے جہاں دینی و عصری علوم کے علاوہ مروجہ اعلیٰ فنون جیسے شہ سواری اور تیراکی وغیرہ بھی باعث ناموری تھے۔ آپ کے دادا حضرت طالب رام پوری امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ والد عنایت اللہ خاں عرف بہادر شاہ خاں اپنے فرزند کی شیر خواری میں ہی ملک عدم کو کوچ کر گئے۔ یہ خاندان حضرت نظام الدین اولیا جیسے برگزیدہ بزرگ کا ہم رتبہ اور حسنی و حسینی سید خاندان تھا۔ ریاست رام پور کے کسی فرمانروا غالباً نواب سید حامد علی خاں نے گھڑ سواری میں مہارت رکھنے کے سبب 'خان' کا خطاب دیا۔ یہ بات 'نگار آتشیں' کے کسی صفحے پر رقم نہیں ہے البتہ عزیزم جمیل رضا خاں وارثی یعنی شمس صاحب کے نواسے نے یہ معلومات زبانی فراہم کی ہیں۔

شمس صاحب نے مولوی سید اسد علی صاحب کی شاگردی میں قرآن کریم حفظ کیا۔ الہ آباد بورڈ سے انٹرمیڈیٹ کیا اور اس زمانہ کے مشہور ترین مدرسہ عالیہ میں داخلہ لیا جہاں حضرت شاداں بلگرامی کے تلمذ میں آئے اور اس تلمیذ کو اعلیٰ ترین و آخری سند فضیلت گردانا۔ سرکاری رنیم سرکاری نوکری کین سوسائٹی میں بحیثیت سپروائزر کی۔ اکل حلال پر قناعت کر کے خوشحال زندگی تو نہیں گزاری البتہ عزت و ناموری کی دولت خوب کمائی۔

سورہ رحمٰن کا منظوم ترجمہ رقم کرنے کے بعد بھی جوش ملیح آبادی دہریت و الحاد میں گرفتار مصور شباب رہے یا شاعر انقلاب۔ تاہم مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو جیسے اکابر اور ارباب حل و عقد کی رفاقت کی بدولت پدم بھوشن کا سرکاری اعزاز حاصل کر کے سربلند رہے اور عالمگیر شہرت پائی۔ یہ دونوں عظیم شعرا اہلیت بھی رکھتے تھے۔ واقعی ع

حق بحق دار رسید

لیکن اسی 'مہان بھارت' یعنی غیر منقسم ہندوستان میں پیدا ہونے والے اور ہماری ناقص رائے میں علم کے میدان اور فن شاعری میں یکساں مہارت و ہم سری رکھنے والے حضرت شمس شادانی شہرت و ناموری کے پہلے پائیدان پر بھی نہ آسکے۔ مگر شاید موت نے تینوں میں مساوات یوں قائم کی کہ پاکستان کی زمین نے تینوں کے لیے آغوش لحد وا کر دی۔

علامہ اقبال اور جوش ملیح آبادی کا سارا کلام دنیا بھر میں پڑھا جاتا ہے، ان کی شخصیات اور تخلیقات پر سیمینار ہوتے ہیں، تحقیق ہوتی ہے، سندیں ملتی ہیں۔ حیف کہ نرالے میاں شمس شادانی ایسے قادر الکلام (لغوی معنی میں علامہ شاعر) کو کسی نے رام پور اسکول کا محض 'نمائندہ شاعر' بھی نہیں لکھا۔ عمر کے آخری دور میں پاکستان کی سرزمین پر سید ابوالاعلیٰ مودودی اور رام پور کے محمد ذاکر علی خاں علیگ جیسی با اثر و رسوخ ہستیوں کی دستگیری سے بھی کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ حضرت ہوش نعمانی کا حزن و ملال اور کرب و احساس بجا و درست معلوم ہوتا ہے، جب انھوں نے لکھا: ''قسم خدا کی... اگر شمس شادانی مرحوم کی نظموں پر صحیح صحیح تنقیدی قلم اٹھتا تو ایک عظیم المرتبت شاعر پر اس کی زد پڑتی جسے حکومت کی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔''

■

Abu Zar Abdul Ahad Furqani
Opposit Kohinoor Pustak Sadan
Shahabad Gate
Rampur - 244901 (UP)
Mob.: 09456217121

انفارمیشن ٹیکنالوجی اور اردو

عرفان رشید

عہد حاضر کی بیشتر ترقیات کا انحصار ٹیکنالوجی پر ہے۔اس انحصار کی نوعیت یہ ہے کہ اب یہ نہ صرف انسانی زندگی کے لیے بلکہ دیگر تمام شعبہ حیات کے لیے بھی ناگزیر ہوگیا ہے۔ٹی وی، کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور سیل فون کے ذریعے معلومات کا برق رفتاری سے تبادلہ عمل میں آرہا ہے اور انسان انفارمیشن ٹکنالوجی کے اس طوفان میں مشینی زندگی گذارنے پر مجبور ہوگیا ہے۔اکیسویں صدی کو انفارمیشن ٹیکنالوجی کی صدی کہا جاتا ہے۔دنیا بھر میں پل پل رونما ہورہے واقعات کو بریکنگ نیوز کے نام سے جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے برق رفتاری سے لوگوں تک پہنچایا جارہا ہے۔ پہلے اخبار کا نامہ نگار کاغذ پر نیوز لکھ کر بس یا ٹرین کی سہولت اور پوسٹ کے ذریعے نیوز روانہ کرتا تھا جس میں کافی وقت لگتا تھا۔ جب کہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کی سہولت سے یہ کام اب ای میل کے ذریعے فوری ہونے لگا ہے۔دنیا بھر کے اخبارات کا مطالعہ اور اپنی پسند کی کسی کتاب یا کسی مواد کو اپنے ڈیسک ٹاپ اسکرین اور لیپ ٹاپ پر تلاش کرنا اور پڑھنا اب خواب نہیں رہا اور ہماری روزمرہ زندگی کی حقیقت بن گیا ہے۔

عصر حاضر میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے بڑھتے استعمال نے اردو زبان کو بھی اس نئی ترقی سے ہم آہنگ ہونے کا حوصلہ دیا۔اور جو زبان پہلے قلمی کتابت کے ذریعے اخباروں اور کتابوں سے عوام تک پہنچتی تھی۔اب کمپیوٹر کتابت اور الیکٹرانک ذرائع سے ہم آہنگ ہوکر ترقی کی راہیں طے کررہی ہے۔اردو یونی ورسٹیوں کا قیام،لندن، شکاگو، جدہ اور خلیجی ممالک میں منعقدہ عالمی سمینار اور مشاعرے،سیکڑوں ویڈیو،آڈیو پروگرام،ڈاکومنٹری،انٹرنیٹ پر دستیاب ہونے والی اردو کی بے شمار ویب سائٹس، امریکہ اور یورپی ممالک سے شائع ہونے والے ماہنامے، روزنامے اور جرائد نے اس زبان کو ایک نئی وسعت عطا کی اور ایک اندازے کے مطابق دنیا میں اردو بولنے والے 25 کروڑ عوام اور فاصلاتی نظام تعلیم کے دائرہ اثر نے یہ ثابت کردیا ہے کہ ’’اردو کے روئے زیبا کی کشش سے پروانے خود بخود اس کی طرف مائل ہوگئے ہیں۔‘‘

اردو ایک عالمی زبان ہے۔اردو زبان کی گنگا جمنی تہذیب،اردو غزل اور اردو زبان کی ہمہ گیریت نے اسے بلاشبہ دنیا بھر کی مقبول اور پسندیدہ زبان بنادیا ہے۔ امیر خسرو، ولی، میرو غالب نے اردو زبان کی جو وراثت چھوڑی تھی اس پر اردو کی آنے والی نسلوں نے شاندار تہذیبی عمارت تعمیر کی ہے اور دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح اردو بھی 21ویں صدی کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہورہی ہے۔اردو زبان میں تعلیم اور روزگار کے بڑھتے مواقع اور اردو کی نئی بستیوں کے براعظم یورپ،امریکہ،افریقہ اور آسٹریلیا میں قائم ہونا اور وہاں اس زبان کی بڑھتی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو کا مستقبل روشن ہے۔

پہلے اردو زبان اور تعلیم ریڈیو اور ٹیلی ویژن تک محدود تھی۔ان دنوں کمپوٹر اور انٹرنیٹ کے سہارے اس کے دائرہ کار ورالڈ وائیڈ ویب (World wid web) کے ذریعے بڑھ گیا ہے۔ای ٹیوشن،ای لرننگ،ای ایجوکیشنل آڈیو،ویڈیوی ڈیز (Micro Chip)، ای۔میل وغیرہ کے ذریعے انسان نے دنیا کو مٹھی میں بند کردیا ہے۔اس زبان نے سائبر اسپیس میں بھی اپنے قدم جمائے ہیں اور تکنیکی وسائنسی ترقیات سے ہم آہنگ ہوگئی ہے۔

سائبر اسپیس ایک جدید تصور (Concept) ہے۔ اگر آپ کسی پرانی لغت میں Cyberspace کی اصطلاح کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے تو ظاہر ہے کہ یہ وہاں نہیں ملے گی لیکن نئی لغات میں اس اصطلاح کے بارے میں وضاحتیں مل جاتی ہیں۔سب سے پہلے اس اصطلاح کا استعمال Norbert Winer نے 1948 میں اپنی کتاب Cybernetics or control and

commination in the animal and machine میں کیا ہے۔ ان کے نزدیک انسان اور مشین ایک دوسرے کے ساتھ Interact کر سکتے ہیں۔ دونوں کے درمیان بننے والے رابطے کو انھوں نے Cybernetics کا نام دیا تھا۔ 1982 میں cyberspace کی اصطلاح کا انگریزی میں باقاعدہ استعمال William Gibson نے اپنے ایک سائنسی افسانے Burning Chrome میں کیا۔ (https://en.wikipedia.org/wiki/Cybernetics)

یہ وہ دور تھا جب انٹرنیٹ اور ڈیجیٹل کمیونیکیشن Digital Communication انسانی سماج میں بڑی تیزی سے پھیل رہے تھے اور یہ نووارد اصطلاح Cyberspace اپنے اندر اس نئی نئی ابھرتی ٹیکنالوجی کے مختلف پہلوؤں اور جدید تصورات کے اظہار کی بھرپور صلاحیت رکھتی تھی۔ آج Cyberspace نہ صرف انگریزی میں بلکہ دنیا کی کئی ایسی زبانوں میں جن کا رسم الخط رومن نہیں ہے، ان میں بھی اس اصطلاح کو من وعن قبول کر لیا گیا ہے۔ جس کی زندہ مثال ہماری اردو زبان ہے۔ دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح ہماری زبان اردو نے بھی جھجکتے جھجکتے آخر کار سائبر اسپیس میں قدم رکھ ہی دیا۔ کچھ دنوں تک یہ بھی سہمی سی سائبر اسپیس کی وسعتوں میں بھٹکی۔ اپنے اظہار کے لیے پہلے پہل رومن رسم الخط کا سہارا لیا لیکن جلد ہی اس نے نئے جہان کے آداب سیکھ لیے اور دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح پورے وقار کے ساتھ سائبر اسپیس میں اپنی جگہ بنا لی۔ اردو گوگل پیج پر آپ یونی کوڈ میں کسی بھی شاعر یا ادیب کا نام ٹائپ کر کے اس سے متعلق معلومات اور مواد حاصل کر سکتے ہیں۔ یونی کوڈ سے پہلے یہ سب سہولیات اردو زبان میں میسر نہیں تھی۔ یونی کوڈ نظام کو مکمل طور پر ونڈوز ایکس پی میں شامل کیا گیا اس سہولت کے شامل ہونے سے کسی خاص اردو سافٹ ویئر کی ضرورت باقی نہیں رہی بلکہ جہاں دیگر کئی زبان جیسے انگریزی لکھی جاتی تھی وہیں پر اردو بھی بالکل اسی طرح لکھی جانے لگی۔

انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کی ہمہ جہت افادیت کے پیش نظر اگر اردو، انٹرنیٹ اور کمپوٹر کی طرف دیکھتے ہیں تو انٹرنیٹ تمام وسعتوں کے باوجود اردو دنیا کے لیے بہت زیادہ بہرہ مند ثابت نہیں ہو رہا ہے کیونکہ اس کی وسعتوں کے اعتبار سے اردو میں اس کا استعمال محدود ہے۔ انٹرنیٹ پر جہاں دنیا کے تمام علوم سے متعلق اعلیٰ معیار کے مواد بڑی مقدار میں ہیں وہاں اردو زبان وادب کے حوالے سے ویب سائٹس کی تعداد اور معیار بہت حوصلہ افزا نہیں ہیں۔

مگر یہ خوشی کی بات ہے کہ ہماری اردو زبان بھی اس قابل اور اس لائق ہو چکی ہے کہ وہ جدید ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ ہو سکے۔ اس نے بھی خود کو کمپوٹر کی زبان بنا لیا ہے۔ اب ہمیں انٹرنیٹ اور کمپوٹر کے استعمال کے لیے کسی اور زبان کے سہارے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہم پورے کمپوٹر کو اردو میں منتقل کر سکتے ہیں۔ ای میل، چیٹنگ، براؤزنگ سب اردو زبان میں کر سکتے ہیں۔ اردو یونی کوڈ نے یہ ممکن کر دکھایا ہے۔ انٹرنیٹ پر اردو میں ڈیجٹل لائبریری اور کئی اہم ادبی، تہذیبی، ثقافتی اور تعلیمی سائٹس موجود ہیں۔ آج سے دو دہائی قبل ان پیج کے ذریعے کمپوٹر پر اردو کتابت کا کام شروع ہوا اور اردو اخبارات اور کتابیں کمپوٹر کی خوبصورتی سے آراستہ ہو کر شائع ہونے لگی تھیں۔ انٹرنیٹ کے فروغ کے بعد گوگل سرچ میں اگر ہم اردو کے کسی موضوع پر اردو مواد ڈھونڈنا چاہتے تو اردو ان پیج کی کمزوری سے اردو کا بیش قیمت مواد انٹرنیٹ پر نظر آنے سے محروم رہا۔ جب دنیا میں کمپوٹر کا استعمال بڑھا اور ٹیلی ویژن، سیلفون اور دیگر ٹیکنالوجی کے آلات میں اردو کے استعمال کی ضرورت بڑھی تو اردو کے علاوہ دنیا کی تمام زبانوں کو کمپوٹر کے ایم ایس آفس پروگرام اور انٹرنیٹ کے مختلف پروگراموں میں شامل کرنے کے لیے زبانوں کا یونی کوڈ نظام شروع کیا گیا اور اس کے اعتبار سے کی بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی۔ اردو میں جمیل نوری نستعلیق اور علوی نستعلیق فانٹس تیار ہوئے۔ جن کی مدد سے ایم ایس آفس کے کسی بھی پروگرام جیسے فیس بک، ٹویٹر اور دیگر پروگراموں اور سیلفون میں اردو لکھنا آسان ہو گیا اور ان پیج کو یونی کوڈ میں منتقل کرتے ہوئے اردو زبان وادب کا بیش قیمت ذخیرہ انٹرنیٹ پر محفوظ کر دیا گیا ہے۔ آج اگر کوئی گھر بیٹھے اپنے کمپوٹر پر کلیاتِ اقبال، دیوانِ غالب، مضامینِ سرسید یا کوئی اور اردو کی کتاب دیکھنا چاہتا ہے تو وہ یونی کوڈ کی سہولیت کو گوگل سرچ میں استعمال کرے تو اردو زبان وادب کا ایک نیا جہاں نظر آئے گا۔

اردو سافٹ ویئر کے تعلق سے اگر بات کی جائے تو اس کا سفر تقریباً 35 برسوں پر محیط ہے۔ 1980 میں پاکستان کے مرزا جمیل احمد نے سافٹ ویئر تیار کرنے کی غیر ملکی کمپنی سے رابطہ کر لیا اور ان کی ممکنہ کاوشوں کے باعث اردو سافٹ ویئر کی شروعات ہوئی۔ اخبار کی دنیا میں اس کا سب سے پہلا استعمال اخبار 'جنگ' پاکستان نے کیا۔ عالم کاری اور جدید کاری کے اس دور میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اردو کو انفارمیشن ٹکنالوجی سے جوڑ کر وقت کا ایک اہم تقاضا پورا کر لیا ہے۔ اردو کی مختلف ویب سائٹس آج انٹرنیٹ پر بیش بہا ادبی اور علمی خزانے سے لبریز ہیں۔ انھی میں سے ایک ریختہ ڈاٹ او آر جی ہے جسے غیر مسلم اردو عاشق سنجیو صراف نہایت کامیابی اور عمدگی کے ساتھ انٹرنیٹ پر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ انٹرنیٹ پر ریختہ کے حوالے سے ڈاکٹر حامد بیگ یوں رقمطراز ہیں:

''آج ریختہ ڈاٹ او آر جی پر ابجدی فہرست میں 300 سے زائد شاعروں کے کلام کے ویڈیوز موجود ہیں جسے تین ہزار سے زائد گلوکاروں نے گایا ہے۔ اس ویب سائٹ پر تا حال 18633 غزلیں، 14335 متفرق اشعار کی نظمیں، تمام فلمی غزلوں کے ویڈیوز اور 18490 ای بکس کا گراں قدر سرمایہ اپ لوڈ کیا گیا ہے جسے 154 ممالک کے ڈھائی لاکھ سے زیادہ اردو شائقین کی نگاہیں بقدر ظرف وشوق ملاحظہ کر رہی ہیں۔ یہ سب اس لیے ممکن ہو سکا کہ اس ویب سائٹ کے بانی سنجیو صراف کو اردو شاعری سے بے حد فطری اور روراثتی لگاؤ ہے۔ وہ اردو پڑھنا جانتے ہیں انہیں آرٹ اور موسیقی سے بھی گہری دلچسپی ہے۔''

(ریختہ ڈاٹ او آر جی: ڈاکٹر حامد اشرف، تجاویز، ایم ایم پبلی کیشنز، دہلی)

وکی پیڈیا یہ ایک ایسا تحریری پلیٹ فارم ہے جو علم و دانش کی تمام شاخوں پر اطلاعات فراہم کرنے کا قصد کرتا ہے۔ گرچہ وکی پیڈیا کی شروعات 2005 میں ہوئی لیکن اردو میں اس کا آغاز تاخیر سے ہوا۔ اردو وکی پیڈیا کو رضا کار چلاتے ہیں۔ یہ سائٹ ایک وکی ہے، یعنی کوئی بھی کسی بھی مضمون میں صفحے کو ترمیم کر سکتا ہے۔ وکی پیڈیا میں ہر قسم کے مختلف مضامین پر معلومات موجود ہیں۔ اس وقت اگرچہ اردو وکی پیڈیا پر ایک لاکھ سے زیادہ مضامین موجود ہیں لیکن ان میں سے اکثریت کا معیار وکی پیڈیا پر دوسری عالمی زبانوں میں موجود مضامین کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ اس لیے آپ اپنے فارغ وقت میں یہاں پر موجود مضامین کی نوک پلک درست کرنے کے ساتھ اردو مواد میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ آپ کے وقت کا بہترین مصرف ہوگا اور ساتھ ہی مختلف موضوعات پر آپ کی اپنی معلومات میں بھی بے پناہ اضافے کا باعث بنے گا۔

اس کے علاوہ اردو شعر وادب کی ترقی وترویج میں فیس بک، ٹویٹر اور سوشل نیٹ ورک سائٹس، فارمس اور بلاگس نے اردو شعراو ادبا کو روبرو کر دیا ہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی نے دنیا کو ایک عالمی گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے۔

■

Irfan Rasheed
Research Scholar, Dept of Urdu
Univerisity of Kashmir (J&K)

گرافکس (Graphics)

چارٹ گیلری (Chart Gallery)

ڈاٹا کی وضاحت یا موازنہ کے لیے چارٹ کام میں آتے ہیں۔ ایم ایس- ورڈ میں چارٹ گیلری سے آپ کو پہلے سے بنے چارٹ بھی مل سکتے ہیں۔

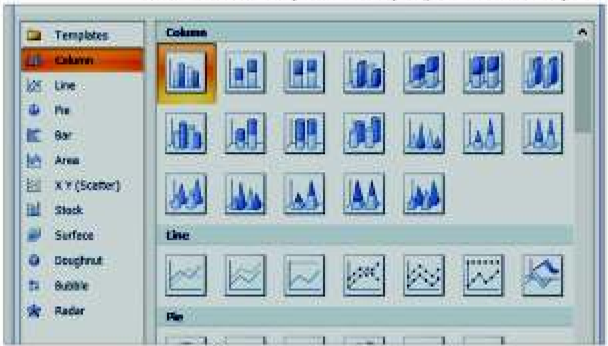

تصویر WD-5.13: اسمارٹ چارٹ گیلری

Insert ٹیب کے Illustrations حصہ میں Chart بٹن کلک کرنے سے Insert Chart ڈائیلاگ باکس کھلتا ہے، جو Choose a Smart Art Graphic ڈائیلاگ باکس کی طرح ہوتا ہے۔ اس میں بھی بائیں طرف چارٹ کی قسمیں اور دائیں طرف چارٹ دیے ہوتے ہیں۔ آپ اپنے من پسند چارٹ پر کلک کر کے OK بٹن پر کلک کر دیں۔ چنا ہوا چارٹ آپ کی دستاویز میں کرسر کی جگہ جڑ جائے گا۔

دیگر تصویروں کی طرح چارٹ جڑنے کے لیے بھی ربن میں تین نئے ٹیب جڑتے ہیں، جن کے ذریعے آپ اپنے چارٹ کو ایڈٹ کر کے اسے من چاہی شکل دے سکتے ہیں۔ یہ تین ٹیب Chart Tools کے تحت ڈیزائن (design)، لے آؤٹ (Layout) اور فارمیٹ (Format) کے نام سے جڑتے ہیں، جن کے حصوں اور بٹنوں کا استعمال Picture Tools اور Smart Art Tools کے ٹیبوں سے ملتا جلتا ہے۔ انھیں آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔

شکلیں بنانا (Drawing Shapes)

اب تک ہم نے سیکھا ہے کہ ہم ایم ایس- ورڈ کی دستاویز میں کس طرح بنی ہوئی تصویر جوڑ سکتے ہیں۔ اب ہم دستاویز میں خود تصویر بنانا سیکھیں گے۔ اس کے لیے سب سے پہلے Insert ٹیب کے Illustrations حصہ میں Shapes بٹن پر کلک کیجیے۔ اس سے ایک ڈراپ ڈاؤن لسٹ (تصویر WD-5.14) کھلے گی، جس میں متعدد آپشنز کے نیچے ان سے متعلق شکلیں دی ہوئی ہیں۔ آپ اپنی پسندیدہ شکل پر کلک کریں۔ پھر اپنے ماؤس پوائنٹر کو کھینچتے ہوئے وہ شکل بنا لیجیے۔

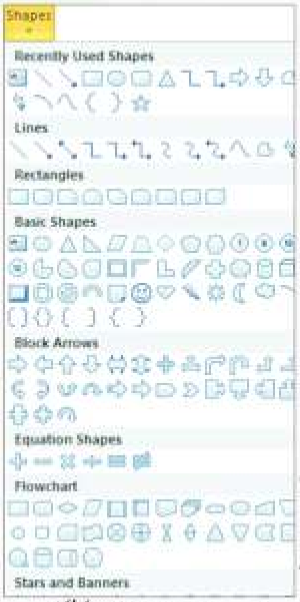

تصویر WD-5.14: بنی ہوئی شکلیں

مثال کے طور پر، کوئی لکیر (Line) بنانے کے لیے Lines آپشن کے تحت من چاہی لائن پر کلک کیجیے، پھر ماؤس بٹن کو دبائے رکھ کر ماؤس پوائنٹر کو یک نقطہ سے دوسرے نقطہ تک کھینچیے۔ اس سے ان دونوں نقطوں کے درمیان اسی ناپ کی لکیر بن جائے گی۔ اسی طرح آپ دستاویز میں متعدد شکلیں، جیسے مستطیل، دائرہ، کثیر الاضلاع وغیرہ بنا سکتے ہیں۔

تصویر WD-5.15 میں کچھ شکلیں یا آبجیکٹ دکھائے گئے ہیں، جنھیں اوپر بتائے گئے طریقوں سے بنایا گیا ہے۔ اسی طرح کچھ دوسرے ٹولس کا استعمال کر کے آپ دیگر شکلیں بنا سکتے ہیں۔

تصویر WD-5.15: ڈرائنگ ٹولس کے ذریعے بنائی گئی شکلیں

آبجیکٹس کو چننا (Selecting Objects)

کسی شکل پر کوئی کام کرنے، جیسے سرکانے، سائز بدلنے، ہٹانے، رنگ بھرنے وغیرہ کے لیے سب سے پہلے اس شکل کو چنا جاتا ہے۔ آگے کا کام چنی ہوئی شکل یا شکلوں پر ہی کیا جاتا ہے۔ کوئی شکل یا سمپل لائن چننے کے لیے اس پر صرف کلک کیجیے۔ اس سے اس شکل کے چاروں طرف آٹھ چوکور نقطے بن جائیں گے، جنھیں ہینڈل (Handles) کہا جاتا ہے۔ ان میں سے چار ہینڈل چاروں کونوں پر ہوتے ہیں، اور

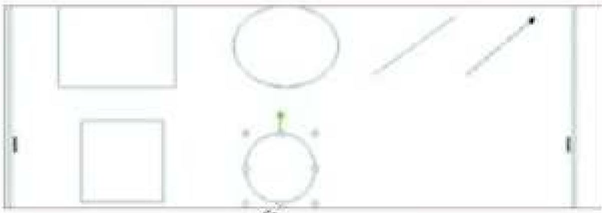

تصویر WD-5.16: آبجیکٹس چننا

بقیہ چار ہینڈل چاروں بارڈر لائنوں کے درمیان میں ہوتے ہیں، جیسا کہ تصویر WD-5.16 میں دکھایا گیا ہے۔ سمپل لائن یا تیر چننے پر صرف دو ہینڈل اس کے دونوں کناروں پر ہوتے ہیں۔

آپ ایک ساتھ کئی تصویریں بھی چن سکتے ہیں۔ اس کے لیے پہلے شکل کو چن لیجیے۔ اب کنٹرول کو دبا کر دوسری شکل پر کلک کیجیے۔ اس سے وہ بھی چن لی جائے گی۔ کنٹرول کے ساتھ کلک کرتے ہوئے آپ کتنی بھی شکلیں یا آبجیکٹس چن سکتے ہیں۔ آگے آپ جو بھی کام کریں گے، وہ بھی چنے ہوئے آبجیکٹ پر لاگو ہوں گے۔

آبجیکٹ کے سلیکشن کو رد کرنے کے لیے ماؤس پوائنٹر کو کسی خالی جگہ پر یا چنے ہوئے آبجیکٹ سے باہر لے جا کر کلک کیجیے۔

آبجیکٹ کو سرکانا (Moving Objects)

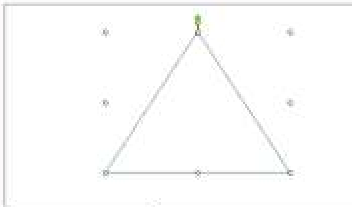

تصویر WD-5.17: آبجیکٹس کو سرکانا

جس آبجیکٹ کو آپ سرکانا چاہتے ہیں، پہلے اوپر بتائے گئے طریقے سے اسے یا انھیں چن لیجیے۔ اب ماؤس پوائنٹر کو کسی چنے ہوئے آبجیکٹ پر لے جائیے، لیکن ہینڈلوں سے دور رکھیے۔ اس وقت ماؤس پوائنٹر کی شکل بدل جائے گی اور وہ چار سروں والے تیر جیسا ہو جائے گا۔ اب ماؤس بٹن کو دبا کر پکڑ لیجیے اور اسے دبائے رکھ کر سرکائیے۔ اس سے سبھی چنی ہوئی چیزوں کی ایک ہلکی بارڈر لائن پوائنٹر کے ساتھ ساتھ چلے گی، جیسا کہ تصویر WD-5.17 میں دکھایا گیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آبجیکٹ کہاں پر پہنچ گئے ہیں۔ انھیں پسندیدہ جگہ پر لے جا کر ماؤس بٹن کو چھوڑ دیجیے۔ ایسا کرتے ہی آپ دیکھیں گے کہ سبھی منتخب کیے گئے آبجیکٹ نئی جگہ پر آ گئے ہیں۔

آبجیکٹ کا سائز بدلنا (Resizing Objects)

کسی آبجیکٹ کا سائز بدلنے کے لیے اسے چننے پر نظر آنے والے ہینڈلوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے ہی ماؤس پوائنٹر کسی ہینڈل پر آتا ہے وہ دو سروالے تیر کے نشان میں بدل جاتا ہے۔

اگر آپ منتخب کیے ہوئے آبجیکٹ یا شکل کا سائز تناسب میں (Proportionally) بدلنا چاہتے ہیں، تو کسی کونے والے ہینڈل کو ماؤس پوائنٹر سے پکڑ کر باہر یا اندر کی طرف ترچھا کھینچیے۔ متناسب سائز بدلنے کا مطلب ہے کہ آبجیکٹ کی لمبائی اور چوڑائی کا تناسب (Proportion) وہی رہتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں، اگر لمبائی دوگنی ہوگی، تو چوڑائی بھی دوگنی ہو جائے گی۔ اس طرح آبجیکٹ کے مطلوبہ سائز کے ہو جانے پر ماؤس پوائنٹر کو چھوڑ دیجیے۔

اگر آپ سائز تناسب کے حساب سے نہیں بدلنا چاہتے، تو کناروں (Sides) والے ہینڈلوں میں سے کسی کو اسی طرح کھینچیے۔ اس سے جس سائڈ کے ہینڈل کو آپ کھینچیں گے، اس کے مطابق سائز بدل جائے گا۔

اگر آپ آبجیکٹ کا سائز بدلے بغیر صرف اس کے چاروں طرف کی خالی جگہ بڑھانا چاہتے ہیں، تو شفٹ کے ساتھ کسی ہینڈل کو ماؤس پوائنٹر سے پکڑ کر آبجیکٹ سے دور لے جائیے۔

آبجیکٹس کی نقل کرنا (Duplicating Objects)

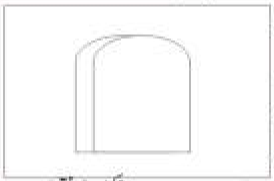

تصویر WD-5.18: آبجیکٹس کی نقل کرنا

اگر آپ کسی شکل، آبجیکٹ یا تصویر کی نقل کرنا چاہتے ہیں، تو پہلے اسے چن لیجیے۔ اب Home ٹیب کے Clipboard حصہ میں مینو میں پہلے 'Copy' پھر 'Paste' ہدایت دیجیے۔ اس سے اسی جگہ پر یا اس کے نزدیک (جہاں کرسر ہوگا) اس آبجیکٹ کی ویسی ہی نقل تصویر WD-5.18 کی طرح بن جائے گی۔ اس نقل کو آپ کہیں بھی لے جا کر لگا سکتے ہیں۔

آبجیکٹس کو ہٹانا (Deleting Objects)

کسی آبجیکٹ یا آبجیکٹس کو ہٹانے کے لیے انھیں چن کر Backspace یا Delete کنجی کو دبائیے یا 'Cut' ہدایت دیجیے۔

گروپ بنانا اور توڑنا (Grouping and Ungrouping)

کئی بار آپ چھوٹی چھوٹی شکلوں یا اجزا کو ملا کر ایک تصویر بناتے ہیں۔ تب آپ چاہتے ہیں کہ اس پوری تصویر کو ایک ہی آبجیکٹ مانا جائے، تاکہ اسے سرکانے، سائز بدلنے، نقل کرنے وغیرہ میں آسانی رہے۔ یہ کام کرنے کے لیے سب سے پہلے ان سبھی اجزا کو کنٹرول دبا کر ایک ایک کرکے چن لیجیے۔ کوئی بھی شکل چھوٹنی نہیں چاہیے۔ سب کو چن لینے کے بعد کسی ایک شکل پر ماؤس کا دایاں بٹن کلک کیجیے اور اس میں Grouping کلک کرکے 'Group' ہدایت دیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ سبھی اجزا پر الگ الگ لگے ہوئے ہینڈل غائب ہو گئے ہیں اور ان سب کے چاروں طرف صرف آٹھ ہینڈل رہ گئے ہیں، جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسے ایک آبجیکٹ مانا جا رہا ہے۔ اب آپ اسے چن کر جو بھی کام کریں گے وہ پورے آبجیکٹ پر کیا جائے گا۔

اگر آپ کسی آبجیکٹ، جو 'Group' ہدایت کے ذریعے بنی ہو، پھر سے الگ الگ اجزا میں توڑنا چاہتے ہیں، تو اوپر بتائے گئے طریقے سے Grouping کلک کرکے 'Ungroup' ہدایت دیجیے۔ اس سے بھی آبجیکٹ الگ الگ ہو جائیں گے اور ان کے چاروں طرف الگ الگ ہینڈل بن جائیں گے۔

آبجیکٹس کو گھمانا (Rotating Objects)

تصویر WD-5.19: آبجیکٹس کو گھمانا

کسی آبجیکٹ کو گھمانے کے لیے اسے چن کر اس کے سب سے اوپر کے ہینڈل پر دیے گئے ہرے نقطہ پر کلک کیجیے۔ اب اس نقطہ کو ماؤس پوائنٹر کے ذریعے پکڑ کر گولائی میں گھمائیے۔ ایسا کرنے پر اس آبجیکٹ کی بارڈر لائن جو ٹوٹی لائنوں سے بنی ہوتی ہے، تصویر WD-5.19 کی طرح، ساتھ ساتھ گھومتی ہوئی دکھائی دے گی۔ مطلوبہ سمت میں گھمانے کے بعد ماؤس بٹن کو چھوڑ دیجیے۔ ایسا کرنے پر آبجیکٹ نئی سمت میں قائم ہو جائے گا۔

ڈرائنگ ٹولس کا فارمیٹ ٹیب (Format Tab of Drawing Tools)

ایم ایس-ورڈ میں کوئی بھی شکل بنانے پر ربن میں Drawing Tools عنوان کے تحت فارمیٹ ٹیب (Format Tab) جڑ جاتا ہے، جس سے آپ شکل میں تبدیلی

تصویرWD-5.20: ڈرائنگ ٹولس کے تحت فارمیٹ ٹیب

لاسکتے ہیں۔ اس ٹیب کے زیادہ تر بٹن Picture، Tools، Clipboard Tools، Smart Art Tools اور Chart Tools کے بٹنوں سے ملتے جلتے ہیں۔ اس کے Arrange اور Size حصے Pictures Tools کے Arrange اور Size حصے جیسے ہوتے ہی ہیں، جن کے بارے میں ہم آپ کو بتا چکے ہیں۔

Shadow Effect اور 3-D Effect بٹنوں کی مدد سے آپ تصویر میں بالترتیب سایہ اور 3-D اثر ڈال سکتے ہیں۔

Insert Shapes لسٹ باکس کے ذریعے آپ چنی ہوئی شکل کے اندر ایک دوسری شکل جوڑ سکتے ہیں اسی حصہ کے تحت Edit Shape بٹن کی مدد سے آپ شکل کا روپ بدل سکتے ہیں، اور Edit Text بٹن کے ذریعے آپ شکل کو ٹیکسٹ میں بدل سکتے ہیں، جس کے بارے میں ہم آپ کو آگے بتائیں۔

شکل کی بناوٹ (Shape Style)

Drawing Tools کے فارمیٹ ٹیب کا سب سے زیادہ کارگر حصہ Shape Style ہے اس کا استعمال درج ذیل ہے:

تصویرWD-5.21: اسٹائل گیلری

(i) **شکل کا اسٹائل سیٹ کرنا (Setting Style of the Shapes):** Shape Styles کے لسٹ باکس (تصویر WD-5.21) میں الگ الگ قسم کے رنگوں باڈروں اور خاص اثر والے اسٹائل دیے گئے ہیں، ان میں سے آپ شکل کے لیے کوئی بھی اسٹائل چن کر اسے زیادہ دلکش بنا سکتے ہیں۔

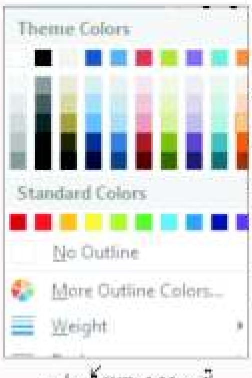

تصویرWD-5.22: کلر پیلیٹ

(ii) **شکلوں کا رنگ بدلنا (Changing Colour of Drawings):** آپ کسی بھی شکل، لکیر، یا تیر کو مختلف رنگوں میں بنا سکتے ہیں یا ان کا رنگ بدل سکتے ہیں۔ اس کے لیے اس شکل یا لکیر کو چن کر Drawing Tools کے فارمیٹ ٹیب کے Shape Styles حصہ میں بٹن کے تیر کو کلک کیجیے۔ اس سے ایک کلر پیلیٹ تصویر WD-5.22 کی طرح کھل جائے گا۔

اس کلر پیلیٹ میں کئی رنگ دیے ہوتے ہیں۔ آپ ان میں سے کسی بھی رنگ کو کلک کیجیے۔ ایسا کرتے ہی آپ کے ذریعے چنی گئی شکل، لکیر، تیر وغیرہ اسی رنگ میں بن جائیں گے۔ ایک ساتھ کئی آبجیکٹ کو چن کر آپ ان سب کو ایک ہی رنگ میں ایک بار میں بنا سکتے ہیں۔

اگر آپ کلر پیلیٹ میں دکھائے گئے رنگوں سے مطمئن نہ ہوں اور رنگوں میں ابعاد چاہتے ہوں، تو کلر پیلیٹ کے 'More Outline Colors' بٹن کو کلک کیجیے، جس سے آپ کی اسکرین پر تصویر WD-5.23 کی طرح 'Colors' کا ڈائیلاگ باکس دیا جائے گا۔

تصویرWD-5.23: کلرس کا ڈائیلاگ باکس

آپ اس ڈائیلاگ باکس کی اسٹینڈرڈ ٹیب شیٹ میں دکھائے گئے رنگوں میں سے کسی کا بھی انتخاب کر سکتے ہیں۔ کلک کر کے رنگ چن کر 'OK' بٹن کو پیلیٹ کے Weight، Dashes اور Arrows بٹنوں سے شکل کی بالترتیب موٹائی، ڈیش نما بارڈر اور تیر کا اسٹائل (صرف لکیروں کے لیے) سیٹ کر سکتے ہیں۔ Pattern بٹن پر کلک کرنے سے Patterned Line ڈائیلاگ باکس کھلتا ہے، جس سے آپ بارڈر لائن کا دلکش پیٹرن سیٹ کر سکتے ہیں۔

تصویرWD-5.24 Fill Effect ڈائیلاگ باکس

(iii) **شکلوں میں رنگ بھرنا (Filling Colours in Drawings):** آپ ایسی کسی بھی شکل میں، جو چاروں طرف سے بند ہو، اپنی پسند کا رنگ بھر سکتے ہیں۔ اس کے لیے اس شکل یا شکلوں کو چن کر Drawing کے فارمیٹ ٹیب کے Shape Styles حصہ میں Shape Fill بٹن کے تیر کو کلک کیا جاتا ہے، جس سے کلر پیلیٹ کھل جاتا ہے۔ بقیہ کام شکلوں کے رنگ بدلنے کی طرح ہی ہے۔

اتنا ہی نہیں، آپ چنی ہوئی شکل میں کوئی تصویر، شیڈ یا ڈھلان (Gradient)، دلکش ٹیکسچر (Texture) یا پیٹرن بھی بھر سکتے ہیں۔ Patern پر کلک کرنے سے Fill Effects ڈائیلاگ باکس (تصویر WD-5.24) کھلتا ہے، جس کے ذریعے آپ گریڈینٹ، ٹیکسچر، پیٹرن اور تصویر خاص اثر سمیت شکل میں بھر سکتے ہیں۔

(iv) **شکل بدلنا (Changing Shape):** آپ شکل کے رنگ، پیٹرن اور دیگر اثر بنائے رکھتے ہوئے اس کی باہری بناوٹ بدل سکتے ہیں۔ مان لیجیے، آپ نے ایک دائرہ میں نیلا رنگ بھرا ہے۔ اب آپ نیلے رنگ کو بنائے رکھتے ہوئے شکل کو دائرے سے مستطیل میں بدلنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے دستاویز میں شکل کو چن کر Drawing Tools کے فارمیٹ ٹیب میں Shapes Styles حصہ کے Change Shape بٹن کے تیر کو کلک کریں اور کھلنے والے مینو (تصویر WD-5.25) سے اپنی من پسند شکل کو چن لیں۔ شکل کی باہری بناوٹ فوراً بدل جائے گی۔ (جاری)

تصویرWD-5.25: الگ الگ شکلیں

به شکریه: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007) سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

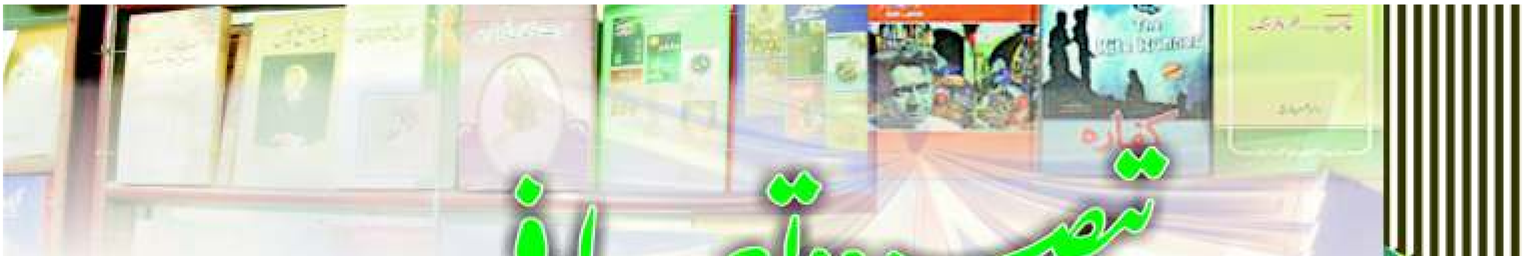

تبصرہ و تعارف

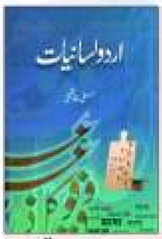

اردو لسانیات

مصنف: علی رفاد فتیحی
صفحات: 252، قیمت: 110، روپے، طباعت ثانی: 2018
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 25
مبصر: مومنہ خاتون، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی

اردو لسانیات کے حوالے سے علی رفاد فتیحی کی کتاب 'اردو لسانیات' لسانیاتی اور اسلوبیاتی نقطۂ نظر سے اہم ہے جسے قومی اردو کونسل نے 2018 میں شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں کل تیرہ ابواب ہیں جو اردو زبان اور اس کی لسانی تشکیل کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ پہلے باب سے ساتویں باب تک مصنف نے اردو زبان کے نحوی، صرفی اور معنیاتی متعلقات پر تحقیقی انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ پہلا باب جو 'علم صوتیات' پر مشتمل ہے اس میں مصنف نے علم صوتیات اور صوتیات کی مختلف اصطلاحوں کی تعریف کرتے ہوئے اس کے جتنے انسلاکات ہو سکتے ہیں ان کو مدلل انداز میں پیش کرنے کی کامیاب سعی کی ہے اور صوتیات کی مختلف شاخوں کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی اعضائے تکلم اور مخارج کا بھی تفصیل سے احاطہ کیا ہے۔ دوسرا باب 'اصول فونیمیات' ہے۔ فونیمیات کی اصطلاح لسانیات کی اس شاخ کے لیے استعمال ہوتی ہے جو کسی زبان خاص کے صوتی نظام کا مطالعہ پیش کرتی ہے۔ اس باب میں فونیمیات کا تفصیلی تعارف پیش کرکے اس کو مثالوں کے ساتھ بہت ہی جامع اور معروضی انداز میں بیان کیا ہے جسے پڑھتے ہوئے تفہیم کا مسئلہ درپیش نہیں ہوتا ہے۔ ساتھ ہی فونیمیات میں جن اصولوں اور تکنیکوں سے بحث ہوتی ہے اور جن کے اطلاق سے کسی زبان میں استعمال ہونے والی امتیازی اصوات یا صوتیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے اس پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے فونیمیات کے اصولوں کی روشنی میں سمجھانے کی بہترین کوشش کی ہے۔ تیسرا باب 'اردو فونیمیات' ہے۔ اس میں اردو کے تقریباً 37 مصمتی فونیم کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ اردو میں عربی، فارسی، انگریزی اور دوسری زبانوں سے مستعار آوازوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ چوتھا باب 'اردو حروف تہجی' کے عنوان سے ہے۔ اس میں مصنف نے اردو حروف تہجی کی مختلف شکلوں اور آوازوں اور یکسانیت کی بنیاد پر متعدد گروہوں میں تقسیم کرکے اس کو تفصیل سے بیان کرتے ہوئے اردو مصوتوں کی فونیمی ہجائی مطابقت پر بھرپور انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ پانچواں باب 'اردو صرف' اور چھٹا باب 'اردو نحو' ہے۔ لسانیات میں علم صرف اور علم نحو کا شعبہ انتہائی اہم شعبہ ہے۔ علم صرف جہاں لفظ کی ساخت کا مطالعہ پیش کرتا ہے وہیں علم نحو جملے کی ساخت کو موضوع بناتا ہے۔ ان دونوں کے بغیر لسانیات کی تفہیم نامکمل تصور کی جاتی ہے۔ مصنف نے اردو صرف کے تمام تر پہلوؤں کا مکمل احاطہ کیا ہے۔ ساتواں باب 'اردو معنیات' ہے۔ جس کے بارے میں مصنف نے لکھا ہے کہ معنیات لسانیات کا ایک اہم نواحی شعبہ ہے۔ معنیات کے نقطۂ نظر سے سلسلۂ کلام کو جن اکائیوں میں بانٹا جاتا ہے وہ 'لفظ' ہے۔ یعنی معنیات لفظ کا مطالعہ پیش کرتا ہے۔ معنیات لفظ کا مطالعہ کن طریقوں سے کرتا ہے مصنف نے اس کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آٹھواں باب 'ہندوستان کا لسانی پس منظر' ہے۔ اس میں مصنف نے ہندوستان کے لسانی پس منظر کا جائزہ لیتے ہوئے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ یہاں چار لسانی خاندانوں کی زبانیں بولی جاتی ہیں جن میں ہند آریائی خاندان کی زبانوں کا تناسب 74.13 فیصد ہے۔ دراوڑی خاندان کی زبانوں کا تناسب 24.07 فی صد ہے۔ آسٹرک خاندان کی زبانوں کا تناسب 1.20 فی صد ہے اور تبتی برمی خاندان کی زبانوں کا تناسب 0.60 فیصد ہے۔ حالانکہ ہندوستان میں کوہ ہمالہ کی کچھ زبانیں ایسی ہیں جن کی درجہ بندی اب تک نہیں کی گئی ہے ایسی زبانیں unclassified زبانیں کہلاتی ہیں۔ نواں باب 'ہندوستان کی لسانی تہذیبیں' ہے۔ اس میں قدیم دراویدی تہذیب جس کی ابتدا موہن جوداڑو، سندھ اور پنجاب کی قبل آریائی تہذیب اور قدیم ادب سے ہوتی ہے، اس کو بیان کرتے ہوئے آسٹرک تہذیب، تبتی برمی تہذیب، ہند آریائی تہذیب، آریاؤں کی آمد، ہند آریائی بولیاں وغیرہ کا اجمالی خاکہ پیش کیا ہے جس سے ہندوستان کی لسانی تہذیب کی تکثیریت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ دسواں باب 'ہند آریائی زبان کی لسانی خصوصیات' پر مشتمل ہے۔ اس میں قدیم ہند آریائی دور کا جائزہ لیتے ہوئے اس عہد میں ویدی ادبی زبان اور عوامی بولیوں کی نشو ونما کا اجمالی خاکہ پیش کرتے ہوئے ادیچیہ علاقے کی زبان، پراچیہ علاقے کی زبان، مدھیہ دیشہ کی زبان کی صوتی و لسانی خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ وسط ہند آریائی دور کی زبانوں اور اس کی لسانی خصوصیات کو پیش کرتے ہوئے جدید ہند آریائی دور کی لسانی خصوصیات کا تفصیل سے احاطہ کیا گیا ہے۔ گیارہواں باب 'زبان اردو' ہے۔ اس میں اردو کی قانونی حیثیت اور اس کی ابتدا و ارتقا پر تحقیقی انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب میں شامل بارہواں باب 'اردو کے آغاز و ارتقا کے نظریے: ایک تنقیدی جائزہ' ہے۔ اس میں مصنف نے اردو کے آغاز و ارتقا کا سامی نظریہ، دکن میں اردو، سندھ میں اردو، پنجاب میں اردو، پالی سے اردو، پروفیسر مسعود حسین خاں کا نظریہ، اردو اور کھڑی بولی وغیرہ کی روشنی میں اردو کے آغاز کے سلسلے میں مذکورہ نظریات کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ تیرہواں اور آخری باب 'دکنی اردو' ہے۔ اس میں دکنی اردو کی لسانی و صوتی خصوصیات کو پیش کرتے ہوئے دکنی میں ہکاریت، طویل مصوتے، دکنی کی صرفی و نحوی خصوصیات، دکن کی لفظیات، رسم الخط اور اوزان و بحور کو واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ لسانیات کے اصولوں اور اس کے طریقۂ کار کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ اہم ہے۔ کم قیمت پر قومی کونسل نے لسانیات پر مبنی اس اہم کتاب کو شائع کرکے طلبا و اساتذہ دونوں کی مشکلیں آسان کردی ہیں۔ امید ہے علمی حلقوں میں اس کی مزید پزیرائی ہوگی۔

تحقیق و تنقید

شبلی خود نوشتوں میں

مصنف و ناشر: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
صفحات: 312، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: نومبر: 2018
ناشر: ادبی دائرہ، اعظم گڑھ، یوپی
مبصر: رضاء الرحمٰن عاکف سنبھلی

برصغیر ہند و پاک کے عظیم دانشوروں کی اگر کوئی فہرست مرتب کی جائے تو اس میں علامہ شبلی کا نام سرفہرست بھی نہ ہو تو کم سے کم نمایاں شخصیات میں ضرور آئے گا۔ آپ ایک عظیم مفکر، دانشور، قلم کار اور سوانح و سیرت نگار کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں اور اپنے ذریعے انجام دیے گئے عظیم کارناموں کی بنیاد پر ہمیشہ ہی یاد کیے جاتے رہیں گے۔ خوشی کی بات ہے کہ ہمارے اہل قلم نے ان پر کام کیا۔ اور ان کے کارناموں کو اجاگر کرنے اور انھیں منظر عام پر لا کر ان کو ان کا جائز مقام دلانے کی قابل ستائش کوشش کی ہے۔ ایسے ہی قلم کاروں میں ایک نام ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کا ہے۔ جنھوں نے ممدوح محترم پر قابل ذکر تحقیقی کام کر کے ان کے کارناموں کو مختلف جہتوں اور حیثیتوں سے شائقین تک پہنچایا ہے۔ علامہ شبلی پر موصوف کا اتنا زبردست کام ہے کہ اس کی بنیاد پر بجا طور سے آپ کو ماہر شبلیات بھی کہا جا سکتا ہے۔ زیر نظر کتاب 'شبلی خودنوشتوں میں' بھی اس کا ایک حصہ ہے۔ جس کا تعارف نذر قارئین ہے۔

کتاب کا آغاز پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کے پیش لفظ سے ہوتا ہے۔ جس میں وہ الیاس صاحب کی شبلی شناسی کا اعتراف کچھ اس طرح کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

''شبلی پر بہت لکھا گیا۔ لیکن سوانح کے نقطۂ نظر اور علمی مباحث کے نقطۂ نظر سے بھی بہت چھان بین ابھی باقی ہے۔ ہمارے دوست محمد الیاس الاعظمی نے پوری زندگی مطالعۂ شبلی میں گذار دی ہے۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ آپ شبلی اور الیاس الاعظمی لازم و ملزوم ہو گئے ہیں۔''

اس کے بعد مصنف کے قلم سے لکھا ہوا چودہ صفحات پر مشتمل ایک مفصل و مکمل دیباچہ ہے۔ جس میں کتاب کا مکمل تعارف ہونے کے ساتھ علامہ شبلی کے تعلق سے بھی بڑی اہم معلومات فراہم کر دی گئی ہے۔ اور شبلی پر لکھی ہوئی اپنی کتابوں کا بھی تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد کتاب کے مضامین کا آغاز ہوتا ہے۔

یہ کتاب بہت سی کتابوں کا مجموعہ ہے۔ یعنی ایک طرح سے گنج ہائے گراں مایہ ہے۔ جس کے اندر مصنف نے شبلی کے حوالے سے بہت ہی دلچسپ اور معنی خیز مواد جمع کر دیا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ بہت ہی اہم و نامور حضرات کی کتابوں (خودنوشتوں) میں موجود ذکر شبلی کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس فہرست سے لگایا جا سکتا ہے۔ کتاب میں مذکور ان 25 کتابوں اور ان کے مصنفین کے نام اس طرح ہیں۔

اختر اقبال: نواب سلطان جہاں بیگم، آپ بیتی: میر ولایت حسین، یاد ایام: عبدالرزاق کانپوری، تذکرہ طاہر: نواب سید محمد علی حسن خاں، میری کہانی میری زبانی: سید ہمایوں مرزا، مشاہدات و تاثرات: شیخ محمد عبداللہ پاپا میاں، آپ بیتی: خواجہ حسن نظامی، میری زندگی: مولانا محمد علی جوہر، اعمال نامہ: سر رضا علی، تذکرہ مولانا ابوالکلام آزاد، آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی: مولانا ابوالکلام آزاد، میرا افسانہ: ملا واحدی، سرگذشت: مولانا عبدالباری ندوی، مولانا ضیاء الحسن علوی، آپ بیتی: مولانا عبدالماجد دریابادی، آشفتہ بیانی میری: رشید احمد صدیقی، میں اور میری ادبی صلاحیت: مرزا احسان احمد، خاطرات: ظفر حسن ایبک، غبار کارواں: مولانا سعید احمد اکبرآبادی، کاروان زندگی: مولانا ابوالحسن علی ندوی، نقوش زندگی: مولانا مجیب اللہ ندوی، سرگزشت ایام: حافظ نذر احمد، دھوپ چھاؤں: پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شیروانی، حکایت ہستی: مولانا اعجاز احمد اعظمی، اہل علم کی محسن کتابیں: مولانا عمران خاں ندوی۔

ان کتابوں کی فہرست دیکھنے سے ہی آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ان میں اردو کے کس قدر عظیم المرتبت اور قدر آور اہل قلم کے رشحات سمو دیے گئے ہیں۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ ذکر شبلی کا اور اہل علم و دانش کی اہم کتابوں سے لیا گیا، مواد۔ جس کو منتخب کرنے والے ڈاکٹر الیاس جیسے معروف اسکالر ہوں تو یہ کتاب کیوں نہ علم و دانش کا عظیم منبع و معدن اور شبلی شناسی کا عمدہ ماخذ تسلیم کر لیا جائے۔

کتاب کے مشمولات کی جو فہرست سطور بالا میں نقل کر دی گئی ہے۔ اس سے اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ کس قدر اہم اور قدر آور مصنفین کی تحریروں کے اقتباسات یعنی کتنے لعل و جواہر اس کتاب میں یکجا کر دیے گئے ہیں۔

اس کتاب میں علمی بحثیں بھی ہیں۔ عالمانہ مباحثے بھی۔ ادبی نیرنگیاں بھی ہیں اور تنقیدی رموز بھی۔ اہل علم و قلم میں باہمی مہر و محبت کے واقعات ہیں۔ تو ان کے اندر معاصرانہ چشمک بھی۔ ایک دوسرے کے کام پر تنقید و تحقیق کے ساتھ ہی بہتان طرازی اور الزام تراشی بھی۔ اس طرح اس کتاب میں بہت سے مناظر دیکھنے کو ملیں گے۔ جنھیں علمی و تحقیقی جھلکیاں ہی کہا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر علامہ شبلی کے حوالے سے تو قیمتی نوادرات سے یہ کتاب بھری پڑی ہے۔

شبلی کے تعلق سے لکھی گئی یوں تو الیاس صاحب کی ہر ایک کتاب ہی داد و تحسین اور تعریف و توصیف کی حقدار ہے، مگر زیر نظر کتاب اس لیے بھی زیادہ وقعت کی حامل ہے کہ اس میں جن حضرات کی خودنوشتوں میں شبلی کا ذکر تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ سبھی اپنے اپنے مقام و مرتبہ پر سند کا درجہ رکھتے ہیں۔

مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب شبلی شناسی کے ساتھ ہی دیگر اور شخصیات کے تعارف، ان کی خودنوشت اور مولانا شبلی سے ان کے تعلقات کو جس طرح سے واضح اور روشن کرتی ہے، ایسا دوسری کسی اور کتاب میں کم ہی دیکھنے کو ملے گا۔ اس لیے اپنے موضوع پر اس کو منفرد کہا جا سکتا ہے۔

غرض یہ کہ کتاب ہر طرح سے معتبر اور قابل مطالعہ ہے۔ اہل ذوق حضرات اس کے مطالعے سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اپنے علمی ذوق کی تسکین کے ساتھ ہی علم و ادب کے جواہر بھی سمیٹ سکتے ہیں۔

ادب بنگالہ

مصنف: ڈاکٹر نوشاد مومن
صفحات: 136، قیمت: 90 روپے
ناشر: مغربی بنگال اردو اکادمی
مبصر: پاکیزہ اختر، ریسرچ اسکالر، مانو، حیدرآباد، سرینگر کیمپس

زیر نظر کتاب 'ادب بنگالہ' ڈاکٹر نوشاد مومن کے ان مقالات و مضامین کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے وقتاً فوقتاً منعقد ہونے والی مختلف کانفرنسوں اور سمیناروں کے لیے لکھے۔ کتاب میں الگ الگ موضوعات پر کل پندرہ مضامین ہیں۔ پہلا مضمون 'بنگال

میں اردو صحافت ۔ مابعد آزادی' ہے۔ اس مضمون میں نوشاد مومن نے بنگال کے لوگوں کی ثقافتی، تعلیمی، سیاسی، سماجی اور انقلابی زندگی کو اجاگر کیا۔ انھوں نے آزادی کے بعد بنگال میں اردو صحافت پر بھی گفتگو کی ہے اور صحافت کے آغاز پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ آزادی کے بعد سے 2004 تک کے بنگال کے اخباروں میں نوشاد مومن آبشار، عکاس، آزاد ہند، اور اخبار مشرق کو خاص اہمیت دیتے نظر آتے ہیں۔

بنگال کے حوالے سے ان کا ایک اور مضمون 'بنگال کے اردو سفرناموں کی ادبی جہتیں' بھی اہمیت کا حامل ہے۔ اس مضمون میں وہ اصل موضوع پر روشنی ڈالنے سے قبل متعلقہ موضوع کی تاریخ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اسی تناظر میں وہ پہلے سفرنامے پر بھرپور روشنی ڈالتے ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ سفرناموں کے متعلق کئی بنیادی باتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ بنگال کے اردو سفرناموں میں انھوں نے چراغ راہ گزر، یورپ کا سفرنامہ، مزید آوارگی اور چل چنبیلی باغ میں، کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ انھوں نے ان سفرناموں کے اسلوب، زبان و بیان، اصطلاحات اور جزئیات نگاری کے ساتھ قارئین کی دلچسپی سے متعلق دوسرے پہلوؤں پر بھی گفتگو کی ہے۔

'مغربی بنگال میں صحافتی قطعہ نگاری' میں نوشاد مومن نے سالک لکھنوی کو بنگال کا پہلا قطعہ نگار قرار دیا ہے، انھوں نے سید حرمت الاسلام کی خدمات کو نظر انداز کرنے پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ رئیس الدین مزیدی کے صحافتی قطعات کا حوالوں کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر نظام الدین نظام، اعزاز افضل، ڈاکٹر شبیر ابروی، حلیم صابر، شہود عالم آفاقی، انجم عظیم آبادی، ضمیر یوسف، اور ارم انصاری کے صحافتی قطعات کا جائزہ لیا ہے، اور ان کی ادبی خدمات کو حوالوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اگر ہم بنگال کی نعتیہ شاعری کی بات کریں، تو ضمیر یوسف کے نعتیہ شعری مجموعے 'نورلم یزل' کا ذکر بہت ضروری محسوس کرتے ہیں۔ اس مجموعے کی اہمیت کے پیش نظر نوشاد مومن نے مضمون 'نورلم یزل: ایک مطالعہ' لکھا۔ ضمیر یوسف کا یہ نعتیہ مجموعہ غزلیہ فارم میں ایک روح پرور پیشکش ہے۔ نوشاد مومن نے اس مضمون میں ضمیر یوسف کی نعتیہ شاعری کی خوبیوں کو مثالوں کے ساتھ درج کیا ہے۔

کتاب میں شامل مضامین میں 'ڈرامے کا فن اور آغا حشر۔ ایک اجمالی جائزہ' ڈرامے کے حوالے سے نوشاد مومن کا اہم مضمون ہے جس میں انھوں نے ڈرامے کے فن اور آغا حشر کی ڈراما نگاری کا اجمالی جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے ڈرامے کے فن پر روشنی ڈالتے ہوئے آغا حشر کو سب سے بڑا ڈراما نگار کہا ہے۔ نوشاد مومن نے آغا حشر کے ڈراموں میں پلاٹ، کردار نگاری، مکالمہ نگاری وغیرہ کا پہلو بہ پہلو جائزہ لیا ہے، اور انھیں ڈرامے کے فن کی کسوٹی پر گہرائی کے ساتھ پرکھا ہے۔

'اعزاز افضل: شخص اور عکس' میں نوشاد مومن نے اعزاز افضل کی شخصیت کا خاکہ کھینچا ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے جگہ جگہ ان کی شاعری کے نمونے پیش کیے ہیں۔ مضمون کے آخر میں ان کے قطعات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ 'علقمہ شبلی، بلند پرواز اور نئے جہات کا شاعر' میں نوشاد مومن نے علقمہ شبلی کے بچپن، ولادت، تعلیم، شاعری سے دلچسپی، ان کی شاعری کے نمونے، ان کی انفرادیت، غزلوں اور نظموں کے علاوہ ان کی رباعیات اور حمد و نعت وغیرہ پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ مضمون 'حاذق انصاری کی فکری کائنات' میں نوشاد مومن نے حاذق انصاری کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی فکر تیکھی اور زبان نہایت نکھری ہوئی ہے۔ ان کی پوری شاعری میں افسردگی اور عدم حوصلگی کا شائبہ دور دور تک دکھائی نہیں دیتا۔ پیش نظر کتاب میں منور رانا کی شاعری کی شخصیت اور شاعری پر بھی مضمون شامل اشاعت ہے جس کا عنوان ہے 'منور رانا کی قلندرانہ شخصیت اور شاعری'۔ اس مضمون میں نوشاد مومن نے منور رانا کی شخصیت اور شاعری کا جائزہ لیا ہے۔

'سہل ممتنع کا شاعر: شہود عالم آفاقی' نوشاد مومن کا شہود عالم آفاقی کی شاعری پر ایک عمدہ مضمون ہے۔ اس مضمون کے آخر میں نوشاد مومن نے سہل ممتنع کے اس شاعر کی شاعری کی سادگی اور سہل پسندی کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ 'عین رشید کا فکری ابال' آہنوی خیال' میں نوشاد مومن نے عین رشید کی زندگی کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ کتاب میں اور بھی کئی اہم مضامین ہیں۔ جیسے صلو چودھری کا 'گیتا گیان' جو نوشاد مومن کا الگ نوعیت کا مضمون ہے۔ اس مضمون میں فاضل مضمون نگار نے صلو چودھری کے گیان پر گفتگو کی ہے، صلو چودھری ایک ایسے گیانی ہیں جو کتابوں کے شوقین بھی ہیں اور کتابوں کے سنجیدہ قاری بھی۔ انھوں نے بھگوت گیتا کا منظوم اردو ترجمہ 'گیتا گیان' کے نام سے کیا، اس کتاب کو منظر عام پر لانے میں انھیں دس سال کا وقت لگا، انھوں نے بھگوت گیتا کا اردو ترجمہ کر کے نہ صرف اردو ادب کو ایک قیمتی ذخیرہ عطا کیا بلکہ ہندو مسلم اتحاد کی ایک اہم مثال بھی پیش کی۔ اس کے علاوہ اور کئی مضامین کتاب میں بڑے اہم ہیں۔ 'بزم احباب اور لالۂ صحرا' کتاب کا آخری مضمون ہے جس میں نوشاد مومن نے کلکتہ کے ادبی ادارہ بزم احباب کی مقصدیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لالۂ صحرا کا ذکر بھی کیا ہے۔

کتاب میں شامل مضامین کے مطالعے سے ہمیں بنگال کے مشہور ادیبوں کے ساتھ بعض نئے اور غیر معروف ادبا و شعرا کے بارے میں بھی تفصیلی جانکاری حاصل ہوجاتی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو بنگال کے ادبی تناظر میں یہ کتاب ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ کتاب بنگال میں اردو ادب کی موجودہ صورت حال کی ایک جھلک بھی پیش کرتی ہے۔

سمندر اوپر جھاگ اندر موتی

مرتب: عبدالحئی

صفحات: 236، قیمت: 225 روپے،

ناشر: کریٹو اسٹار پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: یوسف رامپوری، محلہ ٹنڈولہ ٹانڈہ، رامپور یوپی

بیرون ملک اردو کی ترویج و اشاعت اور خدمت کرنے والوں کی فہرست میں ایک اہم نام مقصود الٰہی شیخ کا ہے جو برطانیہ کی سرزمین پر اردو میں تخلیقی اور تنقیدی کام رہے ہیں۔ وہ شاعر بھی ہیں، افسانہ نگار اور ناول نگار بھی، مضامین بھی لکھتے ہیں اور پوپ کہانیاں بھی۔ ان کی شخصیت کی ہمہ گیریت کا اعتراف عہد حاضر کے بہت سے معروف ادبا و ناقدین نے کیا ہے۔ عذرا اصغر (کراچی) لکھتی ہیں: ''مقصود الٰہی شیخ کے بارے میں لکھتے ہوئے سوچنا پڑتا ہے کہ ان کی کون سی جہت پر بات کی جائے۔ وہ ہمہ صفت موصوف ہیں۔ بنیادی طور پر وہ افسانہ نگار ہیں، صحافی ہیں۔ دو عدد ادبی جرائد کی ادارت کامیابی کے ساتھ کر چکے ہیں۔'' ڈاکٹر عبدالحئی رقمطراز ہیں: ''وہ فکشن نگار، ادبی صحافی، شاعر اور نہ جانے کیا کیا کچھ ہیں۔'' گویا کہ مقصود الٰہی شیخ ایک ہمہ گیر ادیب ہیں۔ ان کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اردو میں پوپ کہانی کے موجد ہیں، جس کی مقبولیت بتدریج بڑھتی رہی ہے اور کئی تخلیق کار ان کا تتبع کر رہے ہیں۔ مقصود الٰہی شیخ کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ دیار غیر میں اردو کا چراغ روشن کر رہے ہیں۔ برطانیہ میں اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے ان کی کوششیں لائق ستائش ہیں۔ گلبن لکھنؤ کے ایڈیٹر سید ظفر ہاشمی نے لکھا ہے کہ ''مقصود الٰہی شیخ نے برطانیہ میں اردو زبان و ادب کا پرچم اس طرح لہرایا کہ پوری دنیا

ان کی معترف اور معتقد ہوگئی۔''ثروت اقبال (لندن) تو انھیں برطانیہ کا 'بابائے اردو' قرار دیتے ہیں۔ بقول ان کے:''برطانیہ میں اگر کسی کو بابائے اردو کا خطاب ملنا چاہیے تو وہ مقصود الٰہی شیخ ہیں۔''

اردو کی اتنی عظیم شخصیت کے مختلف النوع پہلوؤں، کارناموں اور تحریروں سے اردو کے طالب علموں کو عمومی طور پر روشناس کرانا وقت کا اہم تقاضا تھا، اس تقاضے کی تکمیل کی جانب ڈاکٹر عبدالحی نے قدم بڑھایا اور اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود جہاں تہاں بکھری ہوئی مقصود الٰہی شیخ کی تحریروں، کہانیوں کو جمع کیا۔ ساتھ ہی مقصود الٰہی کی شخصیت کے حوالے سے مشاہیر ادب کے تحریری شکل میں وقتاً فوقتاً پیش کیے گئے خیالات کو بھی اکٹھا کیا اور سب کو ایک کتاب 'سمندر راو پر جھاگ اندر موتی' کی شکل میں پیش کر دیا۔

زیر تبصرہ کتاب میں سب سے پہلے مقصود الٰہی شیخ کی 10 پوپ کہانیوں کو جگہ دی گئی ہے، جن کے عنوانات اس طرح ہیں: چاہت کا فرق، مشورہ، پہلا کلون، جرم، سوال، تقابل، آخری ایکٹ، تازہ خبر، چنکار اور خوف، دہشت، وحشت پریشانی میں لحۂ فکریہ۔ ڈاکٹر عبدالحی نے 'مقصود الٰہی کی منتخب پوپ کہانیاں' کے عنوان سے مزید 9 پوپ کہانیاں کتاب میں شامل کی ہیں۔ ترتیب وتشکیل میں پوپ کہانیوں کو مقدم رکھنے اور عام کہانیوں کے ساتھ منتخب کہانیوں کی شمولیت کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ اردو میں پوپ کہانیوں کی ایجاد مقصود الٰہی شیخ سے ہوئی ہے۔ گویا اس طرح اردو ادب میں ان کے ذریعہ ایک نئی صنف کی ابتدا اور شمولیت ہوئی۔ کتاب میں مقصود الٰہی شیخ کے پانچ افسانے وقت نہیں تھمتا، تھمے گا؟، پنجوں کے بل، اوس کی چلمن سے جھانکتے خاکستری رنگ، بتک اور جتنا سچ اتنا جھوٹ، شامل کیے گئے ہیں۔ 'متفرق مضامین' کے عنوان سے جن مضامین کو شامل اشاعت کیا گیا ہے وہ اس طرح ہیں: پوپ کہانی کیوں؟ ہر طرف اردو ہی اردو تھی، داغ مفارقت، ادب اور قومی شعور، ملکہ عالیہ کی ڈائمنڈ جوبلی۔ ان مضامین کے عنوانات سے ہی پتہ چلتا ہے کہ مضامین عام ڈگر سے ہٹ کر لکھے گئے ہیں اور معلوماتی ہونے کے ساتھ دلچسپ بھی ہیں۔

پوپ کہانیوں، مضامین اور افسانوں کے ساتھ مرتب کتاب نے انٹرویوز کو بھی اہمیت کے ساتھ کتاب میں شامل کیا ہے۔ ان میں ایک انٹرویو مقصود الٰہی شیخ سے خود مرتب کا کیا ہوا ہے۔ یہ انٹرویوز مقصود الٰہی کے بارے میں بہت سی اہم معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ان انٹرویوز میں بعض اہم باتوں کا خود مقصود الٰہی نے انکشاف کیا ہے۔ گویا یہ انٹرویوز مقصود الٰہی کی شخصیت اور ان کے فن کی تفہیم میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب کا خاص اور اہم پہلو یہ ہے کہ انھوں نے مقصود الٰہی کی شخصیت اور خدمات پر لکھے گئے ناقدین اور مشاہیر ادب کے مضامین کو بھی کتاب میں شامل کیا ہے جس سے یہ بات بآسانی معلوم ہو جاتی ہے کہ مقصود الٰہی کا ادبی وصحافتی مقام کیا ہے اور ناقدین انھیں کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ مقصود الٰہی اور ان کے فن کے حوالے سے لکھے گئے مضامین اور تحریروں کی تعداد خاصی زیادہ ہے جن میں سے قریب دو درجن ادیبوں کی تحریریں شامل کتاب ہیں۔ ان میں سے چند ایک کے نام اس طرح ہیں: منشایاد، وارث علوی، پروفیسر اسد مصطفیٰ، ثروت اقبال، ستارہ لطیف خانم، عذرا اصغر، سید ظفر ہاشمی، خدیجہ زبیر احمد، سید سلیمان احمد اور توصیف بریلوی۔ خود مرتب کا بھی ایک مضمون بعنوان 'شیشہ ٹوٹ جائے گا: ایک جائزہ' کتاب میں موجود ہے۔ اس مضمون میں مقصود الٰہی شیخ کے ناولٹ 'شیشہ ٹوٹ جائے گا' کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ ناولٹ کے بارے میں ڈاکٹر عبدالحی نے لکھا ہے:

''مقصود شیخ کی زبان رواں ہے اور عام فہم انداز میں انھوں نے تین نسلوں (Three generations) کے کرداروں پر مشتمل داستان تحریر کی ہے اور جس خوبصورتی کے ساتھ مقصود الٰہی شیخ نے 'شیشہ ٹوٹ جائے گا' لکھا ہے، وہ یقیناً قابل تعریف ہے اور اس ناولٹ کو ادبی دنیا میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔''

کتاب کے آخر میں بعض اہم خطوط اور تصویریں بھی شامل کی گئی ہیں۔ مثلاً عصمت چغتائی کے دو خطوط، رفیعہ منظور الامین کا ایک خط، قمر رئیس کا ایک خط۔ ان کے علاوہ حامدی کاشمیری، صدیقہ بیگم مدیر 'ادب لطیف' لاہور، جلیل مرزا، افتخار امام صدیقی، رشید افروز، علی احمد فاطمی، سید ظفر ہاشمی، دیپک بدکی، جمشید مرزا اور فخر زمان کے خطوط بھی شامل کیے گئے ہیں۔ یہ خطوط بھی ہمیں مقصود الٰہی کی شخصیت وفن کے بعض اہم گوشوں سے روشناس کراتے ہیں۔ کتاب کے بیک کور پیج پر تنویر پھول (نیویارک) کی چند سطریں اس کتاب کی اہمیت پر روشنی ڈالتی ہیں۔ مواد کے ساتھ کتابت بھی معیاری ہے اور کاغذ بھی۔ ڈاکٹر عبدالحی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے مقصود الٰہی کی شخصیت اور خدمات پر گراں قدر مواد جمع کر کے ایک اہم کتاب ترتیب دی۔ امید کی جا سکتی ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کتاب کو پسند کیا جائے گا۔

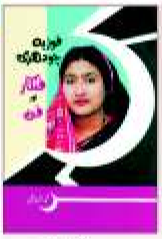

فوزیہ چودھری فن اور فنکار

مصنف: محمد شاہد علی

صفحات: 196، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: تنویر پبلشرز حیدرآباد

مبصر: ریحانہ فاطمہ، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی

دکن کی سرزمین پر فوزیہ چودھری کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔ ان کا تعلق گلبرگہ کے ایک علمی وادبی گھرانے سے تھا۔ ان کی والدہ ایک باذوق اور اسلام پسند خاتون تھیں۔ ان ہی کے زیر سایہ انھوں نے اردو عربی کی تعلیم حاصل کی۔ پیش نظر کتاب محمد شاہد علی کے ایم فل کا مقالہ ہے جسے تلنگانہ اردو اکاڈمی نے شائع کیا ہے۔ 191 صفحے پر محیط یہ کتاب فوزیہ چودھری کی زندگی اور ان کی ادبی کاوشوں کی ایک اچھی کوشش ہے۔ اس کتاب کے تین باب ہیں۔ پہلے باب میں فوزیہ چودھری کا حسب نامہ بیان کیا گیا ہے اور ان کی پرورش پر داخت کے مختلف عمل سے بحث کی گئی ہے۔ مصنف نے مختلف تحقیقی حوالے کے ذریعے ان کی زندگی کے تانے بانے کو بنا ہے۔ ان کی زندگی میں رونما ہونے والے مختلف واقعات اور سانحات کی مدد سے ان کی عمیق فکر کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اسی باب کے دوسرے حصے میں مصنفہ (فوزیہ چودھری) کی ادبی کاوشوں پر خامہ فرسائی گئی ہے۔

مصنف نے بالخصوص فوزیہ چودھری کے خاکوں کا جائزہ لیا ہے۔ اس سلسلے میں فوزیہ چودھری کے لکھے خاکوں کا مجموعہ مہرباں کیسے کیسے نے شہرت حاصل کی۔ وہ اس کے دیباچے میں لکھتی ہیں:

''لکھنا میرا شوق ہے جس کے باعث یہ چند خاکے لکھے گئے ہیں۔ یہ خاکے ان ادبا، شعرا کے ہیں جن سے میں بارہا مل چکی ہوں۔ ان شخصیتوں کو جیسے سنا، پڑھا اور دیکھا ہے۔ الفاظ کے پیراہن میں خاکوں کی صورت میں جوں کے توں پیش کیا۔''

اس باب میں مصنف نے خاکوں کا تجزیہ کرنے کے بجائے مختلف دکنی ادبا کی آرا سے ان کی خاکہ نگاری کا جائزہ لیا ہے لیکن نمونے کے طور پر ان کے کسی بھی ایک خاکے کا اقتباس بھی نہیں دیا گیا ہے۔ جب تک ہم متن کو سامنے نہ رکھیں کسی بھی شہ پارے کا

تجزیہ نہیں ہوسکتا خواہ خاکہ ہی کیوں نہ ہو۔ اس باب میں مزید لکھا گیا ہے کہ وہ بنیادی طور پر خاکہ نگار تھیں اس کے علاوہ انھوں نے رسالے بھی شائع کیے اور اپنی والدہ محترمہ ثریا شحنہ کی تحریروں کو یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کیا۔

دوسرے باب میں اردو میں خاکہ نگاری کی تاریخ کو بیان کیا گیا ہے جس میں صابرہ سعید، محمد حسین آزاد، عبدالحلیم شرر، مرزا فرحت اللہ بیگ، آغا حیدر حسن، مولوی عبدالحق، اشرف صبوحی، رشید احمد صدیقی، شاہد احمد دہلوی، خواجہ حسن نظامی اور منٹو کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ اس باب کے دوسرے حصے میں کرناٹک میں خاکہ نگاری کے عنوان سے مباحث قلمبند کیے گئے ہیں۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ کرناٹک میں خاکہ نگاری کی ایک اہم روایت رہی ہے اور وہاں کے ادیبوں نے ایک دوسرے کے خاکے لکھے جن میں ان کی جیتی جاگتی تصویریں، رقصاں و حیراں نظر آتی ہیں۔ ان خاکوں کو لکھتے وقت ظاہر اور باطن دونوں کا خیال رکھا گیا ہے جس کی وجہ سے لکھے گئے خاکوں میں پوری شخصیت جلوہ گر نظر آتی ہے۔ ان سلسلے میں فوزیہ چودھری کے خاکے مثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آخری باب دراصل اس کتاب کے مطالعے کا محود اور مرکز ہے۔ تقریباً دوسو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں چالیس صفحات فوزیہ چودھری کی خاکہ نگاری کی نذر کیے گئے ہیں۔ مصنف نے بہت ہی روایتی انداز میں ان خاکوں کا جائزہ لیا ہے جیسے ممدوح کا حلیہ شخصیت، خاکوں کی زبان اور اسلوب کے حوالے سے مصنف نے فوزیہ چودھری کے خاکوں کا جائزہ لیا ہے لیکن اس جائزہ میں تحسین کا پہلو غالب ہے۔ پوری کتاب میں معروضی مطالعہ کی کمی کھٹکتی ہے دراصل یہ ایم۔ فل کا مقالہ ہے تو اس میں تحقیقی طریقہ کار کا بھی ذکر ہونا چاہیے کہ فوزیہ چودھری کی شخصیت اور فن کو سمجھنے کے لیے کس کس تحقیقی طریقہ کار کو بروئے کار لایا گیا۔ اس کا ذکر پوری کتاب میں کہیں نہیں ملتا۔ یہ صرف اس مقالہ کا ہی المیہ نہیں ہے بلکہ جامعاتی تحقیق کا بڑا المیہ ہے اس پر توجہ دینی چاہیے۔ تاہم پوری کتاب کے مطالعے سے فوزیہ چودھری کی ادبی و علمی کاوشوں کا پتہ چلتا ہے۔ نہایت ہی کم عمری میں انھوں نے اردو ادب کے ساتھ عشق کیا اور اس کی سرشاری سے اپنی تحریروں کو شاداب و شگفتہ بناتی رہیں۔ ان کی شخصیت کے دو اہم پہلو یہ ہیں کہ انھوں نے ایک ادیبہ اور بالخصوص خاکہ نگار کے بطور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا وہیں ایک بہترین منتظمہ کے طور پر کرناٹک اردو اکادمی کی سرگرمیوں کو عروج بخشا۔ انھوں نے نئی نسل کے لکھنے والوں کی ستائش کی اور انھیں موقع فراہم کیا۔ مذکورہ کتاب میں مصنف نے پوری کوشش کی ہے کہ ان کی زندگی اور فن کو قارئین کے سامنے پیش کریں جس میں وہ بہت جلد ہم سے جدا ہوگئیں اور کرناٹک کی ادبی فضا میں ایک خلا پیدا ہوگیا جسے سر دست پر کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ اس دختر دکن کی ادبی کاوشوں کی جتنی بھی ستائش کی جائے کم ہے۔ یہ کتاب ان کی شخصیت اور فن کو سمجھنے میں معاون و مددگار ثابت ہوگی اور اس کی اردو حلقے میں پذیرائی ہونی چاہیے۔

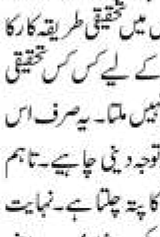

مجاهد ادب شاهد احمد جمالی

مصنف: ڈاکٹر معین الدین شاہین اجمیری
صفحات: 352، قیمت: 400 روپے
مبصر: نسیم سحر، 861، دوسری منزل
عنایت اپارٹمنٹ، صلاح الدین کے سامنے، بھیونڈی

کسی ادیب یا شاعر کی ادبی خدمات کے ارتقا کو سمجھنے اور ان کی قدر و قیمت کے تعین میں تحقیقی کتاب مددگار ثابت ہوتی ہے۔ یہ شاعر اور ادیب کی خوش قسمتی ہے کہ اس کی زندگی میں ہی ان کے بارے میں اس کی کتاب شائع ہو جائے۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ محقق کو ایسے ادیبوں سے مل جل کے ان کے بارے میں کچھ پوچھنے کا بھی موقع مل جاتا ہے۔ ادیبوں کی زندگی کے وہ گوشے جو عوام تک آنے سے محروم رہ گئے ہیں، ان کا بھی ذکر آجاتا ہے۔ ممدوح اگر شاعر ہے تو ان کی غیر مطبوعہ تخلیقات کے مطالعے کا موقع مل جاتا ہے جن سے کئی نئی راہیں کھل جاتی ہیں۔ شاہد جمالی خود ہی اسی میدان کے شہوار ہیں۔ انھوں نے بھی راجستھان کے ادبی دستاویز پر کام کیا ہے۔ انھوں نے راجستھان کے مشاہیر ادب کے مضامین کو جمع کر کے تحقیقی کام کیا ہے۔ ان کا یہ دعویٰ کہاں تک درست ہے ابھی کچھ کہا نہیں جاسکتا۔

''میری ناقص معلومات میں بھی ابھی تک راجستھان میں اس طرح کا کوئی کام اس سے قبل نہیں ہوا ہے...''

شکیل الرحمٰن صاحب نے بھی اس بات کی تائید اس طرح کی ہے:

''ہم دعویٰ تو نہیں کر رہے ہیں لیکن یہ حقیقت بھی ہے کہ جو مضامین اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں، اس میں سے کئی ایسے ہیں جو اہل ادب کی نگاہوں سے آج تک اوجھل رہے۔'' (ص 190)

شاہد جمالی نے جس طرح کئی شعرا کی تخلیقات کو اپنی کتاب میں شامل کیا ہے اسی طرح ان شعرا پر لکھے گئے مضامین کو بھی اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ انھیں اپنی کتاب کی طوالت کا خوف نہیں تھا۔ مثال کے طور پر ایک مثال میں مفتوں کوٹوی کی دے رہا ہوں۔ ہم دور دراز کے لوگ تو صرف یہ جانتے ہیں کہ مفتوں کوٹوی صرف شاعر تھے۔ مگر اس کتاب سے پتہ چلا کہ وہ ادیب بھی تھے۔ ان کے 22 مضامین شاہد جمالی نے شائع کر کے تشنگان ادب کی پیاس بجھائی ہے۔ قاضی معراج دھول پھوری، للتا پرشاد، ثابت لکھنوی اور شفیق جھالاواڑی وغیرہ پر مضمون لکھ کر کئی گمنام شاعر کو اردو ادب سے روشناس کرایا ہے۔ ڈاکٹر معین الدین شاہین اجمیری نے شاہد جمالی کے تقریباً تمام گوشوں کو بڑی محنت سے لکھا ہے۔ زیر نظر مقالہ نو ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ ابواب اس طرح ہیں: شاہد احمد جمالی احوال، بحیثیت تذکرہ، تذکرہ نگار، دیگر مطبوعات، بازیافت، شعور، نقد و نظر، افسانہ نگاری، نگارخانہ، شاعری، معاصرین کی نظر میں اور آخر میں ماخذ و مراجع۔ ان ابواب کے عنوانات سے قبل بار بار شاہد احمد جمالی، شاہد احمد جمالی...... کی تکرار پڑھنے میں اچھی نہیں لگتی۔ نام صرف ابتدا میں لکھا جانا چاہیے تھا، میرے خیال سے یہ مناسب نہیں لگتا۔

پہلے باب میں شاہد احمد جمالی کی زندگی کے بارے میں وہ تمام باتیں درج کی گئی ہیں جسے ایک بھرپور جائزہ کہا جائے تو مناسب ہوگا۔ اس میں انھوں نے مختلف تحریروں سے استفادہ کیا ہے جن کی فہرست کتاب کے آخر میں دی گئی ہے۔ اسے پوری تحقیق کے بعد لکھا گیا ہے۔ مصنف نے بار بار حوالہ دے کر کتاب کو مستند بنا دیا ہے۔ ایک مزے کی بات اس باب میں اس طرح درج ہے کہ شاہد جمالی نے ابھی ساٹھ سال کی عمر میں پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کر کے راجستھان یونیورسٹی کے ریسرچ سیکشن میں داخل کر دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس عمر میں بھی شاہد جمالی کی علمی حرص باقی ہے۔ یہ انفرادیت بہت کم لوگوں میں دیکھی گئی ہے۔ یہ تو ایک چھوٹی سی مثال ہے، اس کے علاوہ بھی ہر باب میں کوئی نہ کوئی نئی بات ضرور ہے۔ سب سے زیادہ صفحات ڈاکٹر شاہین نے شاہد احمد جمالی کی دیگر مطبوعات کے لیے شائع کیے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''راقم (شاہد) کے نزدیک شاہد احمد جمالی جن کا اردو کے تئیں عشق جنون اور

دیوانگی عدیم المثال ہے۔ گھر پھونک کر تماشا دیکھتے ہیں۔ سبب اس کا یہ ہے کہ آپ کی جو بھی کتاب منظر عام پر آئی اسے آپ نے بغیر کسی قیمت کے یعنی بطور ارمغان لوگوں کو پیش کی...''

اس کی مناسبت سے مصنف نے غالب کا یہ شعر درج کیا ہے۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب　　　تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

لیکن میں مجروح سلطان پوری کا یہ شعر آپ کے مطالعے کے لیے پیش کر رہی ہوں۔

جلا کے مشعل جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

بازیافت کے عنوان سے پتہ چلتا ہے کہ شاہد نے کئی نادر مخطوطات کا پتہ لگا کر اس کو شائع کروایا ہے۔ حکیم قادر علی ماہر قلمی دیوان، ایک نایاب قلمی تاریخی مخطوطہ، راجستھان کی پہلی مطبوعہ داستان وقائع راجکمار، کافی مخطوطات پر مضامین شائع کیے گئے ہیں۔ میرے خیال میں یہ سب ریسرچ اسکالر کے کام کی چیز ہیں۔

اسی طرح کے مضامین سے استفادہ کر کے یونیورسٹی میں تحقیقات ہوتی ہیں۔ شاہد صاحب کو پہلے مضمون نگار کا درجہ دیا جانا چاہیے۔

اس چھوٹے سے تجزیے میں پوری بات نہیں آسکتی ہے۔ آپ اسے پڑھیں گے تو یہ بات ضرور کہیں گے کہ شاہد احمد جمالی نے جو بھی لکھا ہے وہ راجستھان کے اردو ادب کا قیمتی ذخیرہ ہے۔

ڈاکٹر شاہین نے اپنے ممدوح کا ذکر کرتے وقت کہیں بھی مبالغے سے کام نہیں لیا ہے اس لیے سچائی ابھر کر سامنے آتی ہے۔ زبان صاف ستھری اور مضمون نگار نے اپنے فقروں اور جملوں میں اس طرح تحریر کیا ہے کہ اس میں روانی پیدا ہوئی ہے۔ کہیں بھی ان کے اظہار کے تسلسل کو ٹھیس نہیں لگی ہے۔ ہم آئندہ بھی ان کی تخلیقات کا انتظار کرتے رہیں گے۔

فکشن

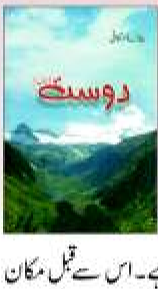

دوست

مصنف: پیغام آفاقی

صفحات: 188، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: علی احمد فاطمی، شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد، یوپی

ناول 'دوست' ممتاز فکشن نگار پیغام آفاقی کا تیسرا ناول ہے۔ اس سے قبل مکان (1989) شائع ہو کر مصنف کی بطور ناول نگار عمدہ شناخت قائم کر گیا۔ یہ وہ دور تھا جب پرانے ناول نگار روایتی طور پر ناول لکھ رہے تھے یا اپنے آپ کو دہرا رہے تھے، ایسے میں 'مکان'، 'پانی' وغیرہ نے نئے ناول کی داغ بیل ڈالی اور ناول کے شعبے میں نئے مباحث کا سیلاب سا آگیا۔ پھر تو ناول نگاری کا بھی سیلاب آیا اور جلدی جلدی ناول لکھے جانے لگے اس رفتار میں غضنفر تیز رو تھے لیکن پیغام آفاقی کو سست رفتار تو نہیں لیکن سمجھدار ضرور کہا جاسکتا ہے۔ ان کو کسی قسم کی جلدی نہ تھی۔ خود غضنفر نے ایک جگہ لکھا ہے ''مکان کے بعد دنیائے ادب سے مسلسل غائب رہنے کے بعد اچانک ایک دن 'پلیتہ' پیش کر دیا جس سے ہونے والی دھمک دور تک سنی گئی۔ پلیتہ کے بعد پیغام نے پھر خاموشی اختیار کر لی اور اس خاموشی کے درمیان وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔ غضنفر نے ان کے اطمینان اور انتظار کے کئی اسباب بیان کیے ہیں جو سچے ہو سکتے ہیں۔ اب ان کا تیسرا ناول 'دوست' (2018) منظر عام پر آیا جو ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا۔ ایک ناول اور تیار ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان ناولوں کو انھوں نے اپنی زندگی میں کیوں نہیں شائع کیا۔ غضنفر کا یہ خیال درست ہے کہ وہ صبر و تحمل اور غور و فکر کے فنکار تھے۔ ناول میں فلسفہ یا فلسفہ میں ناول تلاش کرتے تھے اور صنف ناول کی نزاکتوں و عظمتوں پر نظر رکھتے تھے۔ ان امور پر انھوں نے کئی مضامین بھی لکھے۔ ایک مضمون پختہ اور ناپختہ ناول میں فرق' میں صاف طور پر لکھا ''ناول کی عظمت دانشوری میں پنہاں ہوتی ہے نا کہ محض خیال آفرینی میں۔''

ڈی ایچ لارنس نے بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ ''فکشن کی معراج فلسفہ ہے۔ بڑا فکشن بغیر فلسفہ کے ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔'' یہ تمام باتیں اپنی جگہ پر درست ہو سکتی ہیں لیکن تخلیق کو پہلے تخلیق اور ناول کو پہلے ناول بھی تو ہونا چاہیے۔ فلسفہ کی کثرت تخلیقیت کو متاثر کرتی ہے اور قاری کو لمحہ بھر کے لیے مرعوب تو کر سکتی ہے، متاثر نہیں۔ 'پلیتہ' اور 'دوست' کے ساتھ یہی ہوا کہ اسے 'مکان' جیسی شہرت نہیں ملی۔ 'دوست' موضوع کے اعتبار سے آج کی دنیا میں جو رشتوں کی الٹ پھیر ہے۔ مرد اور عورت کے رشتے، میاں اور بیوی کے رشتے بالخصوص جسم و جنس کے رشتے۔ پھر ان رشتوں کا استحصال، زوال اور کمال اور اس کا تکلیف دہ انجام جو بہر صورت عورت کو زیادہ متاثر کرتا ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں یہ موضوع نیا نہیں ہے اس لیے کہ یہ مسائل نئے نہیں ہیں لیکن عورت اور مرد کے 'دوست' بننے اور بحیثیت دوست ایک ساتھ رہنے (Living Together) کا تصور بہر حال نیا ہے۔ مغرب میں اب یہ عام ہے اور مشرق میں اب اس کی آمد ہو چکی ہے۔ ہر چند اس نئے تصور کے پیچھے قدیم مسائل کام کرتے نظر آتے ہیں اور خواتین کا استحصال زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ اسی لیے آج کی پڑھی لکھی خود مختار عورت بہت کچھ نیا سوچنے اور کرنے پر مجبور ہے۔ اسی ناول کا مرکزی کردار انیتا اپنے دوست سے بڑے اعتماد سے کہتی ہے:

''نہ مجھے میرا بائی بننا ہے نہ آپ مہاتما بدھ بنیں گے۔ یہ فرار ہے۔''

''جب پیار میں قربانی کا جذبہ شامل نہیں ہوتا تو عورت کو اپنے استحصال کا احساس ہوتا ہے۔''

''مردوں کا رویہ دیکھ کر اب عورتیں بھی پوری طرح مادہ پرست ہو گئی ہیں۔''

قدم قدم پر ایسے بے شمار مکالمے بھرے پڑے ہیں اس لیے کہ ناول میں محض ایک مرد اور ایک عورت کے مابین مکالموں کی بھرمار ہے۔ ہر چند کہ ان کی معنی خیزی اور فکر انگیزی سے انکار ممکن نہیں تاہم ناول صرف مکالموں سے بھی جاندار نہیں ہوتا جب تک کہ اس میں معاشرہ، منظر اور جزئیات وغیرہ نہ ہوں۔ حالانکہ کہیں کہیں ایسے ایسے جملے بھی ملتے ہیں:

''سارا مسئلہ قربانیوں کی بنیاد پر رشتوں کو بنانے اور توڑنے کا ہے۔''

''دنیا میں ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا ہے جس میں دنیا کی تمام عورتیں تمام مردوں سے دوست کی حیثیت سے آنکھ ملا سکیں۔''

''عورت کا ایک روپ ایک مکمل انسان کا بھی ہوتا ہے اور مرد بھی ایک انسان۔''

نئی دنیا اور نیا سماج یہ چاہتا ہے کہ کیوں نہ مرد اور عورت صرف دوست کے طور پر رہیں اور ان میں ایک انسانی و اخلاقی رشتہ ہو۔ یہ باتیں مثالی تو ہو سکتی ہیں لیکن ہندوستان جیسے مشرقی اقدار کے ملک میں عمل ممکن نہیں۔ پورا ناول اسی نوع کے مباحث

اور مکالمات پر ٹکا ہوا ہے جو آج کا ایک اہم مسئلہ تو ہے لیکن کیا یہ اہم مسئلہ ناول کی تخلیقی شان بن سکا اس لیے مصنف ناول لکھ رہا ہے سماجی دستاویز کی کتاب نہیں جیسا کہ عرض کیا گیا کہ پیغام آفاقی کی مفکرانہ شخصیت اکثر ان کی خلاقانہ شخصیت کو پیچھے چھوڑ دیتی ہے۔ اس ناول (اگر یہ ناول ہے) میں بھی یہی ہوا۔ صرف دو کردار اور ایک مسئلہ پورے ناول میں چھائے رہتے ہیں جبکہ ناول معاشرتی، تہذیبی سیاق و سباق میں لکھا جانے والا وہ آلۂ کار ہے جہاں رزم گاہ حیات کے اکثر کردار اور ان سے وابستہ دنیا بولتی رہتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پیغام آفاقی نے بڑی جسارت کے ساتھ ایک نیا موضوع پیش کیا ہے لیکن یہ جسارت تخلیقیت میں ڈھل سکی یا نہیں غور تو اس پر بھی ہوگا اور ہونا بھی چاہیے۔ تاہم اس جسارت کی تو داد پیغام کو ملے گی ہی بقیہ کا فیصلہ آنے والا وقت کرے گا۔ بیگم پیغام آفاقی، غضنفر اور سلمان عبدالصمد مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اسے شائع کر کے ایک مستحسن کام انجام دیا ہے۔

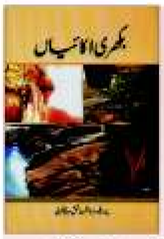

بکھری اکائیاں

مصنف: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

صفحات: 120، قیمت: 150 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: فیروز ہارونی، ریسرچ اسکالر دہلی یونیورسٹی دہلی

زیر نظر افسانوی مجموعہ بکھری اکائیاں پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی تصنیف ہے جس میں تیس افسانے شامل ہیں۔ جیسا کہ مجموعے کے نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ ہی بکھرا ہوا ہے جس میں ہر فرد الگ الگ اکائیوں اور الگ الگ خانوں میں بٹا ہوا ہے۔ بے ایمانی، جھوٹ، دغابازی، لوٹ گھسوٹ، ایک دوسرے کو نیچا دکھانا، اخلاقی گراوٹ، اخلاقی انارکی، بدتمیزی، بدتہذیبی، ماں باپ کی نافرمانی، شوہر بیوی کی دغابازی، آپسی بیوفائی، حرام زدگی، اور عورتوں مردوں، لڑکے اور لڑکیوں کی بداعمالی، اور زناکاری میں ملوث ہونا، بغیر شادی کے لڑکیوں کا حاملہ ہوجانا، اپنے خاندان، حسب و نسب کو چھوڑ کر تنہائی کی زندگی گزارنا موجودہ زمانے کا سب سے مہذب شیوہ بن چکا ہے۔

ماڈرن زمانے کے لوگ ان حرکتوں کو نہ غلط سمجھتے ہیں اور نہ ہی ان بداعمالیوں کی روک تھام کے لیے کوئی پالیسی بناتے ہیں۔ بکھری اکائیاں ان تمام پہلوؤں کو الگ الگ افسانوں کے ذریعے سے اجاگر کرتا ہے۔

بکھری اکائیاں میں موجودہ ہندوستان کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ اور خصوصی طور پر ہندوستان کی سیاست، شہروں کے حالات، بازاروں میں اور بڑے بڑے محلات میں رہنے والے اثر و رسوخ رکھنے والے لوگوں کی کیفیت، شہر میں رہ کر ہرجائی پن کرنے والی بیویاں، اور زندگی بھر اپنی شادی کے انتظار میں جوانی کو ختم کرنے والی گاؤں کی لڑکیاں، کلبوں اور بازاروں میں جا کر اپنے خواہشات کو پوری کرنے والی نوجوان عورتیں اور نوجوان مرد خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس مناسبت سے جو افسانے نہایت مؤثر ہیں ان میں قابل ذکر، بکھری اکائیاں، کالا اتوار، باکسنگ ڈے، گزارتی عمر کی کنواری لڑکی، عورت کی طلب، ریت کا ٹیلہ، نوعیت وغیرہ قابل ذکر افسانے ہیں۔

ہرگانوی صاحب نے ادیبوں اور نیم فلاسفروں کی زندگی کو بھی بڑے حسن و خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ فلاسفر چاہے چھوٹا ہی کیوں نہ ہو اپنی بات کو ہمیشہ مدلل اور بااثر کر کے رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ نیز ادیب ہمیشہ یہی سوچتا ہے کہ وہ قاری کے نبض کو پکڑے کہ وہ کیا پڑھنا زیادہ پسند کرتا ہے اور اسی کے موافق ادب تخلیق کرے۔

مجموعے میں موجودہ شہری زندگی کی عکاسی کرنے والے بھی کچھ افسانے موجود ہیں جن میں ان مردوں اور عورتوں کا حال بیان کیا گیا ہے جو اپنے شوہر یا بیوی کو چھوڑ کر دوسرے کی بیوی یا دوسروں کے شوہر کے ساتھ محظوظ ہوتے ہیں اور اسی محظوظیت کو سویلائزڈ سوسائٹی کا نام دیتے ہیں۔ ان افسانوں میں خوش رنگ آگ، قطرہ قطرہ احساس، شناخت، طلسمی درد کے کانٹے، عورت کی طلب وغیرہ قابل ذکر افسانے ہیں۔

تمام افسانوں کو پڑھنے کے بعد قاری کے سامنے کئی زاویے کھل کر آتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج کے موجودہ زمانے کی ہندوستانی سوسائٹی نظروں کے سامنے موجود ہے، جس میں قسم قسم کے لوگ ہیں اور ہر قسم کا شخص اپنی اپنی دکان سجائے خریدار کے تلاش میں بیٹھا ہے۔ وہ دُکان کبھی سیاست کی دُکان بن جاتی ہے کبھی نوجوان لڑکے لڑکیوں کی دُکان بن جاتی ہے کبھی مندر مسجد کی دُکان بن جاتی ہے اور کبھی نوکری سے پریشان آدمی کی دُکان بن جاتی ہے۔ بکھری اکائیاں اسی طرح کے سامان سے بھری دکان ہے جس میں ہم آپ قاری ہیں جو اپنے اپنے ذوق کی مناسبت سے افسانہ نکال لیتے ہیں۔

جہاں تک تحریر یا اسلوب کی بات ہے تو افسانہ پڑھتے ہوئے کبھی بھی کوفت اور بوریت کا احساس نہیں ہوتا۔ بلکہ آپ ایک کہانی پڑھنا شروع کیجیے تو پورا مجموعہ ختم کیے بغیر کتاب کو اپنے سے الگ نہیں کر سکتے۔

افسانوں کی پیش کش کا انداز، اسلوب نگارش، بیانیہ کی تکنیک، انداز تحریر نیز منظر نگاری، جملوں کی بناوٹ، الفاظ کا مناسب استعمال متاثر کرتا ہے۔

افسانوی مجموعہ میں مجھے جس بات کی کمی محسوس ہوئی وہ یہ ہے کہ کئی افسانوں میں کہانی پن کی کمی ہے۔ اور الفاظ میں وہ گہرائی نہیں ہے کہ ایک قاری افسانہ کو پڑھے تو دل میں اتر جائے۔ بلکہ کبھی کبھار تو افسانہ پڑھنے کے کچھ دیر بعد ہی افسانے کی کہانی ذہن سے غائب ہوجاتی ہے۔ حالانکہ ایسا شاید اس وجہ سے ہوا ہے کہ موجودہ زمانہ تغیر پذیر زمانہ ہے یہاں ایک چیز بازار میں آنے سے پہلے ہی دوسری چیز آجاتی ہے۔ جبکہ افسانے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہونی چاہیے کہ جب کہانی پڑھی جائے تو وہ دل میں اتر جائے۔ مختصر یہ کہ افسانوی مجموعہ قاری کو ضرور متاثر کرے گا۔

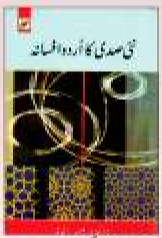

نئی صدی کا اردو افسانہ

مرتب: ڈاکٹر ارشاد سیانوی

صفحات: 366، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: ڈاکٹر عبدالناصر، C-24، اوکھلا وہار، جامعہ نگر، نئی دہلی 25

پیش نظر کتاب 'نئی صدی کا اردو افسانہ' موجودہ صدی میں لکھے گئے اکیس نمائندہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ یہاں افسانہ نگاروں کی دو جماعتیں ہیں۔ پہلی جماعت میں ویسے افسانہ نگار شامل ہیں جو پختہ کار ہیں اور عرصۂ دراز سے برابر لکھتے رہے اور آج بھی ان کا قلم رواں دواں ہے۔ اس کے علاوہ دوسری جماعت میں وہ افسانہ نگار ہیں جن کی افسانہ نگاری موجودہ صدی سے شروع ہوئی لیکن انھوں نے اپنی محنت و لگن سے اپنی شناخت بنائی۔

پیش نظر کتاب کے دو حصے ہیں: حصہ اول میں کل آٹھ افسانہ نگاروں کے افسانے شامل ہیں۔ ان میں سرفہرست اسلم جمشید پوری، پرویز شہریار، خورشید حیات، شاہد اختر،

کہکشاں پروین اور قاسم خورشید کے علاوہ دو پاکستانی افسانہ نگار گلزار جاوید اور مظہرالاسلام ہیں۔ حصہ دوم میں کل تیرہ افسانے ہیں۔ ان میں اشتیاق سعید، ترنم جہاں شبنم، راجیو پرکاش ساحر، رومانہ رومی، رخشندہ مہدی، سلمٰی جیلانی، سلمٰی صنم، شائستہ فاخری، غزالہ قمراعجاز، فرقان سنبھلی اور نیاز اختر شامل ہیں۔ واضح ہو کہ اسی کتاب کے دوسرے حصے میں خواتین افسانہ نگاروں کی تعداد کافی زیادہ ہے جبکہ پہلے حصے میں صرف ایک خاتون افسانہ نگار ہے۔ اس افسانوی مجموعہ کا تعارف حقانی القاسمی نے کرایا ہے اور یہ بتانے کی ضرورت محسوس کی:

''اکیسویں صدی کے اہم مسائل میں فرقہ وارانہ تشدد، دہشت گردی، گلوبل وارمنگ وغیرہ بہت اہم ہیں اور افسانوں میں زیادہ تر افسانے عہد حاضر کے انہی مسائل سے متعلق ہیں اس لیے یہ افسانے جہاں ہمارے لیے بڑی اہمیت کے حامل ہو جاتے ہیں وہیں ان افسانوں کے تجزیے کی معنویت بھی بڑھ جاتی ہے۔'' (ص 12)

مجموعے میں شامل سبھی افسانے مؤلف کے ذاتی جستجو و کاوش کے نتیجے میں یکجا کیے گئے ہیں۔ ان کا تجزیہ بھی لائق تحسین ہے لیکن یہاں ایک کمی یہ ہے کہ خود مؤلف نے اس میں کوئی افسانہ اپنے نام سے شامل نہیں کیا ہے۔ اگر ایسا کیا ہوتا تو قارئین کو بھی ان کے انداز تحریر کا بخوبی اندازہ ہو جاتا۔

مجموعے میں شامل پہلا افسانہ 'عیدگاہ سے واپسی' جو اسلم جمشید پوری کی تخلیق ہے وہ اس معنی میں کافی اہم ہے کہ اس افسانے میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے بکھرنے کا ماتم ہے۔ حامد ایک معصوم اور سادہ لوح کردار ہے جو حق گوئی و بے باکی کا مظہر ہے جو معاشرے کے دکھ درد میں برابر کا شریک رہتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی اور اس کے پوتے ساجد کی جان بھی تعصب کی نذر ہو جاتی ہے اور کسی بھی فرد کو اسے روکنے کی ہمت نہیں ہوتی ہے کہ اس کی ناحق جان کیوں لی گئی ہے؟ افسانے کا یہ جملہ کس قدر درد و کرب میں ڈوبا ہوا ہے:

''خون کا فوارہ دونوں جسموں سے بلند ہو رہا تھا۔ زمین ساکت تھی۔ آسمان خاموش تھا۔ ہوا سانس لینا بھول گئی تھی۔ دونوں کے خون میں لت پت لاشے پڑے تھے۔'' (ص 29)

مجموعے کے دوسرے افسانہ 'لیو ان ریلیشن سے پرے' میں پرویز شہریار نے ایک کرسچن لڑکی پدمجا جو سیف اور ایک ہندو مرد شمبھو ناتھ سنگھ کے درمیان پروان چڑھنے والے پیار کا ذکر کیا ہے۔ یہ دونوں غیر شادی شدہ ہو کر ایک چھت کے نیچے رات بسر کرتے ہیں۔ دونوں کے درمیان پہلے نادانستہ طور پر ایک دوسرے کی طلب ہوتی ہے اور انجام کار محبت اپنا رنگ دکھاتی ہے اور دونوں کی زندگی کا رخ یکسر بدل کر رکھ دیتی ہے۔ جب پدمجا شمبھو سے یہ کہنے پر مجبور ہو جاتی ہے:

''اب میں نیو یارک نہیں جاؤں گی۔''

اور ''اتنا سنتے ہی شمبھو کی باچھیں خوشی سے کھل اٹھیں...''

دراصل ان دونوں کو ایک ہمدرد اور مضبوط سہارے کی تلاش تھی۔ جو بالآخر ان دونوں کو مل گیا۔

ایک افسانہ 'کشن پور کی مسجد' قاسم خورشید کی تخلیق ہے۔ یہاں ہندو مسلم بھائی چارے کے رشتے کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

''فریق ثانی! نامی افسانے میں گلزار جاوید نے طلاق کو موضوع بنا کر معاشرتی خرابیوں اور بدگمانیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

اسی طرح کئی دیگر افسانے بھی عمدہ ہیں مثلاً رخشندہ روحی مہدی کا افسانہ 'مگر ایک شاخ نہال غم'، سلمٰی جیلانی کا 'سسکیاں'، سلمٰی صنم کا 'پانچویں سمت'، شائستہ فاخری کا 'سنو رقیہ باجی'، غزالہ قمراعجاز کا 'کھوکھلے رشتے'، فرقان سنبھلی کا 'آب حیات' اور نیاز اختر کا 'بوڑھے برگد کا انت' بھی اپنی جگہ اہم ہیں۔

کئی افسانے تو بالکل عام فہم زبان میں ہیں جبکہ ایک افسانہ 'ریوڑ' میں ہندی آمیز الفاظ کی بھرمار سے بوجھل ہو گیا ہے۔

شاعری

منظومات کیشری ناتھ ترپاٹھی

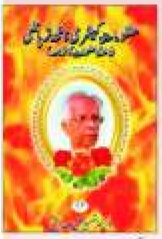

مترجم: ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی

صفحات: 288، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی، لنگر خانہ، چوک محمد سعید خاں، رامپور

مبصر: مصطفیٰ علی

ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

جناب کیشری ناتھ ترپاٹھی ان معدودے چند لوگوں میں سے ایک ہیں جو سیاست کی کرسی پر بیٹھ کر بھی قلم کی باگ ڈور تھامے رکھتے ہیں اور اپنے فکری وفنی اضطراب کو تسکین دینے کے لیے اپنے مصروف ترین اوقات میں سے ادب کی خدمت کے لیے وقت نکال لیتے ہیں۔ وہ معروف سیاست داں اور مشہور ہندی شاعر ہیں۔ وہ اتر پردیش اسمبلی کے صدر اور بنگال سمیت چار صوبوں کے گورنر رہ چکے ہیں۔ ان کے اب تک چھ مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ منو کرتی، چرتن، ان مکت، آیو پنکھ، مون اور شونیہ۔ زیر تبصرہ کتاب انھیں مذکورہ مجموعوں میں سے تین کے منتخب اٹھاون منظومات اور ان کے اردو لپیانترن پر مشتمل ہے۔

آغاز کتاب میں ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی صاحب نے جناب کیشری ناتھ ترپاٹھی کی حیات اور شاعری پر عمدہ گفتگو کی ہے۔ انھوں نے ساری نظموں کی دیوناگری لپی برقرار رکھتے ہوئے اس کے سامنے اس کا فارسی رسم خط مہیا کر دیا ہے۔ انہوں نے ہر نظم میں موجود مشکل الفاظ کے معانی بھی نظم کے آخر میں درج کر دیے ہیں، جس سے اس نظم یا کویتا کو پڑھنے اور سمجھنے میں بڑی سہولت ہوتی ہے۔

ایک متحرک سیاست داں کے طور پر جناب کیشری ناتھ ترپاٹھی کو ملک و بیرون ملک کے مختلف علاقوں میں رہنے اور ان کی بود و باش، زبان و ثقافت، رسم و رواج اور لباس و طعام کو براہ راست جاننے کا موقع ملا جس سے ان کے کلام میں مشاہداتی و تجرباتی گہرائی پیدا ہو گئی ہے اور ان کے چمن ہائے ادب میں مختلف اقسام کے پھول کھل اٹھے ہیں۔ اس انتخاب میں ظہیر صدیقی نے اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ شاعری کی تمام نوعیت کی نظموں کا نمونہ قارئین کے سامنے آ جائے لہٰذا اس مجموعے میں ہمیں سماجی، سیاسی، تہذیبی، رومانوی، قومی اور اشتراکی وغیرہ رنگوں کی نظمیں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ میرا پر بیچے، کوہروں کے شہر میں ہے کون اپنا، شبد جیسے کھنڈر ہو گئے ہیں، چھتڑے بھی بولتے ہیں، بنجاروں کے بیچ کٹی اک رات، اس طرح جھوم کر چلا میں، بوڑھوں میں بھی بچپن ہوتا ہے، سوگندھ سینک کی، راج نیتی اور ساون وغیرہ ان کی کچھ مشہور اور عصر حاضر کے مسائل پر مبنی بہترین نظمیں ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب کو ترجمہ بتایا گیا ہے، اس کے سرورق پر بھی ''منظومات کیشری ناتھ ترپاٹھی (ہندی منظومات کا ترجمہ)'' مندرج ہے، جس سے یہ گمان گذرتا ہے کہ یہ

ترجمہ شدہ کتاب ہے اور ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی اس کے مترجم ہیں جبکہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس کی دیوناگری لپی کو فارسی رسم الخط میں تبدیل کیا گیا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ ہندی ماتراؤں کا لحاظ ہر جگہ نہیں رکھ پائے ہیں۔ اسی طرح سے (گنیش والے) 'ن' کے لیے وہ ہر جگہ 'نڑ' تحریر کرتے ہیں مثلاً کارنڑ، چرنڑ، پاشانڑ، بھنڈارنڑ، ورنڑ، کرونڑا، درپنڑ وغیرہ۔ اگر ان کو اس حرف کی یہی صورت رکھنی تھی تو جس طرح پیش لفظ میں انہوں نے 'ک' کی جگہ 'ی' رکھنے کی وضاحت کر رکھی ہے اسی طرح انہیں اس کی بھی وضاحت کر دینی چاہیے تھی۔ ایک دو جگہ سطر بھی اوپر نیچے ہو گئی ہے (دیکھیں ص ن: 130/131)۔

ٹائپنگ و پروف کی تو بے شمار غلطیاں ہیں: زبر، زیر، پیش کا صحیح جگہ پر نہ ہونا، زبر کی جگہ جزم یا مد یا اس کے برعکس ہونا، جزم کی جگہ تشدید یا اس کے برعکس ہونا، جہاں نون غنہ نہیں ہونا چاہیے وہاں نون غنہ اور جہاں ہونا چاہیے وہاں اس کا نہ ہونا، ان سب کی ایک دو مثالیں میں ذیل میں دیے دے رہا ہوں باقی کو اسی پر قیاس کر لیں: ''اچھادت، آگڑنت، مُنس، تجل، سُوَر، ویکت، بالو، گالو، گھمڑیں، نہاریں، وشڑوں، گھنڑاں، سریو، کڑاہوں، انُکول، مُنس، درشٹے، پرنڑں، یونا، رسی، پوون، پاکن، اکشڑ، پرورتن، نیوورتا وغیرہ۔'' اس کے علاوہ بھی بہت سی غلطیاں ہیں، دیوناگری لپی اور فارسی رسم خط دونوں میں، مگر طوالت کے سبب میں اس کا ذکر چھوڑ رہا ہوں۔ باقی کاغذ، کتابت، طباعت اور جلد بندی عمدہ ہے۔

چونکہ کیشری ناتھ ترپاٹھی کی زبان سنسکرت آمیز ہندی ہے اس لیے اس کا تبدیلی رسم الخط زبان اردو میں کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ بیشک ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی نے یہ کام انجام دے کر اردو والوں سے کوی کیشری کو متعارف کرانے کا بڑا کارنامہ کیا ہے۔ ایک ایسا ہندی شاعر جس کی نظمیں جاپان کی یونیورسٹی نے اپنے نصاب میں شامل کر رکھی ہے اور جس کی منظومات کا ترجمہ بنگالی زبان میں بھی ہو چکا ہے، اس سے اردو والوں کو واقف کرانے کا بیڑا اٹھانے کے لیے ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی صاحب کو میں مبارکباد پیش کرتا ہوں اور ساتھ ہی یہ امید بھی رکھتا ہوں کہ آئندہ ایڈیشن کے لیے مذکورہ اغلاط کی تصحیح کا فریضہ ضرور انجام دیا جائے گا۔ آخر میں ان کی نظم 'اس طرح جھوم کر چلا میں' کے کچھ اشعار ملاحظہ ہو۔

اس طرح جھوم کر چلا کہ میں تجھے دیکھوں   بت کے آگے جھکا کتنی کتابیں پڑھ ڈالیں
سب سے پوچھا بتا کہ وہ کہاں پر ملتا ہے   دور ہٹتے گئے سب اپنی بجا کر تالی
جہاں گیا بس ایک لڑائی دیکھی   دوجے کی برائی سنی، اپنی ہی بڑائی دیکھی

عہد نو کی سسکیوں کا ساز ہے میری غزل

شاعر: ڈاکٹر کمار پانی پتی
صفحات: 264، قیمت: 250 روپے
ناشر: ایم آر پبلی کیشنز، دریا گنج نئی دہلی
مبصر: حبیب سیفی
فرسٹ فلور حوض رانی E12/51B مالویہ نگر نئی دہلی 17

اردو زبان و ادب کی ان دنوں ہریانہ خوب خدمت کر رہا ہے، بھلے ہی پنجاب نے اردو کے ارتقائی سفر کے نام پر اردو کی خدمت بہت کی ہو مگر ہریانہ بھی کم نہیں ہے۔ صوبہ ہریانہ میں بالخصوص پانی پت کو ادب اور ثقافت کی تاریخ میں ایک ممتاز مقام حاصل اس لیے بھی ہے کہ یہ شہر میر مہدی مجروح، الطاف حسین حالی، اور وحید الدین سلیم جیسی بلند قامت ادبی شخصیتوں کا وطن رہا ہے۔ ان بزرگوں نے اردو ادب کی جو شمع روشن کی تھی

آج ڈاکٹر کمار پانی پتی بحیثیت اردو دوست شاعر اپنے فکر و فن سے ضیاء بار بنائے ہوئے ہیں۔ کمار پانی پتی کی غزل گوئی نے صحت مند کلاسیکی روایات کی پاسداری کے ساتھ جدید رجحانات کی روشنی اور عصری حسیت کی تمازت سے اپنے شعری نگار خانہ کو تب و تاب عطا کی ہے، یہی خوبی آپ کی نظموں میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے، زندگی جینے کے ساتھ احترام آدمیت کے فروغ کی کوشش کمار کا اہم مقصد ہے۔ غزلوں میں شکایتی لہجہ بلاخیزی پیدا کیے ہوئے ہے۔

اپنی دھرتی پہ اب، اپنے ہی ملک میں   کوئی اپنا نہیں، وقت کی بات ہے
اپنے احساس کے کھیتوں میں اگا لے پتھر   جس کو جینا ہے وہ ہاتھوں میں اٹھا لے پتھر
اب خون کی ہر بوند میں گرماؤ بہت ہے   ہر چند کہ اب رشتوں میں بکھراؤ بہت ہے
تعصب ہی تعصب ہے ترے الفاظ میں پھر بھی   ترے اخبار سے ہم نے کبھی رشتہ نہیں توڑا

ڈاکٹر کمار پانی پتی ان اردو دوستوں میں شمار کیے جاتے ہیں جو تقسیم کے بعد پاکستان سے وارد ہوئے، یہی وجہ ہے کمار پانی پتی کو اردو کی ان دونوں اصناف سخن پر ملکہ حاصل ہے۔ اپنے لہجے پر مکمل اعتماد کے باعث ہی تمنا کے حوصلوں کے آگے دشوار گزار راہوں یا بے بسی اور خواب کے شرمندۂ تعبیر ہونے کی امیدیں کمار پانی پتی نے ختم نہیں کی ہیں۔ متحدہ قومیت کے لیے لازمی سمجھے جانے والے افکار کو غزل کے شعروں میں ڈھالنے کی جو بڑی خوبی کمار پانی پتی کے یہاں ملتی ہے وہ کم ہوتی جا رہی ہے۔

عزم محکم اگر ساتھ دیتا   آندھیوں میں دیے ہم جلاتے
قوم ہے گامزن ترقی پر   اور بجٹ میں ہیں گھاٹے ہی گھاٹے
کروں بھی تو میں اعتبار اس پہ کیوں کر   مرا رہنما تو ہے جھوٹا جہاں کا

عزم و ہمت سے کام لینے کی وکالت کرتی ہوئی یہ شاعری شخصیت کے ٹوٹنے بکھرنے کے عمل سے بے خطر ہو کر آگے بڑھنے کا درس دیتی ہے۔ اس لیے میرا خیال ہے کمار پانی پتی کی شاعری بڑی شاعری کے درجے میں رکھے جانے کے قابل ہے۔ ڈاکٹر جی آر کنول نے بیک کوور پر بیباک انداز میں لکھا ہے کہ اس شاعری کو آج سے کئی دہائیوں پہلے شائع ہو جانا چاہیے تھا، خیر وقت ہوتا ہے ہر کام کا۔

ذات کی تفہیم اور کائنات کی تفہیم دو معنی نہیں رکھتی، بلکہ کائنات کا وجود اور اس کے تعلق سے جو بھی انکشافات شاعر نے اپنے تجربات و مشاہدات اور محسوسات کے ساتھ کیے ان میں صنعتِ تعلیق کا بھی استعمال سامنے آتا ہے، اور تجنیس کا بھی۔

نرالا ہے ہمارے عہد میں طرزِ عمل سب کا
کسی پُل کو اڑا دینا کسی کا گھر جلا دینا
نہ تھا جب ہم پہ خود غرضی کا سایا
ہمارے سر کہیں پر خم نہیں تھے

فلیپ کوور پر ظفر عباس قریشی بزم حالی جھنگ صدر، پاکستان کی مختصر لیکن جامع تحریر ہے۔ دوسرے جانب کوور پر اردو دوست ادیب ڈاکٹر ہیرا لال چوپڑا کا فرمایا ہوا نقل کیا گیا ہے۔

کمار پانی پتی کے شعری مجموعے میں جن مشاہیر کی پسند بھر اظہار یے ہیں ان میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر جاوید وششٹ، ساحر ہوشیار پوری، صابر ابوہری، ڈاکٹر زار علامی، اور کشمیری لال ذاکر شامل ہیں۔ ظفر عباس قریشی فرماتے ہیں کہ: کمار ایک ایسے حسین معاشرہ کا خواب دیکھ رہے ہیں، جہاں رنگ و نسل، مذہب اور دھرم زبان اور علاقائی تعصبات موجود نہ ہوں اور کرۂ ارض پر بسنے والے ہر انسان کے لیے محبت اور باہمی احترام کے جذبات رکھتا ہو۔ ڈاکٹر کمار پانی پتی نے ملک

کے حالات پر نظر رکھنے کے ساتھ ہمسایوں کی بھی خبر رکھی ہے، اس طرح ایک ذی شعور شخص ہونے کے ناطے پڑوس کی سیاست کیا کیا گل کھلاتی ہے اس کا اظہار بھی اپنی شاعری میں بخوبی کیا ہے۔

دیش کی مہان بیٹی نربھیا (جیوتی) جو 16 دسمبر 2012 کو دہلی میں بدترین درندگی کا شکار ہوئی۔

لاج رکھنے کو ماں باپ کے حکم کی
غم کی لپٹوں پہ بھی سو گئیں بیٹیاں

معروف پاکستانی شاعر جو زندگی بھر جیلوں میں ہی سڑتا رہا!

یہ تو سر ہے حبیب جالب کا
جس نے جھکنا نہ عمر بھر سیکھا

ڈاکٹر ہیرالال چوپڑا کے مطابق تمام بنی نوع انسان کو ایک ہی خاندان کے افراد تصور کرانے کی عملی تلقین و تبلیغ کے لیے ڈاکٹر کمار پانی پتی کا نام تاریخ ادب اردو میں ہمیشہ آب و تاب کے ساتھ چمکتا رہے گا۔ آخر میں یہ کہتے ہوئے اپنی بات مکمل کرتا ہوں کہ عہد نو کی سسکیوں کا ساز ہے میری غزل کے مطالعہ نے احساس دلایا کہ ڈاکٹر کمار پانی پتی کی شاعری صرف علاقائیت پر موقوف نہیں بلکہ پوری اردو دنیا کے لیے ہے۔ ڈاکٹر کمار پانی پتی کے اس دعوے کے ساتھ اپنا کام تمام کرتا ہوں کہ

جو جدید اسلوب کو دے گی روایت کا شعور
اس نئی تحریک کا آغاز ہے میری غزل!

سماجیات

پیشہ ورانہ سوشل ورک

مصنفین: محمد شاہد/ ابو اسامہ

صفحات: 180، قیمت: 185 روپے، اشاعت: 2019

ناشر: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مبصر: محمد پرویز عالم، ریسرچ اسکالر، شعبۂ سوشل ورک، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد 500032 تلنگانہ

ہندوستان میں سوشل ورک کی تعلیم اور تربیت کے لیے متعدد ادارے قائم ہیں۔ اس کا شمار عصر حاضر کے تیزی سے ابھرنے والے پیشوں اور ڈسپلن میں ہوتا ہے جس کے ذریعے سماجی خدمات بھی انجام دی جاتی ہیں اور جو حصول روزگار کے بھی وافر مواقع مہیا کراتا ہے۔ سماجی علوم کے دیگر مضامین کے مقابلے اس مضمون کی مانگ آج کل بہت زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں داخلہ لینے والے طلبہ کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ انگریزی میں تو اس مضمون کے مختلف پہلوؤں پر ڈھیروں کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اردو کا دامن اس سے یکسر خالی ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو ونیورسٹی کے سوشل ورک شعبے کے اساتذہ پروفیسر محمد شاہد اور جناب ابو اسامہ قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے وقت کی اہم ضرورت کو سمجھتے ہوئے سوشل ورک کی درسی کتاب بہ عنوان 'پیشہ ورانہ سوشل ورک' تحریر کی۔ یونیورسٹی کے ارباب اختیار بھی قابل ستائش ہیں جنھوں نے اس کام کی اہمیت کو سمجھا اور اس کتاب کی اشاعت کی ذمہ داری قبول کی۔

یہ کتاب نہ صرف سوشل ورک کے طلبہ و طالبات کے لیے نہایت مفید ہے بلکہ اساتذہ اور سوشل ورک پیشے سے وابستہ تمام افراد کے لیے حوالہ جاتی حیثیت رکھتی ہے۔ 'پیشہ ورانہ سوشل ورک' میں اس مضمون اور پیشے سے متعلق تمام اہم امور کا احاطہ مختصر اور جامع انداز میں کیا گیا ہے۔ یہ کتاب سوشل ورک سے متعلق کئی غلط فہمیوں کا بھی ازالہ کرتی ہے۔ مثلاً عام طور سے سماجی خدمت کرنے والے ہر شخص کو سوشل ورکر سمجھا جاتا ہے لیکن اصل معنی میں سوشل ورکر وہ ہے جس نے باقاعدہ اس کی تربیت حاصل کی ہو اور جو سماجی خدمت کا کام سوشل ورک کے اصول و نظریات کی روشنی میں انجام دیتا ہو۔ مصنفین کے لفظوں میں ''سوشل ورک ایک پیشہ ورانہ عمل ہے جس کے لیے خصوصی تعلیم و تربیت لازمی ہے۔''

دس ابواب پر مشتمل اس کتاب کے پہلے باب ''سوشل ورک کا تعارف'' میں سوشل ورک کی تعریف، اصول، مقاصد، اہداف اور اس کے افعال پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس ضمن میں کسی فرد یا گروہ یا کمیونٹی کے مسائل کے پائیدار حل کے لیے سوشل ورک ماہرین کے ذریعے اختیار کیے جانے والے مختلف طریقۂ کار کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔ سوشل ورک انسانی وقار، تکثیریت یا رنگا رنگی کا احترام، انسانی حقوق کی بازیابی اور ایک ایسے منصفانہ سماجی نظام کی تشکیل کے لیے کام کرتا ہے جس میں ہر انسان کو مکمل آزادی حاصل ہو اور کسی کے ساتھ کسی قسم کی ناانصافی نہ ہو۔ اس باب میں سوشل ورک کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ سوشل ورک مخصوص علم، مہارتوں اور اقدار پر مبنی ایک علمی مضمون اور عملی پیشہ ہے جس میں عوام کی آسودگی کے فروغ کے لیے کام کیا جاتا ہے۔ یہ سماجی بدلاؤ اور ترقی، سماجی ہم آہنگی، عوامی بااختیاری اور آزادی کے فروغ کے لیے کام کرتا ہے۔

دوسرے باب 'انگلینڈ، امریکہ اور ہندوستان میں سوشل ورک کا آغاز و ارتقا' میں اس مخصوص علمی مضمون اور پیشے کی تاریخ اور سوشل ورک کے اہم مفکرین کی خدمات سے واقف کرایا گیا ہے۔ تیسرے باب میں پیشہ ورانہ سوشل ورک سے متعلق مختلف مباحث کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ابراہم فلیکسنر اور ارنسٹ گرین ووڈ جیسے مفکرین کے استدلال کی روشنی میں اس سوال پر بھی غور کیا گیا ہے کہ دیگر پیشوں کی طرح کیا سوشل ورک بھی ایک پیشہ ہے؟ ہر پیشے کی کچھ مخصوص اقدار ہوتی ہیں جن کی پاسداری اس سے وابستہ افراد کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ اس کے بغیر اس پیشے سے کماحقہٗ انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کی عزت اور وقار کی پاسداری، تنوع کا احترام، سماجی انصاف، انسانی حقوق، اخلاقی بلندی اور خدمت سوشل ورک کی مخصوص اقدار ہیں جن سے کتاب کے چوتھے باب میں روشناس کرایا گیا ہے۔

پانچویں باب میں سوشل ورک کے بنیادی اصولوں سے متعارف کرایا گیا ہے جن کی تفہیم کے ذریعے سوشل ورکر کو انسانی رشتوں کی حرکیات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان اصولوں کی مدد سے وہ کلائنٹ یا مؤکل کے ساتھ زیادہ بہتر اور بھروسے کا رشتہ بنا کر اس کی بہتر معاونت کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

چھٹے باب 'سوشل ورکرز کے لیے ضابطۂ اخلاق' کے تحت ان اصول و ضوابط پر روشنی ڈالی گئی ہے جن پر عمل کیے بغیر سوشل ورکر سماجی خدمت کی ذمہ داری بخوبی نبھانے سے قاصر رہتا ہے۔

سماجی و معاشرتی بدلاؤ میں سماجی و مذہبی اصلاحی تحریکیں نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔ سوشل ورکر بھی ایک بہتر سماج کی تشکیل کے لیے سماجی بدلاؤ کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ مختلف سماجی اور مذہبی اصلاحی تحریکوں کے پس منظر، آغاز و ارتقا اور اثرات سے واقف ہو۔ کتاب کے ساتویں باب میں ہندوستان کی اہم سماجی و مذہبی

اصلاحی تحریکوں مثلاً برہمو سماج، پرارتھنا سماج، آریہ سماج، رام کرشن مشن، تھیوسوفیکل سوسائٹی، علی گڑھ تحریک وغیرہ سے مختصر طور پر واقف کرایا گیا ہے۔

کتاب کے آٹھویں باب میں مختلف ماہرین اور مفکرین کے نظریات سے بحث کی گئی ہے۔نویں باب کا عنوان 'سوشل ورک اور انسانی حقوق' ہے۔اس میں مختلف قسم کے انسانی حقوق، اقوام متحدہ کی جانب سے اس موضوع پر وقتاً فوقتاً جاری ہونے والے دستاویزات اور انسانی حقوق کی بازیابی یا بحالی کے لیے سوشل ورکر کی ذمے داریوں سے آگاہ کیا گیا ہے۔کتاب کے آخری باب میں استدلالی انداز میں اس امر پر نظریاتی بحث کی گئی ہے کہ سوشل ورک آرٹ ہے یا سائنس۔

کتاب کو مزید وقیع اور افادی بنانے کے لیے اس کے ہر باب کے آخر میں اہم اصطلاحات کی تعریف، حوالہ جات، خلاصہ اور اہم سوالات درج کیے گئے ہیں۔کتاب کے آخر میں ایک تفصیلی فرہنگ بھی دی گئی ہے تاکہ قارئین بہ آسانی انگریزی اصطلاحات اور ان کے اردو متبادل سے واقف ہوسکیں۔اس میں اگر اشاریہ بھی شامل کر لیا جاتا تو کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہو جاتا۔مختلف امور کی وضاحت کے لیے چارٹوں اور جدولوں سے بھی کام لیا گیا ہے تاکہ طلبہ بہ آسانی ان کی تفہیم کرسکیں۔آسان زبان، منطقی اور استدلالی انداز، معروضیت، وضاحت اور قطعیت اس کتاب کی ایسی خوبیاں ہیں جن کی بدولت طلبہ وطالبات سوشل ورک کے بنیادی خدوخال سے آگاہ ہو جائیں گے۔ امید ہے کہ 'پیشہ ورانہ سوشل ورک' ماہرین سوشل ورک کے ساتھ عام قارئین کو بھی پسند آئے گی اور اس موضوع پر مزید کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوگا۔

رسائل و جرائد

شمع حیات (اردو میگزین)

مدیر: ڈاکٹر شاہینہ تبسم
صفحات: 283، سنہ اشاعت 2016-17
ناشر: ذاکر حسین دہلی کالج شبینہ، دہلی یونیورسٹی
مبصر: ڈاکٹر عبدالرحمٰن جمال الدین،
شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زیر نظر شمارہ 'شمع حیات' ڈاکٹر ذاکر حسین دہلی کالج (شبینہ) کے تعلیمی سال 2016 – 2017 کی سالانہ میگزین ہے جو کالج کے طلبہ و اساتذہ کی قلمی صلاحیتوں کو جلا بخشنے کے لیے شائع ہورہی ہے۔اس میں تحقیقی وتنقیدی مضامین کے علاوہ منظوم منثور تخلیقات بھی شامل ہیں۔یوں تو اس میں شامل تمام مضامین ہی بہت اہم اور لائق مطالعہ ہیں لیکن ان میں کچھ ایسے مضامین ہیں جن کا مطالعہ ایک سنجیدہ قاری کے لیے ناگزیر ہو جاتا ہے۔انھیں میں سے پروفیسر صادق صاحب کا مضمون 'اقبال کے چند شخصیاتی معروضی تلازمے' اقبال شناسی میں نہ صرف ایک اہم اضافہ ہے بلکہ اس میں اقبال فہمی کا ایک نیا گوشہ بھی قاری کے سامنے آتا ہے۔اس میں مضمون نگار نے کلام اقبال میں مستعمل تلمیحات کے آئینے میں اقبال کی انقلابی فکر کو پیش کیا ہے۔مضمون کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ تلازمے کی مدد سے شاعر اپنے ضمیر کی ترجمانی کس طرح کرسکتا ہے۔

پروفیسر ابن کنول کا مضمون 'غیر افسانوی نثری اصناف کی قدر و قیمت' کئی اعتبار سے اہم اور قابل مطالعہ ہے۔اس میں نہ صرف غیر افسانوی نثر کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے بلکہ موجودہ دور میں اس کی اہمیت وضرورت کو بھی پیش کیا گیا ہے۔اسی طرح ڈاکٹر ظہیر رحمتی کا مضمون 'اردو کی نئی شعری ہیئتیں یا اصناف ایک محاکمہ' میں نظم کی ان جدید ہیئتوں سے متعارف کرایا گیا ہے جو 1857 کے بعد اردو شاعری میں مغربی اور دیگر مشرقی تہذیبوں کے اثر سے معرض وجود میں آئیں۔اس کے علاوہ ریختی اور کربلائی مرثیے کی طرح اردو کی بارہ ایسی ہیئتوں سے بحث کی گئی ہے، جن کو بعض ناقدین صنف کہنے کے قائل ہیں۔مثلاً آزاد رباعی، اینٹی غزل، دوہا غزل، ذین غزل، نثری غزل وغیرہ۔

ڈاکٹر ریحانہ نکہت کا مضمون 'اردو افسانہ: فسادات کے زیر اثر' تقسیم ہند کے زیر اثر لکھے جانے والے افسانوں کے حوالے سے ایک جامع مضمون ہے جس میں اس دور کے افسانوں کو تین زمروں میں رکھ کر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، پہلے زمرے میں ان افسانوں کو رکھا گیا ہے جن میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا برملا اظہار کیا گیا ہے۔دوسرے زمرے میں ان افسانوں کو رکھا گیا ہے جن میں درندہ صفت لوگوں کے انحطاط وپستی کو بیان کیا گیا ہے اور تیسرے زمرے میں ان افسانوں کو رکھ کر بحث کی گئی ہے جن میں انسان دوستی کے دعویدار افسانہ نگاروں نے دونوں ہی فرقے کو برابر کا قصوروار قرار دیا ہے۔اس مضمون میں تقسیم ملک کی وجہ سے رونما ہونے والے فسادات سے ادیبوں پر جو اثرات مرتسم ہوئے اس کی بہت عمدہ ترجمانی کی گئی ہے۔

ڈاکٹر عطیہ رئیس کے مضمون 'بانگ درا کی نظمیں: ایک تاثر' اقبال فہمی کے حوالے سے اہم ہے اس میں مصنفہ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بانگ درا کی نظموں میں 'شمع وشاعر اور خضر راہ' کو فکر وفن اور اسلوب کے اعتبار سے باقی کی تمام نظموں پر فوقیت حاصل ہے۔اور صرف انھیں دو نظموں کی بنیاد پر ہم اقبال کو دنیا کے بڑے شعرا کی صف میں رکھ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر خالد اشرف کا مضمون 'منٹو کا نظریہ ادب'، پروفیسر مولا بخش کا 'خواجہ احمد عباس کا افسانہ بابل'، ڈاکٹر ابوبکر عباد کا 'عصمت افسانہ اور قاری'، ڈاکٹر مہتاب جہاں کا 'انشاء اور دریائے لطافت'، ڈاکٹر جعفر احراری کا 'اردو طنز ومزاح میں رشید احمد صدیقی'، ڈاکٹر امتیاز احمد کا 'پنچ تنتر کی عصری معنویت'، ڈاکٹر شاہ عالم کا 'فیض احمد فیض کی نظم نگاری'، ڈاکٹر مظفر رضا کا 'شبلی: مہدی افادی کی نظر میں' وغیرہ قابل ذکر اور اردو زبان وادب کے باب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔بچوں کے تخلیقی مضامین اپنے پلاٹ، کردار، مکالمہ اور منظر کشی کے اعتبار سے عمدہ اور حالاتِ حاضرہ کے بہترین ترجمان نظر آتے ہیں۔کہیں کہیں عبارت اور طرز بیان کی کمی کھٹکتی ہے۔

مجموعی طور پر زیر نظر رسالہ اپنے مشمولات کے تنوع کی بنا پر حد درجہ اہم اور قابل قدر ہے۔اس میں اردو ادب کے ان گوشوں کو ابھارا اور پیش کیا گیا ہے جن تک ابتدائی دور کے طلبا کی رسائی ناگزیر ہے۔سارے مضامین مختصر ہونے کے باوجود پر مغز اور جامع ہیں۔اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس یہ رسالہ اپنی افادیت کی کے اعتبار سے انتہائی اہم رسالہ ہے جسے یوں ہی مسلسل جاری رہنا چاہیے۔

■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبرنامہ

یوگا ہندوستانی تہذیب و روایت کا اہم حصہ ہے: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

نئی دہلی: یوگا ہندوستانی تہذیب اور روایت کا ایک اہم حصہ ہے۔ یوگا کو اگر روزمرہ کی زندگی کا جز بنالیا جائے تو اس سے نہ صرف جسمانی بیماریوں سے نجات ملے گی بلکہ روحانی سکون بھی حاصل ہوگا۔ یوگا پرم آنند کا سب سے بہترین ذریعہ ہے۔ اس سے ہمیں جسمانی اور روحانی توانائی حاصل ہوتی ہے۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے بین الاقوامی عالمی یوم یوگا کے موقعے پر یوگا کراتے ہوئے کہیں۔ حسب روایت اس سال بھی صدر دفتر میں بین الاقوامی یوم یوگا کا انعقاد کیا گیا جس میں قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر شاہد اختر کے علاوہ جملہ اسٹاف نے شرکت کی۔ ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے اس موقعے پر نہ صرف یوگا کے فوائد پر جامع گفتگو کی بلکہ ایک انسٹرکٹر کی حیثیت سے انھوں نے عملی طور پر بہت سے آسن بھی بتائے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہمارے ہردلعزیز عزت مآب وزیراعظم جناب نریندر مودی نے ہندوستانی عوام کو صحت کے تئیں بیدار رہنے کے لیے یوگا کو نہ صرف ہندوستان میں متعارف کرایا بلکہ پوری دنیا میں متعارف کرانے کا شرف بھی انھیں حاصل ہے اور دنیا یوگا کی اہمیت کو تسلیم کرچکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج عالمی سطح پر 21 جون کو یومِ یوگا کے طور پر منایا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں یوگا کو مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ جسمانی ورزش کے طور پر دیکھنے کی ضرورت ہے تاہم یوگا کا رشتہ روحانیت سے بھی ہے اور روحانیت کا تصور ہر مذہب میں موجود ہے۔ انھوں نے کہا کہ عہد حاضر میں جس قدر تیزی کے ساتھ مختلف قسم کی بیماریاں سامنے آرہی ہیں، ان سے تحفظ کے لیے پابندی سے یوگا کرنے کی ضرورت ہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 21 جون 2019

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں اردو ادب پینل کی میٹنگ

نئی دھلی: قومی کونسل معیاری اور غیر معمولی اہمیت کی حامل کلاسیکی کتابوں کو ترجیحی طور پر شائع کرے گی جن کی عدم موجودگی کے سبب نہ صرف طلبا بلکہ اساتذہ کو بھی

پریشانیوں کا سامنا ہوتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے صدر دفتر میں منعقدہ اردو ادب پینل کی میٹنگ میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ کونسل نہ صرف مشاہیر ادبا و مصنفین کی کتابوں کو شائع کرے گی بلکہ نئے قلمکاروں کی تخلیقات وتصنیفات کی اشاعت پر بھی توجہ دے گی۔ انھوں نے یوسف سرمست کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یوسف سرمست ایک ہمہ جہت شخصیت تھے اور ادب میں ان کا بڑا مقام تھا، ان کے انتقال کے بعد اردو ادب میں یقیناً خلا پیدا ہوگیا ہے، جو آسانی سے پُر نہیں کیا جاسکتا۔ اس موقع پر تمام ممبران نے دو منٹ کی خاموشی اختیار کرکے یوسف سرمست کو خراج تحسین پیش کیا۔ واضح رہے کہ اردو ادب پینل کی یہ میٹنگ کمیٹی کے تشکیل نہ ہونے کے سبب تاخیر سے منعقد کی گئی۔

موجودہ مالی سال میں کونسل کے ذریعہ دس سے زیادہ کتابوں کی اشاعت پر تمام ممبران نے تشفی کا اظہار کیا اور کہا کہ اس سمت میں مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ میٹنگ کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر مظفر شہ میری نے کہا کہ آج کی میٹنگ میں کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں کئی اہم فیصلے لیے گئے اور کئی تجاویز کو متفقہ طور پر منظوری دی گئی۔ پروفیسر ظفرالدین نے کہا کہ ڈاکٹر شیخ عقیل جیسے فعال ومتحرک ڈائرکٹر کی رہنمائی میں کتابوں کی اشاعت میں یقیناً تیزی آئے گی اور تقاضائے وقت کو مدنظر رکھتے ہوئے اشاعت کے لیے اچھے موضوعات کا انتخاب کیا جائے گا۔ ڈاکٹر نریش ندیم نے کہا کہ ہمیں ایسے تخلیق کاروں کو پہچاننے کی ضرورت ہے جو مقررہ وقت پر مسودات کو حتمی شکل دے سکیں۔

میٹنگ میں شامل جن ادیبوں ومصنفوں نے شرکت کی، ان میں ڈاکٹر نریش ندیم، پروفیسر ظفرالدین، پروفیسر قاضی حبیب احمد، پروفیسر شبنم حمید، ڈاکٹر قدسیہ قریشی، ڈاکٹر نکولن کنڈوتھ ولپل، جناب ساجد علی سیفی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ اکیڈمک اسسٹنٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر ڈاکٹر فیروز عالم، جناب محمد انصر اور ڈاکٹر شاہد اختر نے بھی میٹنگ میں شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 26 جون 2019

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں سوشل سائنس پینل کی میٹنگ

نئی دھلی: قومی اردو کونسل گذشتہ کچھ دہائیوں سے ادب و شاعری، سماجیات، معاشیات، اقتصادیات کے علاوہ ماحولیات پر ایسی کتابوں کی اشاعت کررہی ہے جو طلبا اور طالبات کے مسابقتی امتحانات میں مفید و مددگار ثابت ہورہی ہیں۔ آج کے مسابقتی دور یا ماحول میں ایسی کتابوں کی اہمیت اور معنویت اور بڑھ جاتی ہے۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے صدر دفتر میں منعقدہ سوشل سائنس پینل کی میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ حالیہ دنوں میں اردو میڈیم سے پڑھنے والے بچے نہ صرف اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئے ہیں بلکہ ملکی سطح پر مسابقتی امتحانات میں بہتر کارکردگی کا ثبوت بھی پیش کررہے ہیں۔ انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ ان کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ قارئین تک یہ کتابیں کیسے پہنچیں ہمیں اس سمت میں

بھی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس حوالے سے مانو کے ڈائرکٹر سے ہماری بات ہوئی ہے کہ وہ ہمیں سیل سیکشن کھولنے کے لیے جگہ فراہم کریں، ساتھ ہی ہم نے جموں کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے بھی اس تعلق سے بات کی ہے۔ امید ہے کہ آنے والے کچھ مہینوں میں اس میں پیش رفت ہوگی۔ میٹنگ کی صدارت پروفیسر رئیس اختر نے کی۔ انھوں نے کہا کہ قومی اردو کونسل ایسی کتابوں کو شائع کرے جو طلبا کے نصاب کو پورا کرنے میں کسی حد تک مددگار ہو۔ اکثر طلبا یو پی ایس سی یا ریاستی مسابقتی امتحان میں انگریزی کتابوں کا حوالہ دیتے ہیں، دراصل یہ پریشانیاں اردو میں ایسی کتابوں کی عدم موجودگی کے سبب ہورہی ہیں۔ ہمیں اس سمت میں مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ میٹنگ میں کئی اہم فیصلے لیے گئے اور کئی نئی تجاویز کو منظوری دی گئی۔ اس موقعے پر پروفیسر رضوان قیصر نے کہا کہ سماجی علوم پر ایسی کتابوں کا انتخاب کیا جائے جن سے جامعات کے علاوہ طلبا اور طالبات بھی فائدہ اٹھا سکیں۔ جناب نریش ندیم نے کہا کہ مجھے خوشی ہورہی ہے کہ ادب اور تنقید کے دائرے سے باہر ہوکر قومی اردو کونسل سائنس اور سماجی علوم میں اچھی کتابوں کو منظر عام پر لارہی ہے اور اس کے زیر اہتمام کئی اہم کلاسیکی کتابوں کے اردو ترجمے بھی ہوئے ہیں جو قومی اردو کونسل کے لیے یقیناً خوش آئند بات ہے۔ محترمہ عذرا عابدی نے کہا کہ ابھی بھی دیگر زبانوں میں ایسی ایسی نایاب کتابیں موجود ہیں جو دور حاضر کے تقاضوں کو بخوبی پورا کررہی ہیں، ہمیں ان کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرانے کی ضرورت ہے۔

میٹنگ میں شامل جن ادیبوں ومصنفوں نے شرکت کی، ان میں پروفیسر مجیب اشرف، پروفیسر رئیس اختر، پروفیسر رضوان قیصر، جناب نریش ندیم، ڈاکٹر عذرا عابدی، ڈاکٹر ایم داؤد محسن، ڈاکٹر مظفر اسلام، محترمہ انجلی سنگھ کے علاوہ کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر ڈاکٹر فیروز عالم، جناب محمد شہاب الدین اور ڈاکٹر شاہد اختر نے بھی میٹنگ میں شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 4 جولائی 2019

قومی کونسل کے صدر دفتر میں نیچرل سائنس پینل کی میٹنگ

نئی دهلی: سائنس نے زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کی رفتار کو تیز کیا ہے۔ آج اگر زندگی کو بہتر طور پر گزارنے کے لیے ڈھیر ساری مصنوعات وایجادات کا انبار لگا ہوا ہے تو اس میں بنیادی کردار سائنس کا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ سائنسی مواد ہر ہندوستانی زبان میں دستیاب ہو، تا کہ ہر شخص سائنس سے فائدہ حاصل کر سکے، لیکن المیہ یہ ہے کہ اردو میں

سائنسی موضوعات پر تشفی بخش مواد کی کمی نظر آتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ 'نیچرل سائنس پینل میٹنگ' میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو میں زیادہ سے زیادہ سائنسی مواد جمع کرنے کے لیے قومی کونسل کا 'نیچرل سائنس پینل' گزشتہ کئی برسوں سے کام کر رہا ہے جس کے تحت حال ہی میں درجنوں اہم سائنسی کتابیں شائع کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں آب وہوا، پیڑ پودے، جسم وصحت، موسم وغیرہ پر بھی کونسل کی جانب سے کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے مزید کہا کہ یہ پینل ان تمام سائنسی موضوعات پر کتابوں کی اشاعت کو یقینی بنائے گا، جن کی انسانی سماج کو ضرورت ہے۔

اس موقعے پر معروف کینسر اسپیشلسٹ ڈاکٹر ماجد احمد تالی کوٹی نے سائنس کے میدان میں کونسل کے کاموں کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ الگ الگ شعبوں سے سماجی ضروریات وموضوعات کو مزید تلاش کر کے ان پر باضابطہ اور مستحکم کام کیا جائے اور اس کام کی رفتار کو بڑھایا جائے۔ انھوں نے صحت سے متعلق کتابوں کی اشاعت پر بھی زور دیا، خاص طور پر کینسر جیسے مہلک مرض سے آگہی کے لیے بیداری لانے والی کتابوں کی تالیف وتصنیف اور اشاعت کی تجویز رکھی۔ پروفیسر رئیس الدین نے سائنس پر اردو میں لکھی جانے والی کتابوں کے حوالے سے کہا کہ اردو میں سائنسی کتب کی تصنیف وترتیب کے لیے اردو کے اساتذہ کی ورکشاپ کرائی جائے تا کہ طلبا کے لیے لکھی گئی کتابیں مفید و موثر ثابت ہوں۔ انھوں نے کہا کہ جو کتابیں بھی شائع ہوں ان میں اس بات کی نشاندہی کی جائے کہ وہ قارئین کے کس طبقے کے لیے لکھی گئی ہیں۔ اردو میں سائنٹفک ٹرم کی ڈکشنری کے کونسل کے منصوبے کی پروفیسر رئیس الدین نے تائید کی اور کہا کہ یہ کام ترجیحی طور پر کیا جانا چاہیے۔ پروفیسر اسد اللہ نے ماحولیاتی تبدیلی سے متعلق کتابوں کی اشاعت پر زور دیا۔ ڈاکٹر عزیر عزیز نے کہا کہ سماجی ضروریات کی تکمیل کے لیے کتابوں کی تصنیف وتالیف کا کام اس طرح ہو کہ اردو زبان کی ترویج واشاعت کا مقصد بھی پیش نظر رہے۔ نیچرل سائنس پینل کی میٹنگ میں ماحولیاتی، آبی، اور اینٹی بایوٹک جیسے موضوعات پر کام کی تجاویز بھی سامنے آئیں۔ آخر میں کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے میٹنگ میں شامل تمام ماہرین اور شرکا، کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 9 جولائی 2019

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں مذہب وثقافت پینل کی میٹنگ

نئی دهلی: مذہب اور ثقافت کی تفہیم آج کے ہندوستان کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ اسی مناسبت سے کونسل کچھ ایسی کلاسیکی کتابوں کا ترجمہ اردو میں کرانا چاہتی ہے جن کے ذریعے ملک کی مختلف ثقافتوں اور مذاہب کو سمجھا جا سکے۔ اس حوالے سے دارا شکوہ کی 'مجمع البحرین'، 'سکینۃ الاولیا' اور 'سر اکبر' خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔ دارا شکوہ برصغیر کی تاریخ میں ایک منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ انھوں نے سنسکرت کے باون اپنشدوں کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے صدر دفتر میں منعقدہ مذہب وثقافت پینل کی میٹنگ میں کیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ایسی کتابوں کی اشاعت سے معاشرے کے اندر منافرت کو کم کرنے میں مدد ملے گی اور دوریاں

نزدیکی میں تبدیل ہوں گی۔ آج کی میٹنگ کی صدارت معروف دانشور اور ماہر اسلامیات ومولانا آزاد یونیورسٹی جودھپور کے صدر پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے کی۔ انھوں نے کہا کہ رواں سال گرونانک دیوجی کا 550 واں یوم پیدائش منایا جا رہا ہے۔ ایسی صورت میں کونسل گرونانک دیو پر لکھی گئیں منظوم اور منثور کتابوں کو اردو میں ترجمہ کر کے مقدمہ کے ساتھ شائع کرے تو یہ ان کے لیے بہترین خراج عقیدت ہوگا۔ انھوں نے مزید کہا کہ آج کے معاشرے میں انسان جس جذباتی بحران کا شکار ہے اور دن بہ دن جو دوریاں بڑھتی جا رہی ہیں، انھیں دور کرنے کی یہ ایک اچھی پہل ہوگی۔

اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے وائس چیرمین پروفیسر شاہد اختر نے کہا کہ آج کے بدلتے حالات میں صوفی ازم کے تصور کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں اس کی واضح مثال ملتی ہے کہ جب جب معاشرے میں اختلافات، تعصبات اور برائیوں کا دور دورہ ہوا، صوفیا نے اپنے کردار اور تعلیمات سے معاشرے کی اصلاح کا کام کیا اور امن وبھائی چارے کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

میٹنگ میں جن ادیبوں اور مصنفوں نے شرکت کی، ان میں پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر شاہد اختر، پروفیسر زینت شوکت علی، پروفیسر رمیش بھاردواج، پروفیسر سید شاہ حسین، ڈاکٹر مفتی زاہد علی خاں، مولانا مبارک حسین مصباحی، ڈاکٹر مشتاق تجاروی، ڈاکٹر شبیر حسین، جناب اقبال انصاری کے علاوہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر اکیڈمک ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، ایجوکیشن آفیسر ڈاکٹر فیروز عالم، محترمہ آبگینہ عارف اور ڈاکٹر شاہد اختر انصاری شامل تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 10 جولائی 2019

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جشن صد سالہ منصوبے پر صدر جمہوریہ کا اظہارِ مسرت

نئی دهلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کی وائس چانسلر پروفیسر نجمہ اختر نے صدر جمہوریہ ہند رام ناتھ کووند سے ملاقات کی اور یونیورسٹی میں ان کی جانب سے تعلیمی اور تحقیقاتی

سرگرمیاں جواب تک انجام دی گئی ہیں، انھیں واقف کرایا۔ انھوں نے صدر جمہوریہ سے ملاقات کے بعد کہا کہ وہ جامعہ کے تئیں کافی ہمدردی رکھتے ہیں اور اس کی زیادہ سے زیادہ ترقی کے لیے انھوں نے کئی بہترین مشورے بھی دیے۔ انھوں نے امسال کے اخیر میں ہونے جارہے کانووکیشن پروگرام کے لیے صدر جمہوریہ کو مدعو بھی کیا۔

اس موقعے پر پروفیسر نجمہ اختر نے صدر جمہوریہ کو جو یونیورسٹی کے وزیٹر بھی ہیں یونیورسٹی کے بنیادی ڈھانچے کو اپ گریڈ کرنے کے لیے ان کی جانب سے کیے گئے اقدامات کا بھی ذکر کیا۔ ساتھ ہی کام کرنے کے لیے اسپیشل گرانٹ کی جانب بھی ان کی توجہ مبذول کرائی جس میں انھوں نے ایک میڈیکل کالج کے قیام کی بات رکھی جس کی زمین اتر پردیش حکومت سے حاصل ہوسکتی ہے۔ اس موقعے پر بات چیت کے دوران، نجمہ اختر نے صدر جمہوریہ سے یونیورسٹی کے بنیادی ڈھانچے کو مزید بہتر کرنے اور آئندہ سال یونیورسٹی کے گولڈن جبلی پروگرام کے لیے خصوصی فنڈز کی ضرورت کے لیے توجہ کی درخواست کی۔ آئندہ سال جامعہ کے سو سال مکمل ہونے پر منعقد ہونے والے صد سالہ جشن منصوبہ پر بھی صدر جمہوریہ نے مسرت کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 2 جولائی 2019

تمام ہندوستانی زبانوں کا احترام کیا جائے گا: رمیش پوکھریال نشنک

نئی دهلی: لوک سبھا میں سوال کے دوران ایک ضمنی سوال کے جواب میں انسانی وسائل کی ترقی کے وزیر رمیش پوکھریال نشنک نے کہا "حکومت تمام ہندوستانی زبانوں کو بااختیار بنانے کے لیے کام کررہی ہے۔ تمام ہندوستانی زبانوں کا ہر حال میں احترام کیا جائے گا۔" آل انڈیا مجلس اتحاد المسلمین کے اسدالدین اویسی نے کہا کہ وزیر نے تحریری سوال کے جواب میں نقطہ 'ڈی' میں اس کا براہ راست جواب نہیں دیا

ہے کہ کیا وہ ہندی کو تمام ریاستوں میں لازمی زبان بنانا چاہتی ہے۔ اس پر مسٹر نشنک نے کہا کہ ابھی صرف نئی تعلیمی پالیسی کا مسودہ لوگوں کی تجاویز کے لیے عام کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا "آپ پڑھیے نا اور تجاویز دیجیے، یہ صرف مسودہ ہے، حکومت کی پالیسی نہیں۔" ہندی کو لازمی بنائے جانے کے معاملے پر براہ راست جواب نہیں ملنے پر ڈی ایم کے کی کنی موجھی، ترنمول کانگریس کے رکن پارلیمنٹ اور کچھ دیگر اپوزیشن رکن بھی کھڑے ہوکر وزیر سے واضح جواب کا مطالعہ کرنے لگے۔ اس پر اسپیکر اوم برلا نے کہا کہ نئی تعلیمی پالیسی بڑا مسئلہ ہے اور اپوزیشن رکن چاہیں تو اس پر علیحدہ سے آدھے گھنٹے کی بحث کی مانگ کرسکتے ہیں۔ یہ کہہ کر انھوں نے اراکین کو چپ کرایا۔ اس سے پہلے مسٹر نشنک نے کہا کہ 32 سال کے بعد پہلی مرتبہ تعلیمی پالیسی میں تبدیلی کی جارہی ہے۔ تعلیمی پالیسی کا مسودہ ظاہر کیے جانے کے بعد سے اس پر بڑی تعداد میں تجاویز حاصل ہورہی ہیں۔ تمام تجاویز اور تبصروں پر غور کرنے کے بعد ہی حکومت تعلیمی پالیسی کو حتمی شکل دے گی۔ تین زبان فارمولے کے متعلق تحریری جواب میں کہا گیا ہے کہ یہ 1968 سے ہی قومی تعلیمی پالیسی کا حصہ رہا ہے۔ بچوں کی علمی قابلیت میں اضافہ کے لیے نئی تعلیمی پالیسی میں بھی اسے شامل کیا گیا ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 25 جون 2019

اردو اخبارات کے مسائل

نئی دهلی: سرکردہ اردو صحافیوں نے مرکزی وزیر برائے اطلاعات ونشریات پرکاش جاوڈیکر سے ملاقات کرکے انھیں اردو اخبارات وجرائد کے مسائل سے آگاہ کیا۔ گذشتہ شب نئی دہلی کے ہوٹل سوریہ میں این سی پی کے جنرل سکریٹری ڈی پی ترپاٹھی کی طرف سے دیے گئے عشائیہ میں کچھ سینئر اردو صحافیوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا تاکہ وہ مہمان خصوصی پرکاش جاوڈیکر کے ساتھ اردو اخبارات کو درپیش مسائل پر تبادلہ خیال کرسکیں۔ مرکزی وزیر نے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ انھیں دیگر ہندوستانی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان سے خاص لگاؤ ہے اور وہ فروغ انسانی وسائل کی وزارت میں رہ کر قومی اردو کونسل کے توسط سے اردو کے فروغ کی کوششوں

میں شامل رہے ہیں۔ اس موقعے پر این سی پی کے سینئر لیڈر سید جلال الدین نے مدعو صحافیوں کو وزیر محترم سے متعارف کرایا اور گفتگو کا آغاز کیا۔ اردو صحافیوں نے آل انڈیا ریڈیو دوردرشن، پی آئی بی، پبلی کیشن ڈویژن اور دیگر نشریاتی اداروں میں اردو عملے کی شدید قلت کی طرف توجہ دلائی۔ آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کے سکریٹری معصوم مرادآبادی نے کہا کہ 2016 میں نافذ کی گئی ڈی اے وی پی کی سخت پالیسی کی وجہ سے چھوٹے اور درمیانی درجے کے اخبارات کو بہت نقصان پہنچا ہے اور ان میں سے بیشتر موت وزیست کے مراحل سے دوچار ہیں۔ ادیب اور صحافی شاہد ماہلی نے کہا کہ آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن جیسے اداروں میں اردو جاننے والے نایاب ہوتے جارہے ہیں۔ اس موقعے پر سینئر صحافی اور کالم نگار سراج نقوی اور ایم ودود ساجد نے بھی اردو زبان اور اردو صحافت کو درپیش مسائل کے حل کے سلسلے میں کارآمد تجاویز پیش کیں۔ وزیر اطلاعات ونشریات نے یقین دلایا کہ وہ اردو اخبارات کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس موقعے پر گلوکارہ اور اداکارہ سلمیٰ آغا اور شاعر ملک زادہ جاوید بھی موجود تھے۔ روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 27 جون 2019

امیر خسرو پر سیمینار

نئی دھلی: شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایوان خسرو میں امیر خسرو کے 715 ویں سال وفات کے موقعے

پر یک روزہ سیمینار بعنوان 'امیر خسرو ذکر و فکر کے آئینے میں' کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کا آغاز ڈاکٹر یاسر عباس نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ سیمینار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر وہاج الدین علوی، ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لینگویجز نے انجام دی۔ جبکہ مہمان خصوصی کے طور پر پروفیسر صادق، سابق صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی موجود رہے اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر سید کلیم اصغر نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ پروفیسر وہاج الدین علوی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ امیر خسرو نے نہ سپہر میں اپنے ہندوستانی ہونے بلکہ کالی ماں کا بیٹا ہونے پر فخر کیا ہے۔ پروفیسر صادق نے کہا کہ امیر خسرو کی سب سے بڑی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے بیک وقت تین زبانوں کو اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا۔ صدر شعبۂ فارسی پروفیسر عراق رضا زیدی نے اپنے خطاب میں کہا کہ امیر خسرو ہندو آئیڈیالوجی سے واقف تھے۔ پروفیسر عبدالحلیم نے کہا کہ امیر خسرو ایک ایسی جامع اور مکمل شخصیت کا نام ہے جس کا احاطہ کرنے کے لیے ایک نہیں کئی سیمینار بھی ناکافی ہیں۔ پروفیسر شاہینہ تبسم نے کہا کہ امیر خسرو نے تقریباً پانچ ہزار اشعار کہے ہیں۔ غرۃ الکمال، مثنوی نہ سپہر اور تغلق نامہ وغیرہ میں بہت زیادہ ہندوی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ ڈاکٹر سید کلیم اصغر نے کہا کہ امیر خسرو بیٹیوں کو باہنر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر بیٹی باہنر ہے تو وقت ضرورت اپنے شوہر کا سہارا بن سکتی ہے۔ اگر خسرو دور حاضر میں ہوتے تو بیٹیوں کے لیے کمپیوٹر کی تعلیم کو لازمی قرار دیتے۔ اس سیمینار میں ڈاکٹر عمران احمد عندلیب، ڈاکٹر یاسر عباس، ڈاکٹر مغیث احمد وغیرہ نے بھی اپنے مقالات پیش کیے۔ اس سیمینار میں ڈاکٹر عزیز عباس، ڈاکٹر احمد حسن، ڈاکٹر مضر علی، عبدالحق فلاحی، مولانا شعیب حسینی، گوہر عباس، تصور مہدی، افتخار احمد، قمر حیدر، محمد حنیف، انور خان وغیرہ کے علاوہ بڑی تعداد میں طلبا و طالبات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 22 جون 2019

دہلی پبلک لائبریری میں منعقدہ سیمنار 'امیر خسرو کی زندگی کا نظریہ' کے موضوع پر منعقدہ سیمنار

مجتبیٰ حسین کو خراج تحسین

نئی دھلی: حکومت ہند کے ادبی رسالے ماہنامہ 'آجکل' (اردو) نے طنز و مزاح کے چار مینار مجتبیٰ حسین پر خصوصی شمارہ شائع کرکے ان کو بہترین اور سچا خراج تحسین پیش

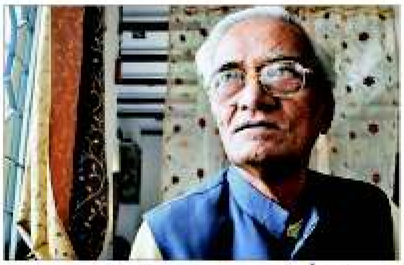

کرنے کی کوشش کی ہے جس میں ان کی طنز و مزاح نگاری، خاکہ نگاری، اسلوب، ان کی فنی خصوصیات، چست و درست فقرے، لفظیات وغیرہ پر بحث کی گئی ہے۔ ماہنامہ کے جولائی کے شمارے میں جن میں 12 مضامین، دو اداریے اور منظومات شامل ہیں، جو ملک کے مختلف گوشوں سے تعلق رکھنے والے ادبا، شعرا اور قلم کاروں نے لکھے ہیں۔ 'آجکل' کے مدیران حسن ضیا نے مجتبیٰ حسین پر 'ادب میں طنز و مزاح' اور ڈاکٹر ابرار رحمانی نے حرف آخر کے تحت 'مجتبیٰ حسین قطب مینار سے چار مینار تک' تاثراتی اداریے قلم بند کیے ہیں جن میں دونوں نے ان کی 'آجکل' سے وابستگی اور محبت کا ذکر کرنے کے ساتھ ان کی مزاح نگاری اور خاکہ نگاری کا جائزہ لیا ہے۔

صاحب طرز ادیب اور نقاد حقانی القاسمی نے اپنے مضمون 'مجتبائی مزاح کی معنویت' میں لکھا کہ وہ ہمیشہ نئے موضوعاتی اور اسلوبی جزیرے کی جستجو میں رہتے ہیں۔ کبھی واقعات کے کھردرے پن اور کبھی کردار کی مضحکہ خیزی سے ایک معمولی سے احساس کو غیر معمولی اظہار کا روپ دے دیتے ہیں۔ مجتبیٰ کی نکتہ آفرینی ان کے ہر مضمون میں ملتی ہے اور ان کے ذہن رسا سے ایسے ایسے نکتوں کا نزول ہوتا ہے کہ حیرتوں کے در کھلتے چلے جاتے ہیں اور قاری ایک طلسم تحیر میں قید ہو جاتا ہے۔ اس شمارے میں اسیم کاویانی نے مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری اور مزاح نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے کچھ ان کے جملے نقل کیے ہیں۔ واضح رہے کہ مجتبیٰ حسین اردو کے ممتاز مزاح نگار رہیں۔ 15 جولائی 1936 کو گلبرگہ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، جوانی سے ہی انھیں طنز و مزاح کی تحریروں کا ذوق تھا جس کی تکمیل کے لیے روزنامہ سیاست سے وابستہ ہوگئے اور وہیں سے ان کے ادبی سفر کا آغاز ہوا۔ 1962 میں محکمہ اطلاعات میں ملازمت کا آغاز کیا، 1972 میں دہلی میں گجرال کمیٹی کے ریسرچ شعبے سے وابستہ ہوگئے۔ دہلی میں مختلف محکموں میں ملازمت کے بعد 1992 میں ریٹائرڈ ہوگئے۔ مجتبیٰ حسین ملک کے پہلے طنز و مزاح کے ادیب ہیں جن کو وفاقی حکومت نے بحیثیت مزاح نگار پدم شری کے باوقار سویلین اعزاز سے نوازا۔ مجتبیٰ حسین کے مضامین پر مشتمل 22 سے زائد کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ ان کی 7 کتابیں ہندی زبان میں شائع ہوئیں۔ جاپانی اور اڑیہ زبان میں بھی ایک ایک کتاب شائع ہوئی۔ انھیں 10 سے زائد ایوارڈز حاصل ہوئے جن میں غالب ایوارڈ، مخدوم ایوارڈ، کنور مہندر سنگھ بیدی ایوارڈ، جوہر قریشی ایوارڈ اور میر تقی میر ایوارڈ شامل ہیں۔ ان کی طویل خدمات کے اعتراف میں کرناٹک کی گلبرگہ یونیورسٹی نے 2010 میں انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، ......، 2019

دھلی:

امیر خسرو انسانی رشتوں کے علمبردار تھے

نئی دھلی: شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر صادق نے کہا کہ امیر خسرو انسانی رشتوں کے علمبردار تھے۔ اگر ہم امیر خسرو کی فکر، تخلیقات و کتابوں کا مطالعہ کریں تو اس میں لائق تعریف جو چیز ہے وہ انسانی رشتوں کی اہمیت ہے، امیر خسرو نے انسانی رشتوں کے ساتھ قدرتی مناظر، جانور اور دوسرے جانداروں پر بھی

کافی اچھا لکھا ہے جو قابل ستائش ہے۔ وہ دہلی پبلک لائبریری میں منعقدہ سمینار بعنوان 'امیر خسرو کی زندگی کا نظریہ' میں صدارتی کلمات ادا کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ امیر خسرو نے اپنی مثنوی اور دوہوں میں اپنے دور کے مویشیوں پر بھی خوب لکھا ہے۔ ایک جگہ وہ دعا دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ خدا تمھارے مویشیوں کو خوب بھر پیٹ چارا دیتا رہا ہے۔ پروفیسر صادق نے کہا کہ وہ اپنی ایک مشہور مثنوی نہ سپہر میں ہندوستان کا ذکر کرتے ہوئے دکھائی دیے ہیں جس میں انھوں نے ہندوستان کے اس دور کے حالات کو بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اس وقت ہندوستان کے لوگ کیسے تھے یہاں کی تہذیب وتمدن اور رسم و رواج کس طرح کا تھا اس دور میں ہندوستان میں کون سی زبان عام بول چال میں استعمال کی جاتی تھیں۔ پروفیسر صادق نے مزید کہا کہ اس سے قبل کسی نے یہ بات نہیں کہی کہ ہندوستان میں کس طرح کی زبانیں استعمال ہوتی تھیں۔ انھوں نے اپنے کلام میں سنسکرت کا ذکر کیا ہے ساتھ ہی گجراتی کو گجری اور پنجابی لاہوری زبان کا نام دیا ہے اور سنسکرت کو ان سبھی زبانوں کی ماں قرار دیا ہے۔ امیر خسرو نے اپنے کلام میں سنسکرت کی بے حد تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سنسکرت کو ہر کس و ناکس نہیں سیکھ سکتا بلکہ اس زبان کو سیکھنے کے لیے ذہین ہونا ضروری ہے۔ امیر خسرو نے سنسکرت کے تعلق سے یہ بھی کہا ہے کہ یہ زبان علم کا خزانہ ہے اور اس میں کئی راز پوشیدہ ہیں جس کو معلوم کرکے عمل کرکے علم میں استفادہ کرنا چاہیے۔ پروفیسر صادق نے مزید کہا کہ امیر خسرو ہندوستان کے نہیں بلکہ پوری دنیا کے شاعر ہیں۔ ہندوستان کے علاوہ پانچ ممالک میں امیر خسرو کو پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے۔ اس موقعے پر امیر خسرو اکادمی کے روح رواں پردیپ شرما خسرو اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر ایس کلیم اصغر نے امیر خسرو کی زندگی پر مبنی مقالے پیش کیے اور امیر خسرو کی زندگی کے پہلوؤں سے روشناس کرایا۔ سمینار کے آخر میں پروفیسر صادق کی ہدایت کاری پر امیر خسرو کی زندگی پر مبنی فلم بھی دکھائی گئی جسے ناظرین وسامعین نے کافی پسند کیا۔

سمینار کا آغاز سبھی مہمانان کے ہاتھوں شمع افروزی کرکے کیا گیا۔ اظہار تشکر دہلی پبلک لائبریری کے چیئر مین رام شرن گوڑھ نے کیا۔ اس موقعے پر مختلف شعبہ جات سے وابستہ افراد کے علاوہ کثیر تعداد میں طلبہ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی 27 جون 2019

شفیق الحسن کے ذریعے خبروں کی ترسیل کا مثالی کارنامہ

نئی دھلی: اینڈ رائڈ موبائل ایپ کی مدد سے اہم اخباری تراشے تیار کرکے بروقت اس کی ترسیل کرنے میں سماجی خدمت گار اور کتابوں کے ناشر شفیق الحسن کا نام

سرفہرست ہے۔ اس جدید ٹیکنالوجی کے دور میں جب سوشل میڈیا کے ذریعے وقت گزاری یا دیگر مشغلے وقت کے تضیع کا سبب بن رہے ہیں، سوشل ورکر شفیق الحسن وہاٹس ایپ گروپ کے ذریعے خبروں کی ترسیل اپنے آپ میں مثالی کارنامہ ہے۔ آپ تصور کرسکتے ہیں کہ صبح 8 بجے وقت مقررہ پر تمام اہم اخبارات کی خبریں امیج کی شکل میں فراہم کرنا کس قدر مشکل مرحلہ ہے۔ اپنے طے شدہ وقت پر بیدار ہونا، اردو، انگریزی اور ہندی کے اخبارات دیکھنے کے ساتھ ان اخبارات میں شائع ہوئی اہم ترین خبروں کی فوٹو کلک یا ای پیج سے خبروں کی کٹنگ ڈاون لوڈ کرنا اور قومی و بین الاقوامی شخصیات تک اسے پہنچانا شفیق الحسن کے مشغلے میں شامل ہے۔ یوپی کے کاس گنج میں پیدا ہونے والے 48 سالہ شفیق الحسن نے 'نامہ نگار' کو بتایا کہ 35 سال سے اخبارات سے خاص لگاؤ رہا ہے اور ان کی صبح کی چائے اخبارات کے ساتھ ہوتی تھی اسی لیے ہمہ وقت حالات سے باخبر رہتے اور دوسروں کو بھی بیدار کرتے رہتے تھے، حالانکہ ان کی زندگی میں شروعاتی مرحلے میں کافی دشواریاں آئیں مگر انھوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا نیز شدید محنت، لگن، جذبے اور ایمانداری کے ساتھ آگے بڑھتے چلے گئے۔ مسٹر شفیق نے بتایا کہ آج ایک درجن سے زائد وہاٹس ایپ گروپ میں ہندوستانی ممالک کے 5 ہزار سے زائد اہم لوگوں کو خبریں شیئر کرتے ہیں، ساتھ ہی ٹوئٹ اور فیس بک پر لوگوں کو بیدار کرنے اور ان کو حالات سے واقف کرانے کی خاطر یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور لوگ اس پر ردعمل بھی دیتے ہیں اور اس نیوز شیئرنگ سروس سے وہ کافی متاثر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ 2017 سے 2019 تک کی تمام اہم خبریں تصاویر اور کارٹونس کے ذخیرے میرے پاس سافٹ کاپی کی شکل میں محفوظ ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ طلبہ، اساتذہ اور تحقیقی کاموں کو انجام دینے والے اہل علم افراد کے لیے جو کالج اسٹوڈنٹس اور ریسرچ اسکالرز ہیں یہ ان کے لیے بیش بہا خزانہ ہمہ وقت موجود ہے۔ رپورٹ امیج اسٹوڈنٹس، پروفیسرز اور ٹیچرز کے لیے مفت فراہم کریں گے۔ مسٹر شفیق بتاتے ہیں کہ سوشل میڈیا کے ذریعے فراہم کردہ خبروں اور اہم اخباری مشمولات سے قوم میں بیداری پیدا کرنے کی ادنیٰ کوشش کررہا ہوں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 جون 2019

اترپردیش:

اردو زبان تہذیب کی علامت

لکھنؤ: راجدھانی کے چوک علاقہ میں واقع لاجپت نگر و مصاحب گنج کے پرائمری و جونیئر ہائی اسکول میں درجہ ایک سے آٹھ تک کے بچوں کو اردو کتابیں تقسیم کی گئیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام ٹرسٹ کے چیئر مین عبدالنصیر ناصر کو بیسک تعلیمی پریشد نے بچوں کو اردو کتابیں تقسیم کرانے کی ذمے داری سپرد کی ہے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے چوک علاقہ میں واقع لاجپت نگر و مصاحب گنج کے پرائمری و جونیئر ہائی اسکول میں تشریف لائے۔ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام ٹرسٹ کے چیئر مین عبدالنصیر ناصر نے اترپردیش کی یوگی حکومت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ انتہائی خوشی کی بات ہے کہ اس حکومت نے ہماری اپیل کو منظور کرکے پہلی بار پرائمری و جونیئر ہائی اسکولوں میں اردو کی کتابیں تقسیم کرائیں۔ اس موقعے پر مسٹر عبدالنصیر ناصر نے کہا کہ اردو زبان تہذیب کی علامت ہے، اس زبان کی مٹھاس ہر جگہ پائی جاتی ہے، اردو زبان کو ذات و مذہب سے جوڑنا صحیح نہیں ہے، اردو زبان ہندوستانیوں کی زبان ہے، اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے ہم سب کو بڑھ چڑھ کر حصہ لینا ہے، اردو زبان اترپردیش کی دوسری سرکاری زبان ہے۔ اردو زبان اگر کسمپرسی کے دور سے گزر رہا ہے تو اس کے ذمے دار ہم اور آپ ہیں اس کے فروغ کے لیے زمینی سطح پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ مسٹر عبدالنصیر ناصر نے پورے اترپردیش کے پرائمری و جونیئر ہائی اسکولوں میں اردو ٹیچروں کی بھرتی کیے جانے و اترپردیش اردو اکادمی کو اردو کتابیں مرتب ونشر کیے جانے کی مانگ کی ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 4 جولائی 2019

تلنگانہ:

اردو ویب سائٹ کا آغاز

حیدرآباد: ڈیجیٹل انڈیا پروگرام کے طور پر بہتر انتظامی نظام و فرائض کی انجام دہی میں شفافیت کے لیے کئی تبدیلیوں اور ترقیاتی کاموں میں تلنگانہ کا ضلع محبوب نگر ایک اور قدم آگے بڑھ گیا ہے۔ کیونہ ضلع کلکٹریٹ کی اب اردو میں بھی ویب سائٹ متعارف کی گئی ہے۔ اب تک کلکٹریٹ محبوب نگر کی تلگو اور انگریزی میں ویب سائٹ دستیاب تھی۔ خاص بات یہ ہے کہ اس ویب سائٹ میں آسان اردو کا استعمال کیا گیا ہے اور یہ غلطیوں سے بھی پاک ہے۔ اردو زبان بولنے والے اور اردو کی تعلیم حاصل کرنے والوں کے لیے سواس ٹکنالوجی کی مدد سے اس اردو ویب سائٹ کو ڈیزائن کیا گیا ہے۔ محبوب نگر ضلع این آئی سی کی اردو میں ویب سائٹ پہلے ہی سے عوام کے لیے دستیاب ہے۔ ضلع کلکٹر رونالڈ راس نے کلکٹریٹ محبوب نگر کی نئی اردو ویب سائٹ کا آغاز کیا۔ رونالڈ راس نے اردو میں ویب سائٹ کی تیاری کی۔ اس نئی کاوش کے لیے سب سے پہلے مساعی کی۔ اردو زبان میں محبوب نگر ضلع کی ویب سائٹ کی تیاری کے لیے این آئی سی عہدے داروں نے دستیاب تکنیکی ٹکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے اس ویب سائٹ کو حتمی شکل دی۔ این آئی سی کے عہدے داروں نے اس کے لیے تقریباً ایک ماہ تک کام کیا۔ مرکزی حکومت کی جانب سے عمل کیے جارہے ڈیجیٹل انڈیا پروگرام کے حصہ کے طور پر ملک میں پہلی مرتبہ محبوب نگر ضلع کی اردو میں ویب سائٹ تیار کی گئی ہے تاکہ اردو جاننے والے تمام تفصیلات سے واقف ہوسکیں۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 3 جولائی 2019

بزمِ خلوص

حیدرآباد: مولانا سید دلدار حسین عابدی چیف ایڈیٹر روزنامہ 'دلدار ہند' نے اردو گھر مغل پورہ میں منعقدہ خلوص ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے سالانہ جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آج کوئی غیر نہیں بلکہ ہم خود اپنے ہاتھوں سے اردو جیسی میٹھی اور شیریں زبان کو دفن کرنے پر آمادہ ہوگئے ہیں، مولانا سید دلدار حسین عابدی نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جو اردو کی روٹی کھارہے ہیں وہ نہ تو ایک اردو کا اخبار خریدتے ہیں اور نہ ہی اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دینے میں دلچسپی رکھ رہے ہیں۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے جناب ایم اے نعیم (این آر آئی)، محمد عبدالرؤف، عارف شجر، صحافی ادیب و شاعر کے علاوہ نواب میر وقارالدین علی خان صدر ممتاز ایجوکیشنل سوسائٹی نے شرکت کی۔ حافظ مولانا محمد الیاس کی سیرت کلام پاک سے تقریب کا باضابطہ آغاز ہوا۔ کلام پاک کے بعد کمسن طالبات امت الحق، حنا صدیقی نے قرأت اور ترجمہ پیش کیا۔ عبدالامت الودود حوریا نے نعت شریف پیش کی۔ ممتاز گلوکار محمد رکن الدین نے حمد اور حضرت یوسف علی خلوص کی تحریر کردہ نعت شریف پیش کی۔ جلسے کو محمد عبدالنعیم، میر وقارالدین علی خان نے خطاب کیا۔ انھوں نے بزم خلوص کی کارکردگی کو مثالی قرار دیا اور دوسروں کے لیے قابل تقلید بتایا۔ ممتاز شاعر عارف شجر نے اپنی غزل کے چند شعر پیش کیے اور نسیم اعجاز نسیم کے تحریر کردہ تہنیتی اشعار کو بھی پڑھا۔ اس موقعے پر سالانہ تحریری مقابلہ برائے فروغ اردو میں کامیاب طلبا کو انعامات تقسیم کیے گئے۔ بعد ازاں ایک مستحق لڑکی کی شادی کے موقعے پر لڑکی کے سرپرست کو ضروریات زندگی کا سامان حوالے کیا گیا۔ سینئر جرنلسٹ محمد صدیقی علی نے نظامت کے فرائض بخوبی انجام دیے اور اظہار تشکر کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 3 جولائی 2019

اعزاز و اکرام:

پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کو استقبالیہ

نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ ہر سال ملک کے کسی معتبر ادیب و دانشور کی خدمت میں استقبالیہ جلسے کا انعقاد کرتا ہے۔ اس سال یہ استقبالیہ جلسہ اردو کے نامور ادیب و دانشور پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کی علمی و ادبی خدمات کے

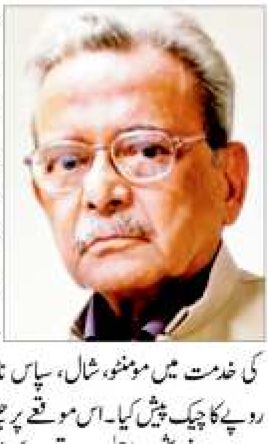

اعتراف میں منعقد ہوا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے ادارے کی جانب سے شمس الرحمٰن فاروقی کی خدمت میں مومنٹو، شال، سپاس نامہ اور پچاس ہزار روپے کا چیک پیش کیا۔ اس موقعے پر جلسے کو خطاب کرتے ہوئے پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا کہ میں غالب انسٹی ٹیوٹ، تمام مقررین اور حاضرین کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں کہ انھوں نے بڑی محبت کا اظہار کیا۔ میری تعریف میں جو باتیں کہی گئیں میرا خیال ہے کہ اس میں مبالغہ زیادہ تھا، حقیقت یہ ہے کہ میں بھی اردو کا ادنیٰ خادم ہوں اور میں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ سوالات پیدا ہوں۔ مجھ سے پہلے جو اردو کے معتبر نام ہیں میں ان کا بڑا احترام کرتا ہوں اور سوالات انھوں نے بھی قائم کیے لیکن یہ تاثر زیادہ نمایاں رہا کہ ہماری روایت کی بنیادیں کمزور ہیں اور یہ بدلتے وقت کا ساتھ نہیں دے سکتیں، لوگوں نے بھی اس پر آنکھ بند کرکے یقین کرلیا۔ میں نے بزرگوں کو پڑھا ضرور لیکن ان کے قول کو من وعن قبول نہیں کیا۔ یہ رویہ میرا مغربی ادب کے ساتھ بھی رہا کہ میں نے ان کے تمام اصولوں کا غیر ضروری طور پر انطباق اردو ادب پر نہیں کیا۔ میں اپنے چھوٹوں سے، ہم عمروں سے اور دبے لفظوں میں بزرگوں سے یہی کہتا ہوں کہ کسی نظریے کو قبول کرنے سے پہلے یہ غور کریں کہ اس کا انطباق آپ کے ادب پر ہوبھی سکتا ہے یا نہیں ورنہ ہم صحیح معنوں میں تفہیم کا حق ادا نہیں کرسکتے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ آج کی شام میری زندگی کی سب سے یادگار شام ہے کیونکہ ہم اردو کے اس دانشور کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں جس کے بغیر اردو ادب پر کوئی گفتگو مکمل نہیں ہوسکتی۔ آپ صحیح معنوں میں نظریہ ساز نقاد ہیں۔ پروفیسر وہاج الدین علوی نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ میں جب خسرو سے لے کر اس وقت تک کی تاریخ پر نظر ڈالتا ہوں تو خسرو کے ماسوا مجھے کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی جس میں اتنے پہلو ہوں۔ فاروقی صاحب بیک وقت نقاد، محقق، تاریخ داں، فکشن نگار اور شاعر بھی ہیں۔ ان کی شخصیت کے جس پہلو کو اٹھائیے اپنی جگہ مکمل اور منفرد نظر آئے گا۔ پروفیسر معین الدین جینا بڑے نے اپنی تقریر میں کہا کہ فاروقی صاحب کی موجودگی میں ان کے تعلق سے کچھ کہنا کسی آزمائش سے کم نہیں۔ آج سے بیس پچیس سال بعد جب اردو ادب کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس دور کی نمائندگی کے لیے فاروقی صاحب تنہا ہوں گے دوسرا کوئی شخص ان کا ہمسر نہ ہوگا۔ فاروقی صاحب کا ایک بڑا وصف یہ بھی ہے کہ وہ اختلاف کرنے والوں کی بھی بڑی حوصلہ افزائی کرتے ہیں بلکہ بعض موقعوں پر تو انھوں نے اختلاف کرنے والوں سے کہا کہ آپ نے کچھ مروت سے کام لیا مزید سختی کرنی تھی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر رضا حیدر نے اپنے تعارفی کلمات میں کہا کہ ہم ہر سال کسی معتبر ادیب و دانشور کی خدمت میں استقبالیہ جلسے کا انعقاد کرتے ہیں لیکن پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کو استقبالیہ دیتے ہوئے فخر کا احساس ہورہا ہے۔ فاروقی صاحب نے صحیح معنوں میں ہمیں اپنی روایت

کا احترام کرنا سکھایا۔ تفہیم غالب، شعر شور انگیز، اور کئی چاند تھے سر آسماں ان کی ایسی تصانیف ہیں جن کے مطالعے کے بغیر ہم غالب، میر اور اپنی تہذیب کو نہیں سمجھ سکتے۔ اتنی سخت گرمی میں اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کا جمع ہو جانا بھی فاروقی صاحب کی مقناطیسی شخصیت کا ایک پہلو ہے۔ اس موقعے پر مختلف مشاہیر ادب کے 22 مضامین پر مشتمل، سید رضا حیدر اور مظفر رضا کی مرتبہ کتاب 'شمس الرحمٰن فاروقی ادیب و دانشور' کی رسم رونمائی بھی عمل میں آئی۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 1 جولائی 2019

پروفیسر شبنم حمید کو استقبالیہ

میرٹھ: الہ آباد یونیورسٹی الہ آباد کی صدر شعبۂ اردو پروفیسر شبنم حمید کی میرٹھ آمد پر ایک استقبالیہ تقریب کا شعبۂ اردو کے پریم چند سیمینار ہال میں انعقاد کیا گیا جس کی صدارت کے فرائض شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے انجام دیے۔ مہمان کا تعارف پیش کرتے ہوئے پروفیسر اسلم جمشید پوری نے پروفیسر شبنم حمید کی ادبی خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ تقریب دوپہر ایک بجے شروع ہوئی۔ پہلے مہمان کا پھولوں کے ذریعے استقبال کیا گیا۔ بعد ازاں پروفیسر شبنم حمید نے اردو زبان و ادب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے ماریشس کے ادبی سفر کی دلچسپ روداد پیش کی۔ ماریشس میں اردو زبان کی صورتِ حال پر گفتگو کرتے ہوئے اپنے منفرد انداز سے مہمان نے سامعین کا دل جیت لیا۔ ماریشس میں اردو زبان کا اسٹرکچر پیش کرتے ہوئے پروفیسر شبنم حمید نے کہا کہ وہاں چاہے اردو طلبا کی تعداد کم ہو لیکن اردو کی جڑوں کو مضبوط کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ علاوہ ازیں پروفیسر شبنم حمید نے کہا کہ چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کا شعبۂ اردو آج اپنی ایک منفرد پہچان بنانے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ نیشنل اور انٹرنیشنل سطح پر کامیاب شعبوں میں سی سی ایس یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے نمایاں پہچان بنائی ہے جس کے لیے صدر شعبۂ اردو مبارکباد کے مستحق ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 4 جولائی 2019

محمد خلیل اور سلمان عبدالصمد کو ایوارڈ

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی کے صدر پروفیسر چندر شیکھر کمبار کی صدارت میں اکادمی کی مجلس عاملہ کی اگرتلہ میں منعقدہ میٹنگ میں قلم کاروں کو ادب برائے نوجوان و اطفال ایوارڈ 2019 کا اعلان کیا گیا ہے جس میں ادب برائے

نوجوان اور ادب برائے اطفال کے 23، 23 قلم کاروں کو ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ ان میں اردو زبان میں محمد خلیل کی تخلیق سائنس کے دلچسپ مضامین کے لیے ادب برائے اطفال ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ محمد خلیل خاص طور پر بچوں کے لیے سائنسی مضامین لکھنے کے لیے معروف رہے ہیں۔ نمائندہ انقلاب سے گفتگو کرتے ہوئے محمد خلیل نے ساہتیہ اکادمی کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں اپنے قلم کے ذریعے بچوں کو سائنسی علوم سے آراستہ کرنے کا فکر مند ہوں، بچے ملک کا مستقبل ہیں اور اگر ہم ان کے لیے آج بہتر کام کریں گے تو ملک کا مستقبل بہتر ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ میری 15 تخلیقات میں سے تقریباً 10 تخلیقات بچوں پر مبنی ہیں۔ انھوں نے اپنی تخلیق سائنس کے دلچسپ مضامین کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میری اس کتاب میں ماحولیات، سائنس کے مضامین کے علاوہ جانوروں پر بھی مضامین بچوں کے لیے شامل کیے گئے ہیں۔

وہیں نوجوان فکشن نگار سلمان عبدالصمد کو ان کے ناول 'لفظوں کا لہو' کے لیے ادب برائے نوجوان کے ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا ہے۔ سلمان عبدالصمد نے انقلاب سے بات کرتے ہوئے ساہتیہ اکادمی کے ساتھ اپنے والدین اور اپنے لیے نیک خواہشات رکھنے والے تمام افراد کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ میرے اس ناول کو ہر طبقے کے قارئین خصوصاً ریسرچ اسکالرز اور اساتذہ نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اس ادبی سفر میں نیک دل قارئین اور ساہتیہ اکادمی کی اس ہمت افزائی سے مجھے تقویت ملی ہے۔ مجھے تنقید و تخلیق سے یکساں دلچسپی ہے۔ انھوں نے اپنے ناول 'لفظوں کے لہو' کے تعلق سے کہا کہ میرا ناول صحافیوں کی جد و جہد پر مبنی ہے اور اس کی مقبولیت کا راز بھی یہی ہے کیونکہ اس سے قبل کبھی صحافیوں پر کسی نے اپنے ناول میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ واضح رہے کہ جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں پروفیسر انور پاشا کی سرپرستی میں سلمان عبدالصمد 'اردو ناول اور اسلوبیات: 1980 کے بعد' پر پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ ناول کے علاوہ ان کی دو کتابیں، متعدد تنقیدی مضامین اور افسانے شائع ہو چکے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 جون 2019

اردو اکادمی دہلی کے سالانہ ایوارڈ سال 2018 کا اعلان

نئی دھلی: نائب وزیر اعلیٰ و چیئرمین اردو اکادمی، دہلی منیش سسودیا نے اکادمی کی ایگزیکیٹو کمیٹی کی میٹنگ میں اکادمی کے سال 2018 کے سالانہ ایوارڈز کا اعلان کیا ہے۔ 'کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ' ممتاز ادیب و ناقد دہلی یونیورسٹی و جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے سابق استاد پروفیسر شارب ردولوی کو دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ 'پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ایوارڈ' ممتاز ادیب، ناقد، شاعر اور سابق صدر، شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی پروفیسر عتیق اللہ کو دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ دونوں ایوارڈ 2 لاکھ 51 ہزار روپے نقد فی کس سند، شال اور مومنٹو پر مشتمل ہیں۔ اس کے علاوہ ایوارڈ برائے تحقیق و تنقید صاحب علم و بصیرت اور محقق، نقاد و ادیب پروفیسر وہاج الدین علوی کو، ایوارڈ برائے تخلیقی نثر معروف افسانہ نگار اظہار عثمانی کو، ایوارڈ برائے شاعری ممتاز شاعر ڈاکٹر جی آر کنول کو، ایوارڈ برائے اردو صحافت معروف صحافی شکیل حسن شمسی کو، ایوارڈ برائے ترجمہ پروفیسر انیس الرحمٰن کو اور ایوارڈ برائے غزل گائیکی محترمہ رادھیکا چوپڑا کو دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ ایوارڈز ایک لاکھ 1000 روپے فی کس نقد، شال، سند اور مومنٹو پر مشتمل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی سال 2018 کی کتابوں پر انعامات دینے کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے جس میں پہلے انعام (15 ہزار روپے) کے لیے منتخب کتابیں شامل ہیں۔ ان میں افق کے پار (مینو بخشی)، ابن صفی کا ادبی نصب العین (محمد عارف اقبال)، رنگ سب رنگ (شاہد ماہلی)، اردو شاعری (پروفیسر ابن کنول)، زہرہ بیگم (امیر مہدی، سلیم شیرازی)، عوامی مرثیے کی روایت (لئیق رضوی)۔

دوسرے انعام (10 ہزار روپے) کے لیے منتخب کتابیں شامل ہیں۔ ان میں چاند کی پلکیں (منیر ہمدم)، بڑھاپے میں جوانی (پروفیسر بدرالدین الحافظ)، خواب کے اس پار (سیدہ نفیس بانو)، تذکیر و تحلیل (ڈاکٹر ندیم احمد)، نقش ثانی (اودھ کے فارسی گو شعرا)، ڈاکٹر زہرہ فاروقی)، ریت دریا اور سراب (پی پی سریواستو رند)، تعلیم سے ہی تصویر بدلے گی (کلیم الحفیظ)، پنجاب کی تاریخی مساجد (مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی)، عربی ادبیات کے اردو تراجم (ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی)، علی عباس حسینی کے فکر و فن کا تجزیاتی مطالعہ (ڈاکٹر سید سجاد مہدی حسینی)، سفر در سفر (رضوان لطیف خاں)، عدالتی زبان میں مستعمل اردو، عربی و فارسی اصطلاحات (خواجہ عبدالمنتقم)، قاضی

عبدالستار کی افسانہ نگاری (مہناز عبید)۔

تیسرے انعام (5 ہزار روپے) کے لیے منتخب کتابیں شامل ہیں۔ ان میں گرد و پیش (ماسٹر نثار احمد)، قلم کی شوخیاں (حامد علی اختر)، روشن باتیں (مرزا ذکی احمد بیگ)، احوال و کوائف (فلاح الدین فلاحی)، جبکہ منشی نول کشور انعام برائے بہترین ناشر کے لیے 'کتاب والا' کو دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اسی نشست میں سال 2018 کے 22 مسودات پر مالی تعاون دینے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 13 جولائی 2019

عالمی یوم اردو ایوارڈ کا اعلان

نئی دهلی: یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا اور اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کی طرف سے اس سال 9 نومبر کو عالمی یوم اردو کے موقعے پر دیے جانے والے ایوارڈز کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ یو ایم آئی اور اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے روح رواں ڈاکٹر سید احمد خان نے بتایا کہ امسال بھی 9 نومبر کو شاعر مشرق علامہ اقبال کے یوم ولادت کی مناسبت سے منائے جانے والے عالمی یوم اردو کے موقعے پر اردو کی خدمت کے اعتراف میں متعدد افراد کو ایوارڈ سے نوازا جائے گا۔ انھوں نے بتایا کہ یہ ایوارڈ دہلی میں منعقد ایک پروقار تقریب میں دیے جائیں گے۔ ڈاکٹر سید احمد کے مطابق اردو کے بزرگ صحافی، ہندسماچار کے سابق چیف سب ایڈیٹر اور متعدد اخبارات کے ایڈیٹر نیز کئی کتابوں کے مصنف اوم پرکاش سونی (امرتسر) کو 'محفوظ الرحمٰن ایوارڈ برائے صحافت' دیا جائے گا جب کہ مالیگاؤں مہاراشٹر کے خیال انصاری (ایڈیٹر خیر اندیش) کو 'مولوی اسماعیل ایوارڈ برائے ادیب اطفال'، ڈاکٹر یامین انصاری (نیوز ایڈیٹر انقلاب) کو 'عثمان فارقلیط ایوارڈ برائے صحافت'، پروفیسر سید فضل اللہ قادری' پھلواری شریف پٹنہ کو 'قاضی عدیل عباسی ایوارڈ'، مسٹر جے چند (نامہ نگار ہندی روزنامہ وراٹ ویبھو) کو 'منشی پریم چند ایوارڈ برائے صحافت'، محترمہ فریدہ رحمت اللہ (ایڈیٹر زریں شعاعیں، بنگلور) کو 'نور جہاں ثروت ایوارڈ' برائے فروغ ادب کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ ویب پورٹل، دی انڈین آواز کے بانی اور صحافی عندلیب اختر کو ایوارڈ برائے ڈیجیٹل میڈیا دوردرشن سے وابستہ فرمان چودھری کو ایوارڈ برائے الیکٹرانک میڈیا اور نریندر کمار کو سید فدا علی ایوارڈ برائے فوٹوگرافی دیا جائے گا۔

اردو کتابوں کی ترویج و اشاعت کے لیے منشی نول کشور ایوارڈ اس سال منشورات پبلشرز (دہلی) کو دیا جائے گا۔

خیال رہے کہ اس سے قبل نیشنل بک ٹرسٹ، پینگوئن، پبلی کیشنز، مکتبہ جامعہ، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز اور نئی کتاب وغیرہ کو یہ باوقار ایوارڈ دیا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر سید احمد خان نے بتایا کہ اس سال عالمی یوم اردو کے موقعے پر 'منشی پریم چند- مساوات اور حقوق انسانی کے علمبردار' کے موضوع پر ایک خصوصی مجلّہ بھی شائع کیا جائے گا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 1 جولائی 2019

جلسہ تقسیم اسناد

سولاپور: خادمان اردو فورم سولاپور نے چوتھے عشرہ اردو کے موقعے پر شروع کی گئی کوچنگ کلاسز کی اختتامی تقریب اور جلسہ تقسیم اسناد محترم عبدالجبار شیخ (پرنسپل سوشل اردو ہائی اسکول و جونیئر کالج، سولاپور) کے زیرِ صدارت

منعقد کیا گیا۔ جلسہ کا آغاز محترم معین الدین شیخ کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ ادارے کا اجمالی تعارف پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر چوبدار شفیع نے کہا کہ ادارہ تعمیری پروگراموں کے ذریعے قوم کے طلبہ سے لے کر قوم وملت کی خدمات انجام دیتے ہوئے اردو کی ترقی و ترویج کے لیے بھی کوشاں ہے۔ ادارے کے روح رواں محترم وقار احمد شیخ صاحب نے جامع انداز میں اغراض و مقاصد پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان ایک خالص ہندوستانی زبان ہے۔ اس میں اتنی لچک ہے کہ دوسری زبانوں کے الفاظ نے بھی اس میں رچ بس کر اس زبان کے لطف و اثر، شرینی اور دل نشینی کی کشش کو بلند مقام تک پہنچایا ہے، اس لیے اس کا ہر کوئی گرویدہ ہے۔ اردو کا دامن طرح طرح کے پھولوں سے بھرا ہے۔ یہ قومی یکجہتی کی عمدہ مثال ہے۔ انھوں نے اس موقعے پر اردو سیکھنے والے طلبہ کی ہمت افزائی کی اور کہا کہ 25 اکتوبر 2019 کو یوم ساحر لدھیانوی اور فلم اردو فیسٹیول منا کر اردو دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے اردو کی ترقی و ترویج کے لیے پروگرام منعقد کریں۔ صدر جلسہ اور مہمانان کا محترم وقار صاحب، ڈاکٹر شفیع چوبدار صاحب نے ان کی خدمت میں گلوں کا نذرانہ پیش کر کے ان کا پرتپاک استقبال کیا۔ کوچنگ کلاسز کے طلبہ میں سے محترم فیاض شیخ، محترمہ ودیا کالے نے موثر انداز میں اردو زبان و ادب کی تعریف کی اس زبان سے بہت کچھ نیا سیکھنے کو ملا۔ اب ہم بڑے فخر کے ساتھ اس زبان کو بولنے کی کوشش کریں گے۔ محترم بھڑنگے صاحب نے اردو غزل درد بھری آواز اور ترنم کے ساتھ پیش کر کے سامعین کو بے حد محظوظ کیا۔ بعدازاں کوچنگ کلاسز کے تمام طلبہ کو فورم کی جانب سے دیدہ زیب اسناد محترم وقار شیخ صاحب، ڈاکٹر شفیع چوبدار صاحب، محترم رفیق خان صاحب، محترم ہارون کرکم صاحب کے مبارک ہاتھوں سے تفویض کی گئیں۔ کوچنگ کلاسز کے استاد محترم ہارون کرکم نے بڑے ہی جذباتی انداز میں طلبہ کی ہمت افزائی کرتے ہوئے کہا کہ جس انداز سے یہ اردو سیکھ رہے ہیں بہت جلد وہ اردو زبان میں عبور حاصل کریں گے۔ اردو کے استاد محترم ہارون کرکم کو طلبہ کی جانب سے خوبصورت تحفہ دے کر ان کی عزت افزائی کی گئی۔ آخر میں خطبہ صدارت پیش کرتے ہوئے محترم عبدالجبار شیخ نے کہا کہ اردو زبان ایک ایسی زبان ہے جس نے مختلف قوموں میں رابطے کی زبان کا کردار ادا کیا ہے۔ خادمان اردو فورم سولاپور کے تعلق سے اظہار خیال پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ تنظیم صرف اردو زبان کی ترویج و تنقیح کے کام نہیں کر رہی ہے بلکہ اپنے تعمیری پروگراموں کے ذریعے قوم و ملت کو سنوارنے کا کام بھی کر رہی ہے جو قابل قدر اور قابل ستائش ہے۔ نظامت کے فرائض محترم عبدالمنان شیخ نے بخوبی انجام دیے۔ محترم محمد رفیق خان صاحب کے ہدیہ تشکر کے بعد یہ کامیاب پروگرام اختتام پذیر ہوا۔

پریس ریلیز: باغبان محمد اقبال، سولاپور، مہاراشٹر 7 مئی 2019

شعیب نوگانوی کو استقبالیہ

امروهه: ممتاز شاعر شعیب نوگانوی سعودی عرب کے ایک ماہ کے دورے کے بعد گذشتہ روز اپنے وطن نوگانواں سادات پہنچے، جہاں انھوں نے بتایا کہ ان کو اس دورے

ماہنامہ 'نیا دور' کے خصوصی شمارے کا اجرا

پر سعودی عرب کی مختلف ادبی سماجی تنظیموں کی جانب سے اعزاز سے سرفراز کیا گیا اور ان کے اعزاز میں کئی مقامات پر محفل کا انعقاد کیا گیا۔ اسی دورے پر ہی ان کو الخبر شہر کے ایک شاندار ہوٹل میں استقبالیہ نوگانواں سادات ایسوسی ایشن کی جانب سے دیا گیا۔ اس موقعے پر ایک اعزازی محفل کا انعقاد بھی کیا گیا جس میں بڑی تعداد میں ادبی سماجی شخصیات موجود تھیں۔ اس دوران ان کو شاعر بے بدل عنوان سے ایک ایوارڈ صابر امام، سید عبداللہ رضوی، شعیب قریشی کے دست مبارک سے سرفراز کیا گیا۔ اس سے قبل ان کو میکس انڈیا لمیٹڈ کی جانب سے بھی ایک اعزاز سے بھی سرفراز کیا گیا۔ شعیب نوگانوی نے بتایا کہ اس دورے پر انھوں نے کئی ادبی تقریبات میں حصہ لیا جہاں نعت منقبت کا کلام پیش کیا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 26 جون 2019

رسم اجرا:

'نیا دور' کے خصوصی شمارے کا اجرا

لکھنؤ: گورنر رام نائک نے، اپنی سرکاری رہائش گاہ گورنر ہاؤس پر، محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ سے شائع ہونے والے 'ماہنامہ 'نیا دور' کے خصوصی شمارے کا اجرا کیا۔ ماہ اپریل کا یہ خصوصی شمارہ قاضی عبدالستار، اقبال مجید، ارشاد امروہوی اور شمیم نکہت کی ادبی خدمات پر مشتمل ہے۔ گورنر رام نائک نے اس خصوصی شمارے کی تقریب رونمائی کے دوران اپنی کتاب 'چریوتی چریوتی' سے متعلق گذشتہ سال نیا دور میں شائع ہونے والے خصوصی مضامین کا بھی تذکرہ کیا، اور کہا کہ اردو زبان کے حوالے سے نیا دور کی خدمات قابل تعریف ہیں۔ انھوں نے کہا کہ پانچ سال کے اس عرصے میں گورنر ہاؤس میں تیس ہزار سے زائد افراد سے براہ راست ملاقات کر چکے ہیں۔ گورنر رام نائک نے اس خصوصی نمبر کی اشاعت کے لیے توصیفی کلمات کے ساتھ مبارکباد پیش کی اور اراکین نیا دور کو دعاؤں سے بھی نوازا، اس موقعے پر ماہنامہ 'نیا دور' کے

ایڈیٹر سید عاصم رضا، اسسٹنٹ ڈائرکٹر انجم نقوی، معاون ایڈیٹر شاہد کمال کے ساتھ سید وقار حسین رضوی، ڈاکٹر سلیم احمد، سید نازش احمد اور دیگر لوگ موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 1 جولائی 2019

میرابائی اردو شاعری میں

جلالپور / امبیڈکر نگر: انڈیا انٹرنیشنل سنٹر نئی دہلی میں 17 جون کو عزت مآب چناجیر سوامی جی (جیوا آشرم) اور اہم ترین شخصیات کے ہاتھوں نوجوان شاعر ہاشم رضا جلال پوری کی تخلیق 'میرابائی اردو شاعری میں' نغمۂ عشق و وفا' کا اجرا عمل میں آیا۔ میرابائی فاؤنڈیشن اور نور فاؤنڈیشن کے اشتراک سے منعقدہ اس تقریب میں مشہور فلم میکر پدم شری مظفر علی، شری وی جے پرکاش چیئرمین اڈوائزری بورڈ منسٹری آف لیبر، انڈین کاؤنسل آف کلچرل کے ڈائرکٹر جنرل شری اکھلیش مشرا، پروفیسر اختر الواسع، وی سی مولانا آزاد یونیورسٹی جودھپور، معروف گائیک شری نیواس، نیورسرجن ڈاکٹر عباس مہدی، ڈاکٹر گورودھیا اور دیگر شخصیات نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ہاشم رضا جلالپوری کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ اس موقعے پر عزت مآب چناجیر سوامی نے کہا کہ ہندوستان شروع سے ہی گنگا جمنی تہذیب کا مرکز رہا ہے۔ ہمارے مذہب بھلے ہی الگ ہوں لیکن ہم سب ایک ہیں۔ معروف اسکالر پروفیسر اختر الواسع نے ہاشم رضا جلالپوری کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اس سے پہلے کبھی کسی نے بھی اردو زبان میں میرابائی پر ایسا کام نہیں کیا۔ مشہور فلم میکر پدم شری مظفر علی نے کہا کہ اتنی کم عمری میں ہاشم رضا جلالپوری نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے جو قابل تعریف ہے۔ شری اکھلیش مشرا نے کہا کہ ہاشم رضا جلالپوری نے 2 سماجوں کو قریب لانے کی کوشش کی ہے جس کے لیے انھوں نے ہاشم رضا کے والد ذوالفقار جلالپوری اور اہل جلالپور کو مبارکباد بھی پیش کی۔ ڈاکٹر عباس مہدی نے کہا کہ ہاشم رضا جلالپوری اردو ادب کے لیے کام کر رہے ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 20 جون 2019

سہ شب کا قصہ

جمشید پور: ادبی تنظیم (دنیائے ادب) کے زیر اہتمام شہر آہن کے افسانہ نگار ناصر راہی کا پہلا افسانوی مجموعہ 'سہ شب کا قصہ' کی بسٹو پور کے ہوٹل بلورڈ ہال میں منعقد ایک تقریب میں رسم رونمائی ادا کی گئی۔ اس تقریب کی صدارت جناب سید رضا عباس رضوی چھبن نے فرمائی۔ جبکہ مہمان خصوصی جناب انیس رفیع (کولکاتا) تقریب میں موجود تھے۔ انھوں نے مجموعہ ہذا کے بابت اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ صاحب کتاب ناصر راہی نے جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اس کے ساتھ پورا انصاف کیا۔ جناب انیس نے کئی افسانوں کے حوالے سے کہا کہ تمام افسانوں میں کردار جاندار ہیں۔ انھوں نے موضوع کے انتخاب کی داد دی۔ اس سے قبل ڈاکٹر اختر آزاد نے اپنے مقالے میں کہا کہ ناصر راہی نے افسانوں کے تقاضوں کو پورا کیا ہے جو ان کی کامیابی کا ضامن ہے۔ محمود یٰسین (کولکاتا) نے اپنے تاثرات میں کہا کہ ناصر راہی اپنے افسانوں کے ساتھ ہنستے روتے اور مسکراتے دکھائی دیتے ہیں۔ آج بھی ہندوستان کو مکمل آزادی نہیں ملی۔ یہیں انسانیت پامال ہو رہی ہے۔ ہمیں اپنے ملک کو سچی آزادی دلانے کی ضرورت ہے۔ اس سے قبل سبھی مہمانوں کا استقبال شال اوڑھا کر اور گلاب کا گلدستہ سونپ کر کیا گیا۔ تقریب کی نظامت پروفیسر احمد بدر اور اشرف احمد جعفری (کولکاتا) نے مشترکہ طور پر کی ہے۔ پروفیسر سید محفوظ عالم نے بھی ایک جامع مقالہ پیش کیا۔ اخیر میں اظہار تشکر ادارے کے سکریٹری انور ادیب نے پیش کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' کلکتہ، 16 جون 2019

شوکت پردیسی فکر و فن کے آئینے میں

نئی دہلی: تعمیر ملت فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام تسمیہ آڈیٹوریم جامعہ نگر نئی دہلی میں حبیب سیفی کی کتاب 'شوکت پردیسی

فکر و فن کے آئینے میں' کی رسم اجرا و مشاعرہ منعقد ہوا۔ چیئرمین تسمیہ ایجوکیشنل اینڈ سول ویلفیئر سوسائٹی ڈاکٹر سید فاروق کی صدارت اور حامد علی اختر کی نظامت میں دو حصوں پر مبنی یہ تقریب کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچی۔ کتاب پر

گفتگو اور تاثرات کا سلسلہ اختصار پر ملحوظ رکھا گیا۔ اس کے باوجود صدر ڈاکٹر سید فاروق نے کہا کہ اپنے مرحومین ادیبوں و شعرا کو گمنامی سے نکال کر سامنے لانے کی کوششیں قابل ستائش ہیں۔ مجھے خوشی اس بات کی بھی ہے کہ تنقید و تجزیہ کی یہ کتاب وکی پیڈیا پر موجود ہے۔ مہمان تقریب ڈاکٹر تابش مہدی نے کہا کہ شوکت پردیسی شیراز ہند جونپور کے گل سرسبد تھے۔ انھوں نے اپنی عسرت اور گوشہ نشینی کے باوجود شعر و ادب پر اپنا اثر چھوڑا۔ جس بھی صنف میں قلم اٹھایا اس میں ایک کامیاب فنکار کی حیثیت سے سامنے آئے۔ مہمان خصوصی صدر شعبۂ عربی و اردو و اسلامک اسٹڈیز بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری جموں و کشمیر ڈاکٹر شمس کمل انجم نے کتاب کے مؤلف کو مبارکباد پیش کی اور شوکت پردیسی کی حیات اور ان کے فکر و فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا شوکت پردیسی حقیقی معنوں میں ایک سچے اور معتبر فن کار تھے۔ گوتم بدھ یونیورسٹی گریٹر نوئیڈا یوپی سے تشریف لائے شعبۂ اردو کو آرڈینیٹر ڈاکٹر عبدالغفار نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے، اور ہمیں شوکت پردیسی کی شاعری میں وہ سماج بڑی خوبصورتی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ حامد علی اختر نے کہا کہ اتر پردیش اردو اکادمی نے اس کتاب کو انعام سے نوازا، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی حکومت ہند نے بلک پرچیز کا حصہ بنایا۔ یہ بڑی بات ہے، اس سے لکھنے والوں کو جلا ملتی ہے۔ اس موقعے پر مہمانوں اور صدر و کتاب کے مصنف کا پھولوں سے استقبال کیا گیا۔ ابتدا میں کنوینر مرزا ذکی احمد بیگ تقریب کا مجموعی خاکہ پیش کرتے ہوئے حبیب سیفی کو کتاب کی مقبولیت کے لیے اور رسم اجرا کے لیے مبارکباد دی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 26 جون 2019

افسانوی ادب اور حیات اللہ انصاری

لکھنؤ: اردو فکشن میں حیات اللہ انصاری کی خدمات کو تادیر فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ افسانوی ادب اور حیات اللہ انصاری نامی کتاب میں حیات اللہ انصاری کے فکشن کا نہایت عمدگی سے احاطہ کیا گیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار مشہور تنقید نگار اور شاعر پروفیسر سراج اجملی نے آج یہاں نعمانی پریس کے سعادت علی صدیقی ہال میں اویس سنبھلی کی مرتبہ کتاب 'افسانوی ادب اور حیات اللہ انصاری' کی تقریب رسم اجرا کے موقعے پر صدارتی خطاب کے دوران کیا۔ پروگرام کا انعقاد نجب النسا میموریل ٹرسٹ کے تحت ہوا۔ حکیم وسیم احمد اعظمی بطور مہمان خصوصی اور طارق صدیقی بطور مہمان ذی وقار شریک ہوئے۔ پرویز ملک زادہ نے نظامت کی جبکہ ڈاکٹر عمیر منظر نے خیر مقدمی کلمات پیش کیے۔ سعید اختر نے کلام پاک کی تلاوت کی۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر سراج اجملی نے کہا کہ حیات اللہ انصاری متنوع جہات شخصیت کے مالک تھے اور ہر جگہ ان کی انفرادیت نمایاں رہی۔ اویس سنبھلی کی کتاب سے ان کی انفرادیت کی ایک جہت کو دیکھا جاسکتا ہے۔ یوپی اردو اکادمی کے سکریٹری ایس رضوان کے بدست کتاب کا اجرا کیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ حیات اللہ انصاری اپنے معاصرین سے کئی اعتبار سے بڑے افسانہ نگار ہیں۔ کتاب کے توسط سے ان کو دیر تک یاد کیا جائے گا۔ طارق صدیقی نے کہا کہ یہ کتاب ایک سمینار میں پیش کیے گئے مقالات کا مجموعہ ہے، سمینار کی روداد عام طور پر شائع نہیں ہو پاتی مگر یہاں اس مشکل کو آسان کیا گیا ہے جو خوش آئند ہے۔ مہمان خصوصی حکیم وسیم اعظمی نے کہا کہ حیات اللہ انصاری کے یہاں تازگی اور توانائی ہے۔ ان کی فنی بصیرت اور تنوع پریم چند سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ غفران نسیم نے کہا کہ یہ کتاب فکشن مطالعات میں اہم کتاب ثابت ہوگی۔ رضوان فاروقی نے مرتب کتاب کو مبارک باد پیش کی اور کہا کہ اس سے لکھنؤ کے ایک سنہرے دور کی یاد تازہ ہوگئی ہے۔

ابتدا میں مہمانوں اور حاضرین کا خیر مقدم کرتے ہوئے ڈاکٹر عمیر منظر نے کہا کہ اس کتاب میں بیس مقالے شامل ہیں، جن میں لکھنے والے معتبر قلم کاروں

کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والے بھی ہیں۔ پرویز ملک زادہ نے کہا کہ حیات اللہ انصاری کے افسانوں میں فکر وفن کی جو دنیا آباد ہے وہ ہمیں اپنے سماج اور معاشرے کو دیکھنے اور سمجھنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اویس سنبھلی نے آخر میں تمام مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 30 جون 2019

وفیات:

حمایت علی شاعر

نئی دہلی: مشہور شاعر اور نغمہ نگار حمایت علی شاعر کنیڈا کے شہر ٹورنٹو میں 16 جولائی کو انتقال کر گئے۔ وہ 93 سال کے تھے۔

حمایت علی شاعر کی پیدائش 14 جولائی 1926 کو ہندوستان کے شہر اورنگ آباد میں ہوئی تھی۔ تقسیم کے

بعد وہ کراچی ہجرت کر گئے۔ انھوں نے سندھ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا اور اسی ادارے میں درس و تدریس کے فرائض بھی انجام دیے۔ حمایت علی شاعر کے کئی شعری مجموعے ہیں جن میں مٹی کا قرض، آگ میں پھول، تشنگی کا سفر، حرف حرف روشنی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کی خودنوشت 'آئینہ در آئینہ' کے نام سے شائع ہو چکی ہے جو مثنوی کی ہیئت میں ہے۔ شیخ ایاز اور شخص و عکس ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ وہ تین مصرعوں پر مشتمل صنف ثلاثی کے موجد بھی ہیں۔ حمایت علی شاعر نے فلموں کے لیے بھی بہت سے نغمے لکھے ہیں۔ انھیں نغمہ نگاری کے لیے ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

حمایت علی شاعر نے افسانہ نگاری بھی کی ہے اور ریڈیو پاکستان کا حصہ بھی رہے ہیں۔ انھوں نے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ان کے پی ایچ ڈی کا مقالہ 'پاکستان میں اردو ڈرامہ' تھا۔ ان کے ڈراموں کا ایک مجموعہ 'فاصلے' کے عنوان سے شائع ہوا۔ سندھ یونیورسٹی میں درس و تدریس سے بھی ان کی وابستگی رہی ہے۔ بعد میں وہ امریکہ چلے گئے اور وہیں مقیم رہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کی آخری سانس بھی وہیں لی۔ ٹیلی ویژن کے لیے انھوں نے کئی تحقیقی پروگرام بھی پیش کیے جن میں خوشبو کا سفر، عقیدت کا سفر، محبتوں کے سفیر اور نشید آزادی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

فاخر جلال پوری

عصر حاضر کے معروف ادیب اور منفرد لب و لہجے کے استاد شاعر حضرت فاخر جلال پوری کا اچانک 14 جون 2019 کو شب میں دو بجے انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 86

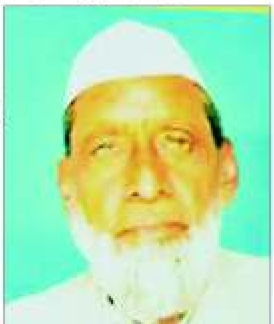

برس تھی۔ مرحوم و مغفور فاخر جلال پوری کے پسماندگان میں 3 بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ ان کے بڑے صاحب زادے ڈاکٹر آفاق فاخری عصر حاضر کے ادبی منظر نامے میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ایک اور بیٹے توفیق احمد فاخری ممبئی میں درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔

فاخر جلال پوری ایک عرصے سے اردو زبان و ادب کے میدان میں خواہ نثر ہو یا نظم دونوں میں اپنی تخلیقات اور تصنیفات سے گیسوئے اردو کو سنوارنے میں مصروف رہے۔ امبیڈکر نگر ضلع کے قصبہ جلال پور کی ادبی، سماجی، سیاسی اور مذہبی سرگرمیوں میں وہ ہمیشہ متحرک اور فعال رہے۔ فاخر جلال پوری کی اب تک 12 تصانیف زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔ 'فاخر جلال پوری حیات اور کارنامے' اس عنوان پر بنارس ہندو یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری ابھی جلد ہی تفویض کی ہے۔ ان کی چند تصانیف مثلاً رگ و ساز، حرف زار، آسماں ایسے ایسے، اور زیتون کے سائے پر اتر پردیش اردو اکادمی نے انعام سے بھی نوازا تھا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر افکار فاخری، جلال پور، امبیڈکر، 8 جولائی 2019

وسیم بیگم

حیدر آباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، شعبۂ اردو کی پروفیسر وسیم بیگم کا (2 جولائی) بہ عمر 58 سال سٹیزن ہاسپٹل، لنگم پلی، حیدرآباد میں انتقال ہوگیا۔ وہ ایک سال سے کینسر کے عارضہ میں مبتلا تھیں۔ پسماندگان میں شوہر اور ایک فرزند شامل ہیں۔ چانسلر ڈاکٹر فیروز بخت احمد اور وائس چانسلر ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے پروفیسر وسیم بیگم کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے اسے یونیورسٹی کے لیے خسارہ قرار دیا۔ دونوں نے اپنے علیحدہ پیامات تعزیت میں مرحوم کے لیے مغفرت کی دعا کرتے ہوئے

پسماندگان سے اظہار تعزیت کیا۔ اسی دوران آج یونیورسٹی کے کانفرنس ہال میں مرحومہ کا تعزیتی اجلاس منعقد ہوا۔ پروفیسر ایوب خان، پرو وائس چانسلر نے تعزیتی پیام میں کہا کہ مرحومہ یقیناً کئی خوبیوں کی حامل خاتون تھیں۔ لوگ ہمیشہ انتقال کے بعد دوسروں کی خوبیاں بیان کرتے ہیں لیکن زندگی میں خوبیوں کا اعتراف اچھی بات ہے۔ ڈاکٹر ایم اے سکندر، رجسٹرار نے بتایا کہ وہ پروفیسر وسیم بیگم کو دہلی یونیورسٹی سے جانتے ہیں۔ وہ ایک باہمت خاتون تھیں۔ ان کا بحیثیت اسسٹنٹ ریجنل ڈائرکٹر جولائی 2005 میں تقرر ہوا تھا۔ ایسوی ایٹ پروفیسر بننے کے بعد انھوں نے 17 جولائی 2013 کو بحیثیت انچارج لکھنؤ کیمپس ذمے داری سنبھالی۔ بعد میں ان کی پروفیسر کے عہدہ پر ترقی ہوئی۔ انھوں نے 5 کتابیں لکھیں اور 25 تحقیقی اور دیگر 10 مضامین شائع کیے۔ مرحومہ کا ساہتیہ اکادمی، دہلی سے بھی تعلق تھا۔ پروفیسر علیم اشرف جائسی، صدر شعبۂ عربی کی قرأت کلام پاک سے جلسے کا آغاز ہوا۔ جبکہ پروفیسر فہیم اختر ندوی، صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز نے دعائے مغفرت کی۔ آخر میں دو منٹ خاموشی اختیار کی گئی۔ تعزیتی نشست میں بڑی تعداد میں اساتذہ اور غیر تدریسی اراکین اسٹاف کے علاوہ ٹیچرس ایسوسی ایشن (مانوتا)، آفیسر ایسوسی ایشن (موا) اور غیر تدریسی عملہ کی ایسوسی ایشوا (میوا) کے عہدیداروں اور اراکین نے بھی شرکت کی۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 4 جولائی 2019

ڈاکٹر ارشاد ساگر

سہارنپور: سہارنپور کے جدید لب و لہجہ کے معروف شاعر ڈاکٹر ارشاد ساگر کا انتقال ہوگیا ہے۔ وہ کچھ ماہ پہلے سے آنتوں کے کینسر میں مبتلا تھے۔ مرحوم انتہائی سنجیدہ شخص تھے۔ انھوں نے ایم اے انگریزی سے کیا تھا لیکن شاعری اردو میں کرتے تھے۔ انھوں نے میڈیکل میں بھی ڈپلومہ کیا تھا اور میڈیکل پریکٹس کرتے تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ تدفین کا عمل نرگن شاہ نمائش کیمپ کے قبرستان میں ہوئی، جنازہ اور تدفین میں ادبی، سیاسی اور سماجی شخصیات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 13 جولائی 2019

خراج عقیدت:

بی ایس جین جوہر

میرٹھ: شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ کے منشی پریم چند سیمنار ہال میں میرٹھ کے معروف شاعر مرحوم بی ایس جین جوہر کی یاد میں ایک تعزیتی جلسے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر سید احمد شمیم نے کی اور مہمانان میں پروفیسر خالد حسین خاں، محترم نپن جین شریک ہوئے۔ مہمانان کے لیے استقبالیہ کلمات ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے ادا کیے اور تعارف ڈاکٹر شاداب علیم، نظامت کے فرائض ڈاکٹر آصف علی نے بحسن و خوبی ادا کیے۔ تعزیتی جلسے کا آغاز شعبے کے طالب علم اسرار احمد نے مرحوم بی ایس جین جوہر کی خوبصورت غزل سے کیا۔ بعدازاں ڈاکٹر شاداب علیم نے معروف شاعر محترم بی ایس جین جوہر کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ محترم جوہر جیسے شاعر، ملنسار اور باکردار انسان کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔ اس موقعے پر پروفیسر خالد حسین نے کہا کہ مرحوم بی ایس جین جوہر ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے تاجر بھی تھے۔ ان کے ساتوں شعری مجموعوں سے ہندو مسلم یکجہتی کی نمائندگی ہوتی ہے۔ مرحوم کے بیٹے محترم نپن جین نے اپنے والد کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ میرے والد ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین تاجر اور خوش اخلاق تاجر بھی تھے۔ ان کی شاعری سے محبت کا پیغام جاتا ہے۔ انھوں نے کبھی ہندو، مسلمان میں فرق نہیں کیا۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ ان کا چلے جانا ادب کا بہت بڑا نقصان ہے۔ محترم بی ایس جین جوہر اردو کے بڑے ادیب اور بہترین شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ملنسار، دیش بھگت اور سچے انسان تھے۔ ان کے کلام پر جب ریسرچ ہوگی تو ادب کے نئے نئے گوشے سامنے آئیں گے۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر سید احمد شمیم نے کہا کہ اردو زبان پورے ملک کی تہذیبی زبان ہے۔ اسے سیکھنے کی ضرورت ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر فرحت حسین خوشدل (ہزاری باغ) کی مرتب کردہ کتاب 'انتخاب کلام جوہر' اور فرحت حسین خوشدل کی ہندی نظموں کا مجموعہ پشپانجلی (جسے انھوں نے بی ایس جین جوہر کے نام کیا ہے) کا اجرا بھی مہمانوں کے ہاتھوں عمل میں آیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 30 جون 2019

قیوم میو

نئی دهلی: اردو کے معروف ادیب اور افسانہ نگار قیوم میو 18 جولائی 2019 کو دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کرگئے۔

وہ 53 سال کے تھے۔ قیوم میو کی پیدائش ناگپاڑہ ممبئی میں ہوئی تھی۔ وہ برسوں ممبئی میں مقیم رہے۔ اس کے بعد دہلی آگئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ قیوم میو بہت ہی متحرک اور فعال شخص تھے۔ دہلی کی بیشتر ادبی تقریبات میں وہ شریک رہتے تھے۔ 1980 سے ان کے تخلیقی سفر کا آغاز ہوا۔ اردو کے بیشتر رسائل وجرائد میں ان کے افسانے شائع ہوتے تھے۔ 'پتھر جیسے لوگ'، 'بہار وخزاں'، 'رشتوں کا کرب'، 'ماڈرن اولادیں'، 'ننھی گڑیا' اور 'بازی گر' ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ انھیں مختلف اعزازات بھی مل چکے ہیں۔ ہندی اردو دونوں زبانوں میں وہ افسانے اور بچوں کا ادب بھی تخلیق کرتے تھے۔ وہ اردو کے سچے عاشق تھے۔ بیشتر اردو اخبارات خریدتے تھے۔ انتقال سے چند گھنٹے قبل وہ فاروق سید کے ماہنامہ 'گل بوٹے' ممبئی کے زیراہتمام غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کی ایک تقریب بعنوان 'بچوں کا ادب: سمت و رفتار' میں شریک ہوئے تھے۔ وہاں سے واپسی کے کچھ گھنٹوں بعد وہ کسی دوست سے ٹیلی فون پر بات کررہے تھے کہ اسی دوران ان کو دل کا دورہ پڑا اور وہ جانبر نہ ہوسکے۔ پسماندگان میں تین بیٹے، ایک بیٹی اور اہلیہ ہیں۔

بشیر فاروقی

لکھنؤ: بشیر فاروقی نہایت اچھے سخن ور شاعر اور ادیب تھے اور نہایت شریف انسان تھے۔ نہایت ہمدرد اور منکسر المزاج بھی تھے۔ بشیر فاروقی سے ہر ملاقات یادگار ہوتی تھی کیونکہ اس میں ان کا کوئی نہ کوئی ایسا شعر سننے کو ملتا جو زندگی سے قریب ہوتا تھا اور جو دماغ کو سوچنے پر مجبور کرتا اور دل کے جذبوں سے لہو کی گردش لبریز ہوکر کیفیت پیدا کرتی تھی۔ ان خیالات کا اظہار پدم شری پروفیسر آصفہ زمانی نے بشیر فاروقی کی یاد میں منعقد تعزیتی جلسے کی صدارت کرتے ہوئے کیا۔

ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی اور ادبی سنستھان کے اشتراک سے امیرالدولہ اسلامیہ ڈگری کالج لکھنؤ میں عالمی شہرت یافتہ شاعر بشیر فاروقی مرحوم کو پرسہ دینے کے لیے محبان اردو کا ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جلسے کا آغاز قمر سیتاپوری کی تلاوت کلام پاک سے ہوا اور نعت پاک کا نذرانہ فاروق عادل اور عرفان لکھنوی نے پیش کیا۔ ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی کے جنرل سکریٹری اطہر نبی اور معروف ادیب وشاعر سہیل کاکوروی نے کہا کہ شوخی اور شرارت ان کی فطرت کا حصہ تھی۔ مہمان خصوصی سینئر صحافی اور مایہ ناز ادیب ابراہیم احمد علوی نے کہا کہ فکری سطح پر بشیر فاروقی کی شاعری منفرد تھی اور نجی زندگی میں ان کے قول وعمل میں دلکشی تھی جو ان سے رابطہ کو مضبوط رکھتی تھی، احمد ابراہیم علوی نے کہا ہم عصر شاعروں پر صحافت بشیر فاروقی کی شاعری کی پذیرائی کرتی تھی۔ اپنے صحافتی دور کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ انھیں اگر بشیر فاروقی پر کسی کا مضمون مل جاتا تھا تو وہ اسے ضرور شائع کرتے تھے۔ مہمان ذی وقار سابق دور درشن ڈائرکٹر ولایت جعفری نے جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ایمان دار انسان اور سچا شاعر کبھی نہیں مرتا، وہ صرف پیدا ہوتا ہے اور انھیں میں سے ایک نام بشیر فاروقی کا ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 25 جون 2019

فیروز اشرف

ممبئی: حال ہی میں ایک حادثہ میں انتقال کرگئے معروف صحافی وسماجی اور تعلیمی میدانوں میں سرگرم رہے۔ فیروز اشرف کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا گیا کہ مرحوم اشرف نے صحافت ہی نہیں بلکہ مسلم نوجوانوں کی تعلیم اور خصوصی طور پر مسلم لڑکیوں کی تعلیمی بہتری کے لیے بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور یہ ثابت کردیا ہے

کہ اگر ایک انسان میں کچھ کرگزرنے کا جذبہ ہو تو وہ اسے انجام تک ہی پہنچا کر دم لیتا ہے۔ ماہنامہ گل بوٹے اور چینل کے دفتر میں اردو جرنلسٹ ایسوسی ایشن (یوجے اے) کے زیراہتمام ایک تعزیتی جلسے کا انعقاد کیا گیا، اور یہ تجویز بھی پیش کی گئی کہ صحافت کے ساتھ ساتھ قوم وملت کی فلاح و بہبود کے لیے سرگرم افراد کی ان کی حیات میں بھی ستائش کی جائے۔ یوجے اے کے زیراہتمام مذکورہ تعزیتی نشست سے تنظیم کے صدر اور سینئر صحافی خلیل زاہد، سکریٹری اور روزنامہ ہندوستان کے مدیر سرفراز آرزو، نائب صدر جاوید جمال الدین، خازن اور گل بوٹے کے ایڈیٹر فاروق سید، مجلس عاملہ کے رکن اور تحریر نو کے مدیر ظہیر انصاری، صحافی اور کالم نویس ڈاکٹر سلیم خان، یونس صدیقی اور دیگر نے خطاب کیا۔ اس موقعے پر نائب صدر جاوید جمال الدین نے کہا کہ صحافت میں انھوں نے پاکستان نامہ لکھ کر شہرت حاصل کی۔ ان کے تعلیمی میدان کے عوض وزڈم فاؤنڈیشن اور اٹل بہاری واجپئی کے سابق سیاسی مشیر سدھیندر کلکرنی نے ان پر ایک ڈاکومنٹری تیار کی اور ان کی کتاب بھی منظر عام پر آئی۔ ان کی اہلیہ میونسپل کارپوریشن میں اعلی عہدے پر فائز رہیں اور بیٹا ایک مشہور میڈیا ہاؤس میں سینئر ایڈیٹر ہے۔ یوجے پی کے ایک اور سینئر رکن ظہیر انصاری نے کہا کہ وہ سب کو ساتھ لے کر چلتے رہے اور اس بات کے حق میں تھے کہ ہم وطنوں کے درمیان جاکر اپنی بات رکھی جائے اور غلط فہمیوں کو دور کیا جائے، یہی وجہ تھی کہ وہ شیرڈی کے آیورویدک اسپتال کے چیئرمین بھی تھے، اس نشست سے یونس صدیقی، فرحان حنیف، ہندی کے صحافی بی راہی اور ہاشم چوگلے نے بھی خطاب کیا جبکہ مولانا مستقیم مکی کے دعائیہ کلمات پر نشست کا اختتام ہوا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 3 جولائی 2019

لیاقت علی عاصم

امروہہ: بزم زندہ دلان امروہہ کی جانب سے عالمی شہرت یافتہ شاعر لیاقت علی عاصم کے انتقال پر ایک تعزیتی میٹنگ ہاشمی کالج میں منعقد ہوئی جس کی صدارت تنظیم کے سرپرست ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے کی اور نظامت کے فرائض سید شیبان قادری نے انجام دیے۔ میٹنگ میں عالمی شہرت یافتہ شاعر لیاقت علی عاصم کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا گیا اور ان کے انتقال کو ادب کا ایک نہ پورا ہونے والا نقصان بتایا۔ اس موقعے پر بولتے ہوئے ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے کہا کہ لیاقت علی عاصم ایک پاکستانی ممتاز شاعر اور ماہر لسانیات تھے۔ لیاقت علی عاصم 14 اگست 1951 کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد کا تعلق ہندوستان کے ساحلی علاقے، کوکن سے ہے۔ لیاقت علی عاصم کے کل آٹھ شعری مجموعے اردو دنیا میں مقبول ہوئے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 1977 میں سبد گل کے نام سے شائع ہوا اور آخری انتقال سے ایک ہفتے قبل شائع ہونے والا شعری مجموعہ 'میرے کتبے پہ اس کا نام لکھو' تھا۔ سید مسرور جوہر نے کہا کہ لیاقت علی عاصم نے غزل کی تخلیق میں اس امر کو اہمیت دی ہے کہ تازہ کاری کے ساتھ ساتھ شعریت اور تخلیقی جمالیات کے عناصر بھی موجود رہیں۔ ڈاکٹر ناصر امروہوی نے کہا کہ فن کسی نوعیت کا بھی ہو اس میں کشش اور تازہ کاری فن کار ہی پیدا کرتا

ہے اور یہ فن لیاقت علی بخوبی جانتے تھے۔ سید شیبان قادری نے کہا کہ لیاقت علی عاصم کے یہاں وہ تمام موضوعات بھی اشعار میں بڑی خوبی سے ڈھلے ہیں جن سے ہمارے عہد اور ہمارے عوام کو شب و روز گزرنا اور سہنا ہوتا ہے۔ اس موقعے پر احمد رضا فراز، اسلم بقائی، شہاب انور، نازش مصطفیٰ، انیس احمد، اذعان حسن، سلیمان فراز، سلمان عباسی وغیرہ کے علاوہ بڑی تعداد میں لوگ موجود رہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 30 جون 2019

مشتاق احمد یوسفی

امروهه: بزم زندہ دلانِ امروہہ کی جانب سے ایک تعزیتی میٹنگ تنظیم کے دفتر محلّہ ترپولیہ میں منعقد ہوئی جس میں مشہور و معروف مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کے یومِ وفات پر انھیں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر بولتے ہوئے تنظیم کے سرپرست ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے کہا کہ موجودہ دور میں اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں جو مقبول نام گردش کر رہے ہیں ان میں ایک نام مشتاق احمد یوسفی کا بھی ہے۔ ان کی مشہور کتابوں میں چراغ تلے، خاکم بدہن، زرگزشت، آبِ گم، شامِ شعرِ یاراں شامل ہیں۔ سینئر شاعر سید مسرور جوہر نے کہا کہ مشتاق احمد یوسفی کا نام اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ انھوں نے بھی ہجرت کی کربناکیوں کو اپنے تخلیقی شعور کے ذریعے طنزیہ و مزاحیہ ادب کا حصہ بنا دیا۔ سید شیبان قادری نے کہا کہ ان کی مزاح نگاری کی یہ سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ وہ اپنی ظریفانہ تحریروں میں بڑی معصومیت اور سنجیدگی کے ساتھ اپنی بات کہہ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر ناصر امروہوی نے کہا کہ مشتاق احمد یوسفی کی تخلیقات میں سماج کی بدلتی قدروں اور ماضی کی یادوں کا ایسا منظر نامہ موجود ہے جس کی روشنی میں ہم ایک مہاجر کی زندگی اور اس کے ذہنی و فکری شعور کو بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ ان کی طنز نگاری میں ہمدردی کا جذبہ بھی شامل ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 22 جون 2019

انور جلال پوری کی یاد میں

جلال پور، امبیڈکر نگر: عالمی شہرت یافتہ ناظم مشاعرہ، ملک کی شان مشاعروں کی جان، قومی یکجہتی و گنگا جمنی تہذیب کی پہچان، پدم شری انور جلال پوری مرحوم کی یاد میں ایک کل ہند مشاعرے کوی سمیلن زیر اہتمام ادب شالہ انور جلالپوری اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن مرزا غالب انٹر کالج گراؤنڈ جلال پور میں 15 جون کی شب منعقد کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت زاہد جلالپوری و نظامت کے فرائض واصف فاروقی نے انجام دیے۔ مشاعرے کے مہمان خصوصی ڈاکٹر اکھلیش کمار مشرا آئی اے ایس اسپیشل سکریٹری ٹرانسپورٹ اترپردیش و سنتوش کمار سنگھ پی سی ایس سٹی مجسٹریٹ اجودھیا رہے۔ کل ہند مشاعرے کو جوہر کانپوری، محترمہ شبینہ ادیب، ڈاکٹر کلیم قیصر، ماجد دیوبندی، رام پرساد بیچو لکھنو، ڈاکٹر آنند اوجھا، ڈاکٹر عرفی فیض آبادی، وکاس بوکھل، شاہد جمال فیض آبادی، سلونی رانا آگرہ، شعلہ ٹانڈوی، نعیمی جونپوری، چارو شلا سنگھ گورکھپوری، امیر فیصل فتح پوری، جمشید فیض آبادی، شہریار جلال پوری، ڈاکٹر ذیشان حیدر جلال پوری، اثر ٹانڈوی، ڈاکٹر حسن سعید جلال پوری، قمر جلال پوری، مظہر جلال پوری، دانش اکبر پوری، تاکر کیشور مشرا اجگیاسو، شیوم، سنیل کمار گلزار وغیرہ شعرائے کرام نے زینت بخشی۔ قبل مشاعرہ ڈاکٹر ذیشان حیدر نے ایک بہت ہی خوب صورت انداز میں ایک مقالہ انور جلال پوری اور ان کی ادبی خدمات پر پیش کر کے خوب داد و تحسین حاصل کی۔ وہیں انھوں نے پدم شری انور جلال پوری کے شعر سنائے جس میں انور جلال پوری کی قومی یکجہتی و گنگا جمنی تہذیب کی بھرپور جھلک نظر آتی ہے۔ وہ شعر ہے، تم پیار کی سوغات لیے گھر سے تو نکلو، رستے میں کوئی بھی دشمن نہ ملے گا۔ دوران مشاعرہ مہمان خصوصی و مہمان اعزازی کی گلپوشی کر کے انھیں پدم شری انور جلال پوری کی تصنیفی کتابیں و شال پیش کی گئیں۔ قبل مشاعرہ دو بجے دن میں ایک ادبی علمی سمینار بعنوان قومی یکجہتی اور امن و شانتی کے علمبردار انور جلال پوری اسی گراؤنڈ پر منعقد کیا گیا جس میں درجن بھر دانشوروں نے سمینار کو خطاب کیا۔ پروگرام کے آخر میں پدم شری انور جلال پوری کے صاحبزادے ڈاکٹر شہریار جلال پوری نے مہمان خصوصی و اعزازی مہمانوں، شعرا و سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 جون 2019

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا / چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر........................ بتاریخ .... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

کشمیر میں منعقدہ کل ہند اردو کتاب میلے کی تصویری جھلکیاں

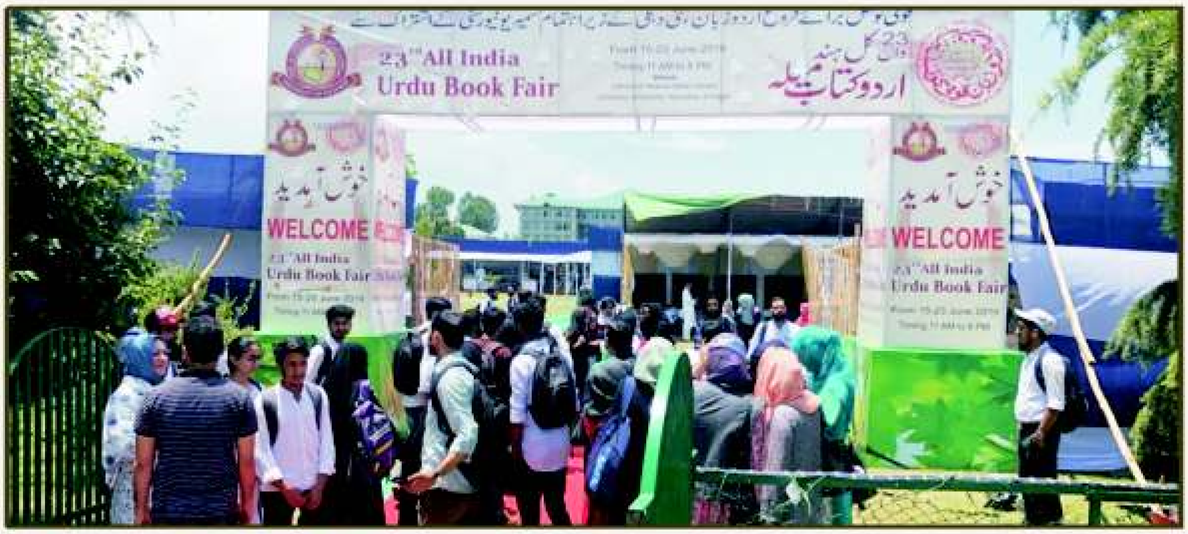

URDU DUNIYA Monthly, August-2019, Vol.21, Issue:08
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/07/2019**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں عالمی یوم یوگا کے موقع پر لی گئی کچھ تصاویر

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025